

انسپکٹر نواز خان کی جرم و سزا پر مبنی تفتیشی کہانیاں

جسٹس

لڑکی، چور اور سپاہی



طاہر جاوید مغل

پیش لفظ

انسپکٹر نواز خان کی کہانیاں جرم اور جرم کے ”نتیجے“ کی کہانیاں ہیں۔ ان میں سے اکثر کہانیاں دیہاتی ماحول کی ہیں۔ ہمارے پنجاب کا دیہاتی ماحول ہمیشہ سے ”داستان گو“ کے لئے بہت دل پسند رہا ہے۔ یہ کہانی کے لئے بڑا زرخیز ماحول ہے۔ یہاں کہانی دریاؤں اور نہروں کے مٹیا لے پانیوں کے ساتھ بہتی ہے..... کھیتوں کھلیانوں میں اُگتی ہے، رہٹوں اور بیٹھکوں میں کروٹیں لیتی ہے۔ سردیوں کی طویل شبنم آلود راتیں، گرمیوں کی سنسان دوپہریں، ساون کی لمبی جھڑیاں، سنہری کھیتوں پر پھیلی ہوئی بیکراں چاندنی..... یہ سب پنجاب کی کہانی کے سرچشمے ہیں۔ نواز خان کی زیر نظر کہانیاں ہمارے ارد گرد کی روداد ہیں۔ زر، زن اور زمین ہمیشہ سے فساد کی جڑ رہے ہیں۔ ان تینوں میں سے ”زن“ کا عنصر سب سے اہم ہے کیونکہ یہ باقی دونوں چیزوں کی خواہش بھی انسان کے اندر بھڑکا دیتا ہے۔ عورت فساد کی وجہ بنتی ہے یا نہیں، یہ ایک علیحدہ بحث ہے لیکن ”فساد“ کی سب سے زیادہ ”سزا“ عورت کو ہی بھگتنا پڑتی ہے۔ کبھی ماں کی حیثیت سے بیٹا کھو کر، کبھی بہن اور بیوی کی حیثیت سے بھائی اور شوہر کھو کر اور اکثر وہ براہ راست انتقام کا نشان بن جاتی ہے۔

مرد اپنی دشمنیاں چکانے کے لئے دشمن کی عورت کو بہترین ہدف سمجھتے ہیں۔ ان کہانیوں میں انسپکٹر نواز خان آپ کو ایسے ہی لوگوں کے خلاف برسرِ پیکار نظر آئے گا، جو عورت اور دولت کی خواہش میں اخلاقی قدروں کو پامال کرتے ہیں۔ عام طور پر پولیس کے محکمے کو سخت تنقید کا نشانہ بنایا جاتا ہے لیکن اچھے برے لوگ ہر جگہ موجود ہیں۔ آج بھی اس محکمے میں کئی انسپکٹر نواز خان ہوں گے۔ ایسے لوگ جو ظالم کے لئے کرخت اور مظلوم کے لئے نرم و مہربان ہیں۔ وہ ترقیوں، تمنگوں اور داد و تحسین کی پرواہ کئے بغیر اپنی جان خطرے میں ڈالتے ہیں اور اپنا فرض نبھانے کی کوشش کرتے ہیں۔

میں نے ان کہانیوں کو لکھا ہے اور علی میاں پبلیکیشنز کے عبدالغفار صاحب نے انہیں کتابی سلسلے کی شکل میں خوبصورتی سے شائع کیا ہے۔ ہم دونوں کی یہ کوشش پنجاب پولیس کے اُن فرض شناس افسروں اور اہلکاروں کے نام ہے جو انسپکٹر نواز خان کی طرح نمک کی کان میں رہ کر نمک نہیں بنے اور اپنی علیحدہ شناخت رکھتے ہیں۔

طاہر جاوید مغل

فہرست

6	لڑکی، چور سپاہی
35	اُس کی گلی میں
67	برقع اور جرم
95	دوستی، فرض اور لاش
131	اور وہ بدل گئی
167	صغراں
203	باپ، بیٹی اور وہ
233	عزت کی بھوک

لڑکی، چور اور سپاہی

دوار کا سنگھ بڑا شاطر اور خطرناک ڈاکو تھا۔ دو انیسٹر اور دو ڈی ایس پی اس کی گرفتاری میں ناکام ہو کر لائن حاضر ہو چکے تھے۔ دوار کا سنگھ ایک خانہ بدوش دوشیزہ موہنی کی آواز کا عاشق تھا۔ میں نے اسے پھانسنے کے لیے موہنی کا جال بچھایا اور پھر.....

وہ ایک سخت گرم اور جس زدہ رات تھی، چاندنی کی ٹھنڈک بھی اس گرمی پر کوئی خاص اثر نہیں کر رہی تھی۔ پسینہ دھاروں کی صورت بہہ رہا تھا۔ میں عام دیہاتی لباس یعنی دھوتی گرتے میں تھا۔ چہرے پر ”مڑاسا“ باندھ رکھا تھا کوئی مجھے اس حلیے میں دیکھتا تو یہی سمجھتا کہ کوئی رسد گیر یا نقب زن اپنے ”کام“ پر نکلا ہوا ہے۔ مٹی کی پانچ فٹ اونچی دیوار کے پاس پہنچ کر میں نے احتیاط سے ارد گرد دیکھا۔ کھیت سنسان پڑے تھے۔ فصلوں کے درمیان کہیں کہیں بیر، شیشم اور شرنبہ کے درخت سر جھکائے خاموش کھڑے تھے کوئی شاخ کوئی پتا حرکت میں نہیں تھا۔ رات دس بجے کا وقت تھا۔ کسی رہٹ کی آواز بھی نہیں آرہی تھی۔ صرف دور گاؤں کے نواح میں آوارہ کتے بھونک رہے تھے۔ میں نے اچک کر دونوں ہتھیلیاں مٹی کی دیوار پر جمائیں اور بے آواز اندر کود گیا۔

یہ ایک وسیع و عریض فارم تھا۔ ہر قسم کے پھلدار پودوں کی بہتات تھی۔ کوئی چار ایکڑ پر پھیلا ہوا یہ فارم گاؤں کے چوہدری شاہ مراد کی ملکیت تھا۔ وہ ایک زبردست، ٹھاٹ باٹ والا چوہدری تھا اور اس نے اس فارم کو علاقے کا بہترین فارم بنا دیا تھا۔ نایاب پھول، پودے، سبزیاں اور درخت اس فارم میں دیکھے جاسکتے تھے بہر حال میں اس وقت یہ چیزیں دیکھنے نہیں آیا تھا۔ میرا مقصد کچھ اور تھا، مجھے اس دیہی تھانے میں آئے ہوئے پانچ ماہ گزر چکے تھے اور اس وقت سے میری یہ خواہش تھی کہ کسی طرح چوہدری کے فارم کو اندر سے اچھی طرح دیکھ سکوں۔ مطلب یہ کہ فارم کی کوئی بات مجھ سے چھپی نہ رہے۔

بظاہر تو چوہدری شاہ مراد ایک شریف چوہدری تھا مگر پولیس کا کام شک کرنا ہوتا ہے اور شک کر کے ہی وہ اچھے بڑے کی تمیز کرتی ہے۔ چوہدری نے اس فارم کو ممنوعہ علاقہ بنا رکھا تھا۔ (حالانکہ اس میں کچھ بھی نہیں تھا) چاروں طرف مٹی کی دیوار تھی اور جہاں دیوار نہیں تھی

گزر گئی۔ میں قیص کے نیچے سے اپنا ریوا لور نکال چکا تھا۔ یہ ریوا لور میں نے پوری قوت سے مید مقابل کے منہ پر دے مارا۔ وہ بھی تالاب کے کنارے کچڑ میں جا گرا۔ میرے ہاتھ میں ریوا لور دیکھ کر اُن کے چہرے خوف سے پیلے ہو رہے تھے۔ دونوں بزدل سے شخص تھے۔ میں نے اُن کے پاؤں میں دو فائر کیے تو وہ پاگل گھوڑوں کی طرح اچھلے اور سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ نکلے۔

لڑکی ایک درخت سے لگی تھر تھر کانپ رہی تھی۔ چاندنی میں اُس کا پورا احلیہ نمایاں تھا۔ اس کی قیص، جسم پر برائے نام ہی رہ گئی تھی اور وہ اپنی عربیائی کو اپنے بازوؤں میں چھپانے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں نے غور سے دیکھا اور پہچان گیا۔ وہ چوہدری شاہ مراد کی ایک ملازمہ تھی۔ میں اسے حویلی میں ایک دو بار دیکھ چکا تھا۔ نام مجھے معلوم نہیں تھا۔ وہ کانپتی آواز میں بولی۔

”بھرا جی..... آپ کی بڑی بڑی مہربانی۔ یہ دونوں غنڈے میری جان لینے پر نکلے ہوئے تھے۔ یہ حراجادہ، مٹ پیناں کرموں میرا چاچا بننا تھا۔ مجھے کیا پتہ تھا چاچے کے بھیس میں شیطان ہے۔“ لڑکی اپنا دکھ بھی بیان کر رہی تھی اور مجھ سے خوفزدہ بھی تھی۔ میرا ڈاکوؤں جیسا منڈا سا اُسے ڈرار ہا تھا۔

میں اپنا تعارف کرا کے لڑکی کا ڈر دور کر سکتا تھا مگر اس وقت میں ایسی جگہ کھڑا تھا کہ تعارف کرانا ممکن نہیں تھا۔ بلکہ میں کوئی لفظ بھی بولنا نہیں چاہتا تھا تاکہ میری آواز میرا پول نہ کھول دے۔ میں چوہدری کے فارم میں چوری چھپے آیا تھا۔ چوہدری مجھ پر اعتماد کرتا تھا اور سچی بات ہے میں اُس کے اعتماد کو نہیں پہنچانا نہیں چاہتا تھا۔

میں نے بغیر کچھ کہے اپنے گرتے کے مٹن کھولے اور گرتے اتارنے لگا۔ لڑکی سہم کر کچھ اور پیچھے ہٹ گئی۔ میں نے آگے بڑھ کر یہ گرتے اسے تھما دیا اور بھاری آواز میں غرا کر کہا۔

”جاؤ..... چلی جاؤ۔“

وہ میرا مطلب سمجھ گئی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں شکریے کے آنسو بھی تھے اور خوف کے سائے بھی۔ گرتے سنبھالتے ہوئے وہ درختوں میں گھس گئی۔ غالباً فارم میں اس وقت اُن دونوں راکھوں کے سوا اور کوئی موجود نہیں تھا ورنہ میرے دو فائروں کی آواز ضرور کسی نہ کسی کو یہاں کھینچ لاتی۔ لڑکی گرتے پہن کر واپس آ گئی تو میں نے اُسے ساتھ لیا اور چار دیواری پار کرنے میں مدد دی۔ چار دیواری سے نکلنے ہی وہ وحشی ہرنی کی طرح گاؤں کی طرف بھاگ نکلی۔ میں خاموشی سے ایک دوسرے راستے پر چل دیا۔

وہاں خاردار باڑھی۔ کوئی دیہاتی اس فارم میں داخل نہیں ہو سکتا تھا اور اگر ہوتا تھا تو سزا بھگتا تھا۔ میں نے ایک دو دفعہ چوہدری کے ساتھ فارم کی سیر کی تھی مگر اُس سیر اور آج کی سیر میں بڑا فرق تھا۔ آج چوہدری کے کارندوں کو اس آمد کا قطعاً علم نہیں تھا۔ میں اپنی مرضی سے گھوم پھر سکتا تھا۔

یہ موقع بھی مجھے اس طرح مل گیا تھا کہ چند روز بعد گاؤں کے نواح میں ایک بڑا میلہ شروع ہو رہا تھا۔ اس میلے کے بارے میں میں آپ کو آگے چل کر بتاؤں گا۔ فی الحال یہ سمجھ لیں کہ میلے کی تیاری کے لیے زمین ہموار کرنے کا کام ہو رہا تھا اور چوہدری کے بہت سے کارندے اس کام میں مشغول تھے، فارم کے راکھے بھی ادھر ہی گئے ہوئے تھے۔

میرے لیے یہ مناسب وقت تھا کہ فارم میں گھس کر اس کا اچھی طرح جائزہ لے سکوں۔ میرے اس جائزے کا کیا نتیجہ نکلا؟ میرا خیال ہے میں اس بارے میں آپ کو پہلے ہی بتا دوں تاکہ آپ خواہ مخواہ تجسس کا شکار نہ ہوں۔ میں کوئی ایک گھنٹہ فارم کے اندر رہا مگر مجھے وہاں کوئی قابل اعتراض چیز نظر نہیں آئی۔ درحقیقت وہاں کوئی غیر قانونی کام نہیں ہو رہا تھا۔ مجھے اس سلسلے میں وقتاً فوقتاً جو اطلاعات ملی تھیں۔ اُن کی بنیاد کمزور شک پر تھی۔ غالباً چوہدری نے اپنے قیمتی پودوں کی رکھوالی کے لیے اتنے سخت حفاظتی انتظامات کر رکھے تھے۔

اس فارم میں گھسنے کا مجھے صرف ایک فائدہ ہوا اور وہ یہ کہ میں نے ایک بے گناہ لڑکی کو دو افراد کے ہاتھوں برباد ہونے سے بچا لیا۔ تفصیل اس واقعے کی کچھ یوں ہے کہ میں جب فارم کے اُس حصے میں پہنچا جہاں چوہدری نے ایک بڑا جھیل نما تالاب بنا رکھا تھا اور جس میں اس نے پھلیاں پال رکھی تھیں، اچانک مجھے کیلے کے درختوں سے دہلی دہلی آہٹوں کی آواز آئی پھر یوں لگا جیسے کوئی بڑی پھلی پانی میں تڑپ رہی ہے۔ میں لپک کر موقع پر پہنچا۔

جھیل کے کنارے میں نے تین سائے دیکھے، اُن میں ایک عورت تھی۔ وہ آپس میں گھٹم گھٹا تھے۔ کچھ دیر درختوں کے اندر سے یہ منظر دیکھنے کے بعد میں سمجھ گیا کہ کیا معاملہ ہے۔ چوہدری کے دورا کھے کسی اکیلی لڑکی کی عزت سے کھیلنے کی کوشش میں تھے۔ میں نے لپک کر آگے بڑھ کر انہیں لاکارا۔ انہوں نے لڑکی کو چھوڑا اور لپک کر اپنی لائیاں اٹھائیں۔ بڑی تیزی سے وہ مجھ پر چھپنے۔ میں نے ایک کی لائیں کا وار بچا کر اس کے پیٹ میں زوردار ناگ رسید کی۔ وہ اچھل کر پانی میں جا گرا۔ دوسرے کی چمکدار لائیں میرے کندھے کو چھوتی

☆=====☆=====☆

اگلے روز چوہدری مراد اپنے دونوں کارندوں کے ہاتھ رسی سے باندھے ہوئے تھانے لے آیا۔ میں اُن خبیثوں کو پہچان گیا۔ ایک کے منہ پر میرے ریوالت کا زخم تازہ تھا۔ چوہدری مراد چالیس پینتالیس برس کا ایک لمبا ترنگا شخص تھا۔ اُس نے میرے قریب پہنچ کر دونوں مجرموں کو ”کھینچا“ مارا تو وہ لڑکھڑاتے ہوئے میرے قدموں میں آگرے اور منٹیں ساجتیں کرنے لگے۔ چوہدری نے ڈانٹ کر اُنہیں چپ کرایا۔ اُس کے عقب میں رات والی لڑکی بھی سہمی ہوئی کھڑی تھی۔ اب اس کے جسم پر ڈھنگ کا لباس تھا۔ وہ گندمی رنگ کی ایک دلکش لڑکی تھی۔ عمر یہی کوئی پندرہ سولہ برس رہی ہوگی۔ اُس کی ناک میں خانہ بدوش لڑکیوں کی طرح چاندی کی نتھ تھی۔ چوہدری مراد نے دھاڑتے ہوئے کہا۔

”تھانیدار! گرفتار کر لے ان دونوں بدکاروں کو۔ رات ان شیطانوں نے میری عزت پر ڈاکہ ڈالنے کی کوشش کی ہے۔“

میں نے انجان بنتے ہوئے کہا۔ ”ہوا کیا چوہدری صاحب؟“

چوہدری نے کہا۔ ”بول گویے، کیا ہوا تھا تیرے ساتھ۔ سب کچھ بتا دے تھانیدار کو۔“
چوہدری کے ساتھ کچھ اور آدمی بھی آئے تھے اور اب وہ سب خونی نظروں سے دونوں مجرموں کو دیکھ رہے تھے۔ مجرموں میں سے ایک نوجوان تھا اور دوسرے کی عمر چالیس سال سے اوپر تھی۔ اُس کے منہ پر چیچک کے داغ تھے۔

لڑکی نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

”تھانیدار صیب! یہ چاچا کر موم..... یہ چاچا کر موم.....“

لڑکی کی آواز میں بڑی معصومیت تھی لگتا تھا کوئی بچی بول رہی ہے۔ چوہدری نے اسے ڈانٹ کر کہا۔ ”تھتھلا کیوں رہی ہے۔ صاف صاف بتا دے وہ سب کچھ جو مجھے بتایا تھا۔“

لڑکی نے لڑنے والے انداز میں ہاتھ نیچایا اور بولی۔ ”یہ چاچا شڑنگ (کرموں کی چھیڑ) مجھے چکر دے کر وہاں لے گیا۔ کہتا تھا چل آ میرے ساتھ آج ڈیرے پر کوئی نہیں۔ تجھے آم کھاؤں گا۔ مجھے کیا پتہ تھا اس کے من میں کیا کھوٹ ہے۔ میں وہاں چلی گئی۔ اس نے پہلے مجھے دو تین سکے سڑے آم کھلائے پھر..... جبر دیتی کرنے لگا۔ یہ دوسرا بھنڈی کے منہ والا بھی اس کے ساتھ تھا۔ دونوں میرے کپڑے کھینچ رہے تھے۔ کہتے تھے.....“ لڑکی شرما کر چپ ہو گئی۔ پھر چیچک زدہ شخص سے بولی۔ ”بتاؤں چاچا شڑنگ تُو نے کیا کہا تھا۔“
چوہدری نے کہا۔ ”اچھا دفع کر۔ آگے بتا کیا ہوا تھا؟“

لڑکی نے کہا۔ ”تھانیدار صیب! ان دونوں نے مجھے پانی میں گرادیا۔ بس مار ہی دینا چاہتے تھے..... اتنے میں ایک واہ گرد کا پیارا سفید گھوڑے پر سوار درختوں سے نکلا تو میں سمجھی شاید ان کا ہی ساتھی ہے۔ پر اس نے بڑا کام دکھایا۔ اس نے نیفے سے کوئی..... کوئی آدھ گز لمبا پستول نکالا اور دھاں دھاں گولیاں چلانا شروع کر دیں۔ موت سامنے دیکھی تو یہ دونوں شیر ذم دبا کر بھاگ گئے۔ اس بھلے مانس نے مجھے اپنا گرتہ اتار کر دیا تاکہ میں پہن کر گاؤں آسکوں۔ گرد کی سوگند اگر وہ نہ ہوتا تو آج چھیڑ (تالاب) سے میری لاش ملنی تھی۔“

لڑکی اپنی کہانی اس طرح سنارہی تھی جیسے رات اُس کی عزت نہیں جا رہی تھی بلکہ کوئی اُس سے ایک روپے کا نوٹ چھین رہا تھا۔ بڑا کھنڈر سا انداز تھا اُس کا۔ وہ جھوٹ سے بھی کام لے رہی تھی۔ اُس نے کہا تھا کہ اس کا منہ بولا چاچا شڑنگ یعنی کرموں اسے خود فارم پر لے کر گیا تھا۔ جہاں تک میرا اندازہ تھا وہ آموں کے لالچ میں خود ہی وہاں پہنچی تھی۔ اس کے علاوہ وہ کچھ اور بھی جھوٹ بول رہی تھی۔ یعنی آدھ گز لمبا پستول۔ سفید گھوڑا اور تابڑ توڑ فائرنگ۔ بہر حال اُس کی باتوں سے ظاہر تھا کہ وہ ایک سیدھی سادی اور کھری لڑکی ہے۔ مجھے اُس کا انداز بہت پسند آیا اور دل میں اس کے بارے جاننے کی خواہش پیدا ہوئی۔

مجرم تھوڑی سی پھینٹی کھا کر حوالات میں پہنچ گئے تو گاؤں کے معززین بھی واپس چلے گئے۔ لڑکی بھی چلی گئی۔ تھانے میں صرف چوہدری شاہ مراد بیٹھا رہ گیا۔ میں نے اُس سے لڑکی کے بارے میں پوچھا تو اُس نے کہا کہ اس کی کہانی بھی عجیب و غریب ہے۔ اُس نے بتایا کہ اس کا نام موہنی ہے۔ آج سے چند سال پہلے یہ اپنی بڑی بہن کے ساتھ ہمارے گاؤں کے میلے میں گانے آئی تھی۔ دراصل یہ ایک خانہ بدوش قبیلے سے تعلق رکھتی ہے۔ اس قبیلے کی کئی عورتیں گانے بجانے میں اپنا جواب نہیں رکھتیں۔ اُس سال موہنی اور اس کی بڑی بہن نے میلہ لوٹ لیا۔ لوگوں نے دونوں بہنوں کا گانا بہ حد پسند کیا۔ دور دور کے دیہات سے لوگ دونوں بہنوں کی آواز سننے کے لیے آئے۔ میلہ سات روز کا ہوتا ہے لیکن اُس سال پورے نو دن چلا۔

سب کچھ ٹھیک ٹھاک تھا لیکن میلے کے آخری روز ایک گڑبڑ ہو گئی۔ تماشا یوں میں سے ایک شخص نے موہنی سے چھیڑ چھاڑ کی تو میرے دونوں بیٹے پیش میں آ گئے۔ پنڈال کے اندر ہی لڑائی شروع ہو گئی۔ لڑکیاں لگنے سے پانچ چھ بندوں کے سر پھٹ گئے۔ پولیس نے آکر

اور دعائیں دینے لگی کہ میں نے مشکل میں دونوں بہنوں کا ساتھ نبھا کر بڑی نیکی کی ہے۔ پھر اُس نے مجھے ایک گٹھڑی دی جس میں اس کی عمر بھر کی کمائی تھی اور کہا کہ میں ایک دو سال میں کوئی اچھا سا رشتہ دیکھ کر موٹی کی شادی کر دوں.....

سہتی کے مرنے کے بعد اب موٹی میری ذمہ داری ہے۔ میں جانتا ہوں دوار کا سنگھ اب بھی اُس کے پیچھے ہے۔ اس لیے میں نے اُسے حویلی سے باہر نکلنے سے منع کر رکھا ہے۔ اگر وہ کہیں جاتی بھی ہے تو ایک دو مسلح آدمی اس کے ساتھ ہوتے ہیں۔ لیکن رات نہ جانے وہ کیسے فارم میں پہنچ گئی۔ کم بخت کے پاؤں سے بلایاں بندھی ہوئی ہیں..... میں اس کوشش میں ہوں کہ اس کی برادری کے کسی لڑکے سے شادی کرا کے اسے کسی دوسرے علاقے میں بھجوا دوں تاکہ اس کی بہن کو دیا ہوا قول پورا ہو.....“

میں جانتا تھا چوہدری جو کچھ کہہ رہا ہے ٹھیک کہہ رہا ہے۔ وہ اُن لوگوں میں سے تھا جو قول دیتے ہیں تو پھر جان کے بدلے بھی اُسے نبھاتے ہیں اور ایک بار جس کا ہاتھ پڑتے ہیں اُسے منزل تک پہنچا کے دم لیتے ہیں۔ ایک طرح موٹی کو دوار کا سنگھ سے بچانے کا مسئلہ اس کی آن کا مسئلہ بن چکا تھا اور وہ اس معاملے میں پوری طرح سنجیدہ تھا۔

چوہدری شاہ مراد اپنی کہانی ختم کر چکا تھا۔ مجھے اس موقع پر اُس کی اصول پسندی کی تعریف کرنی چاہئے تھی لیکن میرا ذہن کہیں اور ہی پہنچا ہوا تھا۔ کانوں میں دوار کا سنگھ کا نام گونج رہا تھا اور دل و دماغ میں جیسے کوئی گھڑ دوڑ جاری تھی۔ میں دوار کا سنگھ کے نام سے واقف تھا اور مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ کئی ضلعوں کی پولیس اس کے پیچھے ہے۔ میرے علم کے مطابق قریباً دو انپکٹر اور دو ڈمی ایس پی اس کی گرفتاری میں ناکام رہنے کے بعد وقتاً فوقتاً لائن حاضر اور ٹرانسفر ہو چکے تھے۔ اگر اُس کی گرفتاری کا کارنامہ میرے ہاتھوں انجام پا جاتا تو اعلیٰ افسروں میں میری نیک نامی ہو سکتی تھی۔ اس وقت مجھے نیک نامی کی ضرورت بھی تھی۔ مجھے ترقی کی خواہش نہیں تھی اور نہ ہی میں ترقی کرنا چاہتا تھا۔ (اس کی کیا وجوہات تھیں پھر کبھی آپ کو بتاؤں گا) ہاں یہ ضرور چاہتا تھا کہ محکمے کے اعلیٰ افسر مجھ پر اعتماد کرنا سیکھ جائیں اور مجھ سے میری قابلیت کے مطابق کام لیں۔

میں نے وہیں چوہدری مراد کے سامنے بیٹھے بیٹھے فیصلہ کیا کہ مجھے دوار کا سنگھ کو گرفتار کرنا ہے..... قدرت مجھے ایک سنہری موقع فراہم کر رہی تھی اور مجھے ہر قیمت پر اس موقع سے فائدہ اٹھانا تھا۔ جس دن میری تبدیلی اس تھانے میں ہوئی تھی۔ میں خاصا ناخوش تھا لیکن آج میں سوچ رہا تھا کہ اس تھانے میں میرا آنا ایک نیک فال ثابت ہوا

معاملہ رفع دفع کر دیا۔ بعد میں پتہ چلا کہ موٹی کو چھیڑنے والا شخص علاقے کا مشہور ڈاکو دوار کا سنگھ تھا۔ وہ ایک عام دیہاتی کے بھیس میں میلہ دیکھنے آیا ہوا تھا۔ اُس نے ایک بندے کے ہاتھ مجھے پیغام بھجوایا کہ دوار کا سے ٹکر لے کر میرے بیٹوں نے اپنے رستے میں کانٹے بوئے ہیں اور بہت جلد مجھے اس کی سزا مل جائے گی۔

دوسری طرف موٹی اور اس کی بڑی بہن سہتی کو بھی معلوم ہو چکا تھا کہ اُن کی خاطر لڑنے بھڑنے والا مشہور ڈاکو دوار کا تھا۔ وہ سخت خوفزدہ ہوئیں اور میرے پاس آکر مشورہ طلب کیا۔ میں نے انہیں تسلی بخشی دی اور کہا کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ میں نے پولیس کی مدد طلب کی ہے اور بہت جلد دوار کا جیل کی سلاخوں کے پیچھے نظر آئے گا، وہ اطمینان سے واپس جائیں انہیں کوئی خطرہ نہیں۔ کہنے کو تو میں یہ سب کچھ کہہ رہا تھا لیکن خوف میرے دل میں بھی موجود تھا۔ میں جانتا تھا دوار کا کو پکڑ لینا اتنا آسان نہیں۔

دس پندرہ روز خیریت سے گزرے۔ پھر ایک دن سہتی اور موٹی روتی دھوتی میرے پاس آگئیں۔ سہتی نے کہا کہ کل رات دوار کا کے کچھ بندے ہمارے ڈیرے پر آئے تھے انہوں نے ہمارے سردار کو دھمکیاں دیں اور کہا کہ موٹی نامی لڑکی کو ہمارے حوالے نہ کیا تو برا نتیجہ نکلے گا۔ انہوں نے ہمارے سردار کو روپے گبنے کا لالچ بھی دیا اور کہا کہ جیسے بھی ہو یہ لڑکی اُن کو ملنی چاہیے۔ آج ہمارے سردار نے ہمیں اپنے خیمے میں بلا کر کہا کہ تمہاری اور ڈیرے کی بہتری اسی میں ہے کہ تم دونوں یہاں سے چلی جاؤ۔ دوار کا جیسا بدنام شخص تمہارے پیچھے پڑ گیا ہے اور اس سے پوری بستی کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔ ہمیں خود بھی یہی بات سمجھ میں آئی کہ ہم ڈیرے سے نکل جائیں۔

چوہدری مراد نے حقہ گڑ گڑایا اور پھر میرے ارد گرد دھواں چھوڑ کر ماضی میں جھانکتا ہوا بولا۔ ”مجھے دونوں بہنوں پر بڑا ترس آیا اور میرے دل نے کہا کہ مجھے ان دونوں عورتوں کو اس مصیبت میں تنہا نہیں چھوڑنا چاہئے۔ میں نے انہیں حویلی میں پناہ دے دی اور وہ پوری حفاظت سے وہاں رہنے لگیں۔ دوار کا میری حویلی میں داخل ہونے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا اس لیے بیچ و تاب کھا کر رہ گیا۔ وقت گزرتا رہا۔

سہتی اپنی چھوٹی بہن کا بہت خیال رکھتی تھی۔ بالکل ماں کی طرح اُس کے لاڈ دیکھتی تھی۔ اسی دوران وہ بیمار ہو گئی..... پھر کچھ عرصہ بستر پر گزارنے کے بعد مر گئی۔ یہ آج سے کوئی ڈیڑھ سال پہلے کی بات ہے۔ مرنے سے پہلے اُس نے مجھ سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ میں اُس کے پاس پہنچا تو اس نے شدید بیماری کے باوجود بستر سے اتر کر میرے پاؤں پکڑ لیے

ہے۔

کر کے آیا تھا۔ میں نے پورے اعتماد کے ساتھ چوہدری کو سمجھانا شروع کیا۔ آخر ایک طویل کوشش کے بعد میں اُسے اپنے ڈھب پر لانے میں کامیاب ہو گیا۔ اُس کے چہرے پر نیم رضا مندی کے آثار نظر آنے لگے۔ اُس نے الجھن سے کہا۔

”نواز خان! لیکن یہ سب ہوگا کیسے؟“

میں نے کہا۔ ”چوہدری صاحب! جو کچھ مجھے آپ نے بتایا ہے اور جو باتیں مجھے دوسرے لوگوں سے معلوم ہوئی ہیں اُن سے پتہ چلتا ہے کہ دورا کا سنگھ موٹنی کے پیچھے پاگل ہو رہا ہے اور موٹنی سے بھی زیادہ وہ اس کی آواز کا عاشق ہے..... میں صحیح کہہ رہا ہوں نا؟“ چوہدری نے بے دلی سے اثبات میں سر ہلایا۔ میں نے کہا۔ ”گاؤں میں بڑے بوڑھوں میں یہ بات بھی مشہور ہے کہ دورا کا نے شہر کی ایک رنڈی کو ایک ہزار روپے کے گہنے انعام میں دیئے تھے۔ صرف اس لیے کہ اس کی آواز موٹنی کی آواز سے ملتی تھی.....“

چوہدری نے کہا۔ ”ہاں لوگ کہتے تو ہیں لیکن پتہ نہیں اس میں کتنا سچ ہے اور کتنا جھوٹ؟“

میں نے کہا۔ ”چلو یہ تو آپ مانتے ہیں نا کہ دورا کا پرانا پانی، رنڈی باز اور گانا سننے کا بے حد شوقین ہے۔ اچھا گانا سننے کے لیے وہ دور دور تک پہنچ جاتا ہے۔“ چوہدری نے سر ہلا کر میری ہاں میں ہاں ملائی۔ میں نے کہا۔ ”تو بس ٹھیک ہے۔ دورا کا کے لیے ہم ایک شاندار پھندا تیار کر سکتے ہیں۔“

”وہ کیا؟“ چوہدری نے پوچھا۔

میں نے کہا۔ ”چوہدری صاحب! آپ قانون کی خاطر اور لوگوں کی بھلائی کے لیے چند روز کے واسطے موٹنی کو حویلی کی چار دیواری سے باہر نکال لیں۔“

چوہدری نے کہا۔ ”کیا مطلب ہے تمہارا۔ میں دورا کا کو لپکانے کے لیے اُس بے سہارا کو کھیتوں میں کھلا چھوڑ دوں۔“

میں نے کہا۔ ”میرا یہ مطلب نہیں مراد صاحب..... دیکھئے ٹھیک دو روز بعد میلہ شروع ہو رہا ہے۔ اس دفعہ میلے کی منادی کرنے والے یہ منادی بھی کریں گے کہ ناچ گانے کے تھیٹر میں سہتی کی چھوٹی بہن موٹنی اپنی آواز کا جادو جگائے گی۔ ایک دفعہ یہ خبر ارد گرد کے دیہات میں پھیل گئی تو مجھے یقین ہے کہ دورا کا سنگھ تک بھی پہنچے گی اور وہ کسی نہ کسی طرح تھیٹر میں پہنچنے کی کوشش کرے گا..... ایک دفعہ وہ یہاں آ گیا اور آپ لوگوں نے اُسے پہچان لیا تو میرا دعویٰ

☆=====☆=====☆

کوئی تین روز بعد میں چوہدری مراد کی حویلی میں اُس کے سامنے بیٹھا تھا۔ میں نے کہا۔

”چوہدری صاحب! آپ دورا کا کو گرفتار کرانے کا کیوں نہیں سوچتے جو تلوار دیر سے آپ کے سر پر لٹک رہی ہے وہ ہٹ جائے گی.....“

چوہدری نے کہا۔ ”یہی سوال میں تم سے پوچھ سکتا ہوں۔ تمہارا تعلق پولیس سے ہے۔ آخر تم لوگ اب تک اُسے گرفتار کرنے میں کامیاب کیوں نہیں ہوئے۔ دو تین ضلعوں کی پولیس اس کام میں لگی ہوئی ہے۔ کئی بے گناہوں کے تم لوگوں نے ہاتھ پاؤں توڑے ہیں اور جیلوں میں ڈالا ہے۔ وہ خبیث پھر بھی تمہارے ہاتھ نہیں آیا۔“

میں نے کہا۔ ”چوہدری صاحب! اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنا ٹھکانہ بہت خفیہ رکھتا ہے اور واردات کرنے سے پہلے ہی اڈا بدل دیتا ہے۔ اس کے علاوہ پچھلے دو سالوں میں اُس نے وارداتیں بھی چند ایک ہی کی ہیں۔ اب میری اطلاعات کے مطابق پچھلے چھ ماہ سے اُس نے کوئی واردات نہیں کی۔ کہیں چھپ کر بیٹھا ہوا ہے اور جمع شدہ پیسے سے موج کر رہا ہے۔ ایسے میں پولیس بھلا کیا کر سکتی ہے۔“

چوہدری نے کہا۔ ”پھر مجھ سے کیوں کہہ رہے ہو کہ اُسے گرفتار کیوں نہیں کراتے۔“ میں نے مسکرا کر کہا۔ ”اس کی ایک وجہ ہے مراد صاحب۔ آپ کے پاس ایک ایسا پھندا ہے جس میں دورا کا آسانی سے پھنس سکتا ہے۔“

”کیا مطلب؟“ چوہدری نے چونک کر پوچھا۔

میں نے کہا۔ ”موٹنی۔“

چوہدری کا منہ کھل گیا اور چہرہ غصے سے سُرخ ہو گیا لیکن پھر دھیرے دھیرے منہ بند ہو گیا اور چہرے کا رنگ بھی واپس آ گیا۔ اُس کی آنکھیں گہری سوچ میں ڈوب گئیں۔ کچھ دیر بعد اس نے کہا۔ ”نہیں تمہانیدار! میں یہ خطرہ مول نہیں لے سکتا۔ تمہارا مطلب ہے کہ دورا کا کے لیے موٹنی کو چارے کے طور پر پیش کیا جائے..... لیکن اس میں نقصان بھی ہو سکتا ہے۔ وہ بد بخت تمہارے اندازوں سے زیادہ ہوشیار اور بے رحم شخص ہے۔“

مجھے خوشی ہوئی کہ چوہدری میری بات سمجھ رہا ہے۔ اس کے خدشے بھی اپنی جگہ درست تھے۔ مجھے پہلے سے معلوم تھا کہ وہ ان خدشوں کا اظہار کرے گا لہذا میں پہلے سے تیاری

ہے کہ وہ بچ کر نہیں جاسکے گا۔“

میری آواز میں جو پختہ عزم تھا وہ خود میرے اپنے کانوں نے بھی محسوس کیا۔ چوہدری کی آنکھوں میں پہلی بار امید کی ایک کرن چمکی۔ اُس نے حقے کا ایک طویل کش لے کر کہا۔ ”نواز خان! مجھے تجھ پر بھروسہ ہے اور بات بھی تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ پھر بھی یہ ایک خطرناک معاملہ ہے۔ ایک طرح سے ہم سوئے ہوئے فتنے کو جگانے کی کوشش کریں گے۔ مجھے اس بارے میں اچھی طرح سوچ سمجھ لینے دو۔“

میں نے پنجابی میں کہا۔ ”چوہدری صاحب! سوچیں پیاتے بندا گیا۔ ٹسی بس فیصلہ کرو۔“

☆=====☆=====☆

چوہدری شاہ مراد کا فیصلہ میرے حق میں ہو گیا۔ دو روز بعد ڈھنڈورچی دیہات میں جو منادی کر رہے تھے اُس میں موہنی کا ذکر بھی وضاحت سے موجود تھا..... اب میں آپ کو اُس میلے کے بارے میں تھوڑا سا بتا دوں جو ہر سال گاؤں سے باہر شاہ مراد کی زمینوں میں لگتا تھا۔ ایک مجبوری کی وجہ سے میں اس علاقے کا نام ظاہر نہیں کر سکتا لیکن کچھ پڑھنے والے جان جائیں گے کہ یہ کس جگہ کی بات ہے۔ یہ میلہ ”میلہ فردوسی“ کے نام سے مشہور تھا۔ اس کا آغاز شاہ مراد نے ہی کوئی دس سال پہلے کرایا تھا جب تک شاہ مراد زندہ رہا یہ میلہ دھوم دھام سے ہوتا رہا۔ آخر کوئی تیس سال بعد جب شاہ مراد فوت ہوا تو میلے کا زور بھی ٹوٹ گیا اور پھر دھیرے دھیرے یہ ختم ہو گیا۔

”میلہ فردوسی“ اردگرد کے موضوعات میں جشن کی طرح منایا جاتا تھا۔ کئی روز پہلے سے مٹھائیوں کی دکانیں سج جاتی تھیں اور جھولے وغیرہ لگ جاتے تھے۔ گزرنے والے ہر دن کے ساتھ میلے کی رونق بڑھتی جاتی تھی۔ اردگرد کے دیہات سے لوگ ٹولیوں کی صورت میلے میں شریک ہونے آتے تھے۔ یہاں تک کہ امرتسر اور جالندھر سے بھی شوقیوں کے قافلے پہنچتے تھے۔ دور دور سے طوائفیں اور گانے والیاں بلائی جاتی تھیں۔ قوالوں کو خاص طور پر دعوت دی جاتی تھی۔ اس کے علاوہ بازی گر، میراثی، بھانڈ، پہلوان، گھڑسوار اور نیزہ باز بھی دور دور کے دیہات سے شرکت کے لیے آتے تھے۔ شاہ مراد نے میلے کا انتظام نہایت سلیقے سے کر رکھا تھا۔ ہر کھیل تماشے کے لیے علیحدہ پنڈال تھا اور نظم و نسبق برقرار رکھنے کے لیے چوہدری کے مسلح آدمی آٹھوں پہر گشت کرتے تھے۔

میلے کے آخری روز مختلف کھیلوں کے زبردست مقابلے ہوتے تھے اور شاہ مراد اپنے ہاتھوں سے جوانوں میں انعام تقسیم کرتا تھا۔ میلے کے آخری روز ہی پیر فردوسی شاہ کے مزار پر چنکھا چڑھانے کی رسم ادا ہوتی تھی اور ایک بہت بڑا جلوس شاندار پنکھے کے ساتھ مزار پر حاضری دیتا تھا۔ اس جلوس کی قیادت شاہ مراد خود کیا کرتا تھا۔ قصہ مختصر اس سات روزہ میلے میں کھیل تماشے، راگ رنگ، خداخونی اور عیش و عشرت سب کچھ موجود ہوتا تھا اور یہ سب کچھ ایسا شاندار ہوتا تھا کہ دیکھنے والا مدتوں بھول نہیں سکتا تھا۔

آخر میلے کا آغاز ہو گیا۔ راگ رنگ کے تھیٹر میں موہنی بھی دوسرے فن کاروں کے ساتھ اپنی آواز کا جادو جگانے لگی۔ میں نے میلے کے دوسرے روز اُس کا گانا سنا۔ چند لوک گیتوں اور ایک زبردست بھنگڑے کے بعد موہنی کی باری آئی تو تماشا نیوں نے جوش و خروش سے اُس کا استقبال کیا۔ اُس نے اپنی شوخ آنکھیں مٹکا مٹکا کر پیتل کی گڑوی بجانا شروع کر دی اور ایک دل موہ لینے والا ماہیا بنایا۔ پورا پنڈال جھومنے لگا۔ لوگ فرمائش پر فرمائش کرنے لگے۔ کوئی ایک گھنٹے بعد وہ بمشکل جان چھڑا کر جاسکی۔

میں نے ایسا انتظام کیا تھا کہ پنڈال کے اندر اور باہر ہر وقت کم از کم دس پولیس والے موجود رہتے تھے۔ یہ سارا عملہ سادہ لباس میں تھا۔ اُن میں دو اے ایس آئی بھی تھے اور اُن کے پاس ریوالور تھے۔ باقیوں کے پاس لٹائیاں اور برچھیاں وغیرہ ہوتی تھیں۔ میں موہنی کی جان اور عزت کے لیے ہرگز کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا اور اگر ایسا کچھ ہو جاتا تو میں خود کو کبھی معاف نہ کر سکتا۔

دوسرے روز جب وہ میلے میں گانا سنا کر واپس حویلی پہنچی تو میں بھی حویلی چلا گیا۔ چوہدری گھر میں موجود نہیں تھا۔ حویلی کے پچھواڑے کے کچے احاطوں میں ملازموں کے کمرے تھے۔ ان ہی میں سے ایک کمرہ موہنی کا بھی تھا۔ موہنی اب مجھ سے کافی بے تکلف ہو چکی تھی۔ میں سیدھا اُس کے کمرے میں چلا گیا۔ دروازہ کھٹکھٹایا تو وہ خود ہی باہر نکلی۔ اُس نے تھیٹر والا لباس بدل لیا تھا اور اب سیدھے سادے کپڑوں میں بڑی معصوم سی نظر آ رہی تھی۔ مجھے اندر لے جا کر اُس نے چار پائی پر بٹھایا اور خود بور یہ بچھا کر نیچے فرش پر بیٹھ گئی۔

”صیب جی! آج آپ پہلی بار میرے ”گریب خانے“ پر آئے ہیں۔ بتائیں کیا کھد مت کروں؟“

میں نے کہا۔ ”جو کچھ تم کر رہی ہو اس سے بڑی خدمت اور کیا ہو سکتی ہے۔ اگر تمہاری

کوشش سے دوار کا سنگھ پکڑا گیا تو یقین کر دیا کہ ایک خلقت تمہیں دعائیں دے گی۔“

وہ ننھی سی ناک چڑھا کر بولی۔ ”صیب جی! میرے بس میں ہونا تو گردن میں دانت مار کر کھون پل جاؤں اُس شیطان کا۔ میری بس ایک ہی آرزو (آرزو) ہے۔ جب آپ اسے پکڑ لیں اور تھانے میں لے جا کر اس کی ٹھکانی کریں تو مجھے جلد وہاں بلائیں۔ جب وہ چیخیں مارے گا تو قسم سے بڑا ججا آئے گا مجھے۔“

میں نے کہا۔ ”ضرور بلائیں گے موہنی ضرور بلائیں گے وقت تو آنے دو۔۔۔۔۔“ اچانک میری نگاہ کھوٹی پر لٹکتی ہوئی ایک قمیص پر پڑی۔ میں پہچان گیا۔ یہ وہی گرتہ تھا جو چند روز پہلے میں نے موہنی کو فارم میں دیا تھا۔ موہنی نے اس گرتے کو دھو کر بڑے سلیقے سے کھوٹی پر لٹکا رکھا تھا۔ میں نے یونہی پوچھا۔

”موہنی اس کمرے میں تیرے ساتھ۔۔۔۔۔ کوئی مرد بھی رہتا ہے؟“

وہ جھینپ کر بولی۔ ”نہیں تو۔۔۔۔۔ میرے ساتھ کون رہے گا۔ بس ایک رام پیاری رہتی ہے۔ وہ حویلی میں کھانا وغیرہ پکاتی ہے۔“

میں نے کہا۔ ”تو پھر یہ کھوٹی پر گرتے کس کا ہے؟“

اس نے چونک کر کھوٹی کی طرف دیکھا۔ پھر ساری بات اس کی سمجھ میں آگئی۔ مسکرا کر

بولی۔

”صیب جی! یہ اسی کا گرتہ ہے جس نے مجھے ڈیرے پر شڑنگ اور شریفے سے بچایا تھا۔ میری قمیص پھٹ گئی تھی ناں۔ تو اُس نے مجھے یہ گرتہ دیا تھا۔ بڑا بھلا مانس تھا اور دلیر بھی کھوب تھا۔ وہ نہ ہوتا تو شاید آج میں بھی نہ ہوتی۔۔۔۔۔ پتہ نہیں کون تھا؟ کہاں سے آیا تھا؟ میں تو ٹھیک طرح اس کا شکریہ بھی ادا نہ کر سکی۔“

میں دیکھ رہا تھا کہ موہنی کی معصوم آنکھوں میں محبت کا رنگ ہے لیکن یہ کوئی بازاری یا سستی قسم کی محبت نہیں تھی۔ یہ ایسی ہی محبت تھی جو اپنے کسی محسن کے لیے ہو سکتی ہے یا پھر باپ بھائی یا پیارے عزیز کے لیے ہو سکتی ہے۔ میں موہنی کی کیفیت سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ میں نے پوچھا۔

”میرا خیال ہے تو پھر اُس سے ملنا چاہتی ہے۔“

وہ بے باکی سے بولی۔ ”ملنا تو چاہتی ہوں لیکن میں تو اس کی شکل بھی نہیں پہچانتی۔ اس

نے چہرہ منڈا سے میں چھپا رکھا تھا۔۔۔۔۔ میں نے آپ کو بتایا تو تھا تھانے میں۔“

میں نے کہا۔ ”ہاں۔۔۔۔۔ مجھے یاد آگیا۔ تم نے بتایا تھا۔۔۔۔۔ لیکن ابھی اس کی چال ڈھال

ڈیل ڈول، آواز کوئی تو نشانی ہوگی۔“

وہ بولی۔ ”نشانی سے بھلا کیا بھاندہ ہوگا۔“

میں نے کہا۔ ”فائدہ ہو سکتا ہے۔ کیا پتہ وہ اسی گاؤں کا رہنے والا ہو۔“

وہ بولی۔ ”بس ایک ہی نشانی یاد ہے مجھے۔ اس کے سینے کے بالوں میں دائیں طرف

ایک سفید بندیا سی چمک رہی تھی۔ جب اُس نے گرتہ مجھے دینے کے لیے اتارا تھا تو میری نظر

اس بندیا پر پڑی تھی۔“

مجھے موہنی کی بات پر ہنسی آگئی۔ میں سمجھ رہا تھا کہ وہ سفید بندیا کسے کہہ رہی ہے۔

میرے سینے پر بغل کے پاس گولی کا ایک پرانا نشان تھا۔ اس واقعہ کے بارے میں آپ کو کسی

کہانی میں بتا چکا ہوں۔ اس گول نشان پر چونکہ بال نہیں تھے اس لیے وہ فوراً موہنی کی نظر میں

آگیا تھا۔ میں نے ہلکا سا قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

”بہت خوب۔۔۔۔۔ اچھی نشانی بتائی ہے تم نے۔ اب تو ایک ہی طریقہ ہے جس کسی پر

تمہیں شک ہو اُس کا گریبان پھاڑ کر دیکھ لو، ہو سکتا ہے کبھی نہ کبھی پتہ چل ہی جائے۔“

وہ ہنسی تو اس کے سفید دانت موتیوں کی طرح چمکنے لگے۔ اس وقت دروازے پر آہٹ

ہوئی اور چوہدری شاہ مراد کا ایک ملازم جو چوہدری کے مخبر کا کام بھی کرتا تھا۔ اجازت لے کر

اندرا گیا۔ اس نے بتایا کہ کل رات گاؤں سے کوئی تین کوس دور ایک کنویں پر کچھ کسانوں

نے دوار کا سنگھ کو دیکھا ہے۔ وہ اور اس کے کچھ ساتھی ساڈنیوں پر سوار پانی پینے کے لیے

وہاں رکے تھے۔ کسانوں کو پورا یقین ہے کہ وہ دوار کا سنگھ ہی تھا۔۔۔۔۔ میرے لیے یہ اطلاع

نہایت اہم تھی۔ اس کا مطلب تھا فیصلہ کن مرحلہ قریب آگیا ہے۔

☆=====☆=====☆

مخبر کی اطلاع کے بعد ہم مزید چوس ہو گئے لیکن مسلسل انتظار کے باوجود تین راتوں

تک کوئی واقعہ پیش نہیں آیا۔ یہ چوتھی رات یعنی میلے کی چھٹی رات کا واقعہ ہے، ہم تھیر کے

شامیانے میں موجود تھے۔ پورا پنڈال کچھا کچھ بھرا ہوا تھا۔ موہنی کی ریلی آواز کی دھوم اب

امر ترسک پہنچ رہی تھی۔ لوگ اس کی آواز سننے کے لیے کچھ چلے آتے تھے۔ موہنی اپنا دوسرا

تیسرا گانا گارہی تھی جب ایک نپے پر تماشا نیوں نے حلق پھاڑ پھاڑ کر داد دی اور پھر کچھ

نوجوان جوش میں بھنگڑا ڈالتے ہوئے لٹری کے سٹیج پر چڑھ آئے۔ میلے میں لوگ شراب دل

کھول کر پیتے تھے اور نشے میں ایسی الٹی سیدھی حرکتیں کرتے رہتے تھے۔ میرا خیال تھا یہ بھی

کوئی ایسے ہی بد مست نوجوان ہیں اور تھوڑی دیر اچھل کود کر کے نیچے اتر آئیں گے۔۔۔۔۔

دوار کا سنگھ تھا اور اُس کے ساتھ پانچ آدمی تھے۔ انہوں نے یکا یک خود کو سفید پوشوں کے گھیرے میں دیکھا تو مقابلے پر تیار ہو گئے لیکن ان کی بد قسمتی یہ تھی کہ اُن کا سردار زخمی ہو کر گر چکا تھا اور اُن کی ایک رائفل بھی اندھیرے میں کہیں کھو گئی تھی۔ پھر بھی انہوں نے بڑی بے خونی سے لاشیوں اور برتھیوں سے سفید پوشوں پر حملہ کر دیا۔ اس دوران چوہدری کے مسلح کارندے بھی موقع پر پہنچ گئے۔ چند منٹ دونوں طرف سے خوب لاشیں چلی۔ ریوالور اور تھری ناٹ تھری کے دس بارہ فائر بھی ہوئے۔ پھر دوار کا کے ساتھی گہرے دھوئیں اور تاریکی سے فائدہ اٹھا کر بھاگ نکلے۔ دوار کا زخمی ہونے کے باوجود بھاگنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن عین اُس وقت جب وہ آدھا گھوڑے پر سوار ہو چکا تھا میں نے اُسے پیچھے سے آدبوچا۔ اُس نے زور مار کر خود کو چھڑانا چاہا۔ میں نے اُسے پوری قوت کے ساتھ گھوڑے سے اٹھا کر زمین پر پٹخ دیا۔ وہ لڑائی کرنے کے موڈ میں تھا لیکن جب اسے میرے ہاتھوں میں ریوالور اور آنکھوں میں درندگی نظر آئی تو سمجھ گیا کہ اس کوشش میں جان جاسکتی ہے۔ اس کی آنکھوں سے چنگاریاں سی پھوٹ رہی تھیں۔ نہایت نفرت کے ساتھ اُس نے زمین پر تھوکا اور بے خونی سے میری طرف دیکھنے لگا۔ اُس کی حالت کسی ایسے درندے کی تھی جسے آنا فانا جال میں جکڑ لیا گیا ہو۔ موت کے کنویں سے اٹھنے والے شعلے اُس کے بالوں بھرے چہرے پر منعکس ہو رہے تھے۔

دوار کا کی مشکلیں کسے کے بعد اُسے اسی وقت تھانے پہنچایا گیا۔ اُس کا ایک ساتھی موقع پر ہی ہلاک ہو گیا تھا جب کہ دوسرا زخمی ہو کر گرفتار ہوا تھا۔ دوار کا کی گرفتاری کی خبر آنا فانا پورے علاقے میں پھیل گئی۔ میلے میں لگنے والی آگ بجھانے کے بعد پورا گاؤں تھانے کے سامنے جمع ہو گیا۔ یہ لوگ دوار کا اور اس کے مردہ ساتھی کی ایک جھلک دیکھنا چاہتے تھے۔ رات آخری پہر ہم نے بڑی مشکل سے ہجوم کو منتشر کیا اور ایک ٹریکٹر ٹرائی کا انتظام کر کے دوار کا کے زخمی ساتھی کو ہسپتال پہنچایا۔ موہنی اب ہوش میں آ چکی تھی اسے تھیرے سے باہر دوار کا کے ایک ساتھی نے بندوق کا کندا سر پر مار کر بے ہوش کیا تھا۔ سر کے پچھلے حصے پر ضرب آئی تھی۔ تاہم چوٹ خطرناک نہیں تھی۔

چند ہی گھنٹوں میں دوار کا کی گرفتاری کی خبر شہر تک پہنچ گئی اور صبح نو دس بجے تک امرتسر سے ڈی ایس پی اور ایس پی صاحب ہمارے تھانے میں تشریف لے آئے۔ دوار کا کی شناخت ہو گئی تو سب کے چہرے خوشی سے چمک اٹھے۔ ایس پی انگر بڑ تھا۔ اُس نے مجھے دل کھول کر شاباش اور مبارک باد دی اور صاف لفظوں میں کہا کہ اس گرفتاری کا سارا کریڈٹ

بھنگڑے کی ”ہاہو“ کے درمیان موہنی کا گانا بھی جاری تھا۔ اچانک پنڈال کے باہر سے چیخ و پکار کی آوازیں آئیں۔ پھر کسی شخص نے باہر سے چلا کر کہا۔ ”موت کے کنویں میں آگ لگ گئی۔ بھاگو..... بھاگو۔“

ان چند الفاظ نے ہم کے دھماکے کا کام کیا۔ موت کا کنواں تھیرے کے بالکل ہی پاس تھا۔ لوگ اندھا دھند باہر کی طرف بھاگے۔ اس وقت مجھے بھی ایک دروازے سے بھڑکتے ہوئے شعلے نظر آئے۔ موت کا کنواں جو سارے کا سارا لکڑی کا بنا ہوتا ہے دھڑا دھڑ مل رہا تھا۔ میں بھی لوگوں کے ساتھ باہر کی طرف لپکا لیکن اچانک ایک خیال بجلی کی طرح میرے ذہن میں کوند گیا۔ میں نے اپنے قدم روک لیے اور لوگوں میں راستہ بناتا واپس سٹیج کی طرف بڑھا۔ اس وقت میری نگاہ سٹیج پر پڑی اور وہاں کا منظر دیکھ کر میرا جسم سنسنا اٹھا۔ زبردست چیخ و پکار اور بھگدڑ کے درمیان ایک اور سی ڈرامہ کھیلنا جا رہا تھا۔ تین آدمی موہنی کو بازوؤں سے کھینچتے ہوئے سٹیج کے عقبی دروازے کی طرف لے جا رہے تھے۔ وہ چیخ رہی تھی لیکن اس کی آواز سننے کا ہوش کسی کو نہیں تھا۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ لوگ عقبی دروازے میں غائب ہو گئے۔

میں نے اپنا ریوالور نکالا اور لوگوں کو دھکیلتا اور کرسیاں پھلانگتا ہوا ایک بغلی دروازے کی طرف بھاگا۔ بغلی دروازے سے گزر کر جونہی میں تھیرے کے عقب میں پہنچا مجھے موہنی نظر آئی۔ وہ ایک سیاہ چادر میں لپٹی ایک شخص کے کندھے پر پڑی تھی۔ یہ لمبا ترنگا شخص گہرے تاریک دھوئیں میں راستہ بناتا ایک طرف بھاگا جا رہا تھا۔ اُس کے عقب میں دو رائفل بردار دیہاتی تھے۔ موہنی کے لپکتے ہوئے بازو بتا رہے تھے کہ وہ بے ہوش ہو چکی ہے۔ پتہ نہیں وہ خوف کی وجہ سے بے ہوش ہو گئی تھی یا اسے بے ہوش کیا گیا تھا..... یہ لمحے میرے لیے بے حد قیمتی تھے۔ میں چند قدم آگے جا کر گھنٹوں کے بل بیٹھ گیا۔ پھر میں نے نشانہ باندھ کر لمبے شخص کی پنڈلی پر فائر کیا۔ دھماکہ ہوا اور 38 بور کی گولی سنسناتی ہوئی اُس کے منحنے میں گھس گئی۔ وہ لڑکھڑا کر گر اور کندھے سے موہنی پھسل کر دور جا گری۔ دوسرا تیسرا اور چوتھا فائر میں نے ان دونوں رائفل برداروں پر کیا۔ ان میں سے ایک کی رائفل گر گئی اور دوسرا اپنا بازو پکڑ کر دوہرا ہو گیا۔ فائرنگ کی آواز سن کر میرے سفید پوشوں کو ہوش آیا اور وہ چاروں طرف سے لپکتے ہوئے موقع پر پہنچ گئے۔

جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا، سب کچھ ہماری توقع کے مطابق ہوا تھا۔ لمبا ترنگا شخص

ہوئی۔ پتہ نہیں وہ دوار کا کی چیخ و پکار سن کر پہنچی تھی یا اتفاق سے ہی چلی آئی تھی۔ مجھ سے کہنے لگی۔ ”میں دوار کا کو مار پڑتے دیکھوں گی۔“ اُس کا مطالبہ بچگانہ تھا۔ ملزموں سے تفتیش کرتے وقت پوری رازداری برتی جاتی ہے اور میں خود بھی پسند نہیں کرتا تھا کہ ملزم کی مار پیٹ کا منظر کوئی غیر متعلقہ شخص دیکھے۔ بلکہ میں تو عام حالت میں بھی مار پیٹ کا قائل ہی نہیں تھا۔ موہنی کا مطالبہ میں کیسے پورا کر سکتا تھا۔ میں نے اُسے سمجھا بھرا واپس بھیجنا چاہا لیکن وہ اپنی بات پر اڑی رہی۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ اُس کے دل میں دوار کا کے لیے عداوت ہی عداوت ہے اور بات تھی بھی عداوت کی۔

اُن دنوں بہنوں نے دوار کا کی وجہ سے بہت دکھ جھیلے اور دھکے کھائے تھے۔ شاید اپنی بڑی بہن کی موت کا غم ابھی موہنی کے ذہن میں تازہ تھا اور وہ اپنے دشمن کو مصیبت میں دیکھ کر انتقام کے جذبے کو تسکین پہنچانا چاہتی تھی۔ جب موہنی کا اصرار بڑھا تو میں نے اُسے حوالات میں دوار کا کی ”ٹھکانی“ دیکھنے کی اجازت دے دی۔ وہ میرے ساتھ حوالات میں پہنچی اور دوار کا کو پیچھے چلاتے دیکھ کر بچوں کی طرح خوش نظر آنے لگی۔ اُس کی آنکھوں میں عداوت کے ساتھ گہری دلچسپی بھی موجود تھی۔

کچھ دیر وہاں رکنے کے بعد وہ واپس چلی گئی لیکن یہ اُس کی آخری آمد نہیں تھی۔ اگلے چودہ پندرہ روز میں وہ کئی بار تھانے آئی اور دوار کا سنگھ سے پوچھ گچھ کا نظارہ کرتی رہی۔ میں اُسے سختی سے منع بھی نہیں کر سکتا تھا۔ درحقیقت دوار کا کی گرفتاری میں موہنی کی کوششوں کا بڑا دخل تھا۔ ایک طرح سے اُس نے دوار کا کو قانون کے جال میں لانے کے لیے خود کو قربانی کی ”گائے“ بنایا تھا اور نہایت دلیری سے میری ہدایات پر عمل کیا تھا۔

اب اگر وہ اپنے گرفتار کرائے ہوئے مجرم سے پولیس کی تفتیش کا منظر دیکھنا چاہتی تھی تو میں انکار کر کے اس کا دل کیوں توڑتا۔ اُس کی موجودگی سے مجھے ایک فائدہ بھی ہوتا تھا۔ دوار کا سنگھ بے حد اکھڑ مزاج شخص تھا۔ تاہم عورت ذات کی موجودگی میں اُسے اپنی بے عزتی کرنا پسند نہیں تھی اور موہنی کی موجودگی میں وہ کوشش کرتا تھا کہ حوالدار دیوی لال کے ساتھ زیادہ سے زیادہ تعاون کرے۔

ایک دن دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ حوالدار دیوی لال کے علاوہ ایک مسلمان حوالدار مبارک علی بھی تھانے میں موجود تھا۔ وہ دوار کا کے پیدائشی ضلع کا رہنے والا تھا۔ اس لیے اُسے دوار کا سے کچھ ہمدردی بھی تھی۔ اُسے حوالات میں پان سگریٹ بھی لا کر دیا کرتا تھا۔ ایک روز جب دوار کا سے اس کے ساتھیوں کی نشاندہی کرانے کے لیے حوالدار دیوی لال اسے چھتر

صرف اور صرف مجھے جاتا ہے۔ پولیس لائن میں اکثر افسر لوگ اپنے ماتحتوں کی کارکردگی پر چھاپہ مارنے کی کوشش کرتے ہیں مگر انگریز اس معاملے میں بھی اصول پرستی کا مظاہرہ کیا کرتے تھے۔ انگریز ایس پی نے مجھ سے تفتیش و گرفتاری کا سارا احوال سنا اور میری منصوبہ بندی کی تعریف کی۔ میں چاہتا تھا کہ دوار کا کو شہر لے جا کر پوچھ گچھ کی جائے مگر ایس پی صاحب کا خیال مختلف تھا۔ انہوں نے مجھے کہا کہ مجرم کو اپنے پاس ہی رکھوں اور اگر مجھے کوئی خدشہ ہے تو وہ مجرم کی حفاظت کے لیے قریبی تھانے سے اور نفری بھوادیں گے۔ اُن کا خیال تھا کہ مجرم کا تعلق چونکہ اسی علاقے سے ہے اس لیے اُس کے خلاف گواہیاں اور ثبوت وغیرہ ڈھونڈنے میں آسانی رہے گی۔

میں نے ایس پی صاحب کی ہدایت پر عمل کیا۔ دوار کا سے پوچھ گچھ کا آغاز ہوا۔ دوار کا کی عمر کوئی اٹھائیس سال تھی عمر کے مقابلے میں وہ صحت مند اور جوان نظر آتا تھا۔ چہرے سے سخت گیری نمایاں تھی۔ اس کی ڈاڑھی نہایت گھنی تھی اور رخسار بھی بالوں میں چھپے ہوئے تھے۔ مفروضہ ڈاکوؤں جیسی اکڑفوں اس میں بھی تھی۔ یہ اکڑفوں مار پیٹ کے باوجود بھی برقرار رہی۔

دوار کا سنگھ کا منصوبہ اب پوری طرح کھل چکا تھا۔ وہ میلے کے پانچویں روز ہی گاؤں میں پہنچ گیا تھا۔ ظاہر ہے اس کا ارادہ موہنی کا اغوا کرنے کا تھا۔ اُس اغوا کا پروگرام اس نے بڑی ہوشیاری سے بنایا تھا۔ اُسے شک تھا کہ تھیٹر کے اندر چوہدری کے آدمی موہنی کی حفاظت کے لیے موجود ہوں گے اُن کی موجودگی میں اغوا کی یہ کوشش ناکام ہو سکتی تھی۔ لہذا اُن کی توجہ ہٹانے کے لیے اس نے عین موقع پر موت کے کنوئیں میں آگ لگوا دی۔ جب بھگدڑ مچی تو وہ اپنے باقی ساتھیوں کے ساتھ موہنی کو لے اڑا۔ بعد کے واقعات آپ جانتے ہی ہیں۔

میری پہلی گولی دوار کا سنگھ کا ٹخنہ توڑتی ہوئی نکل گئی تھی۔ زخم گہرا تھا لیکن تیزی سے ٹھیک ہو رہا تھا۔ گاؤں کا ڈاکٹر حوالات میں ہی آکر اس کی پٹی کر جاتا تھا۔ دوار کا سنگھ کو اس زخم کی بالکل پرواہ نہیں تھی۔ ڈاکٹر پٹی کرنے آتا تو وہ اسے گالیاں دیتا۔ زبردستی پٹی بھی کر دی جاتی تو تھوڑی ہی دیر بعد اسے کھول کر پھینک دیتا۔ تھانے کے عملے میں سے بھی وہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتا تھا۔ اُن کے منہ پر انہیں ماں بہن کی گالیاں دیتا تھا اور مار کھا کر بھی باز نہیں آتا تھا۔

ایک روز حوالدار دیوی لال اسے بری طرح پیٹ رہا تھا کہ موہنی تھانے میں داخل

فیصد درست تھی۔

حوالات کا پہریدار پریم چند منہ لٹکائے ایک طرف بیٹھا تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ ساری رات کھڑا ہو کر پہرہ دیتا رہا ہے۔ صبح چار بجے کے قریب وہ چند منٹ کے لیے پیشاب کرنے چھٹ پر گیا۔ واپس آیا تو تالا کھلا ہوا تھا اور دوار کا غائب تھا..... دوار کا غائب ہونا ایک نہایت سنگین خبر تھی۔ چند لمحوں کے لیے مجھے یوں لگا جیسے کمر ٹوٹ گئی ہے۔ میں نے اسی وقت تھانے کے پورے عمل کو اپنے سامنے حاضر کر لیا۔ رات کو ایک اے ایس آئی کی ڈیوٹی ہوتی تھی۔ وہ مجھ سے بھی زیادہ گھبرایا ہوا تھا۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ ”چار ساڑھے چار کے درمیان وہ کہاں تھا؟“ اُس نے کہا۔

”نواز صاحب! میں اپنے کمرے میں تھا۔ گرمی زیادہ تھی اس لیے کھڑکیاں کھول رکھی تھیں۔ دونوں کانشیل بھی باہر برآمدے میں بیٹھے تھے۔ سنتری گیٹ پر تھا۔ سمجھ نہیں آتی یہ سب کچھ ہوا کیسے ہے؟“

میں نے پوچھا۔ ”تھانے میں کوئی باہر کا آدمی تو موجود نہیں تھا؟“
اُس نے کہا۔ ”نہیں۔“ لیکن پھر فوراً چونک کر بولا۔ ”ہاں یاد آیا۔ تھوڑی دیر پہلے ایک شخص آیا تھا۔ جیون پور کا کوئی کاشکار تھا۔ کہتا تھا مخالف پارٹی مجھے قتل کی دھمکیاں دے رہی ہے۔ میری حفاظت کی جائے..... میں نے اُسے ٹر خا دیا..... وہ شخص مجھے کچھ مشکوک سا لگا۔ لگتا تھا کسی چکر میں ہے۔“

میں نے سنتری سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ ”اُس نے مذکورہ شخص کو اے ایس آئی کے کمرے سے نکل کر گیٹ سے باہر جاتے دیکھا تھا۔ اُس نے گرمی میں بھی چادر کی بکل مار رکھی تھی۔“

اے ایس آئی کا کمرہ گیٹ سے نظر نہیں آتا تھا اس لیے مجھے شک ہوا کہ سنتری اپنی غفلت پر پردہ ڈال رہا ہے۔ بہر حال ابھی کچھ یقین سے نہیں کہا جاسکتا تھا۔ عین ممکن تھا کہ یہ حوالات کے پہریدار اور گیٹ کیپر کی کوئی ملی بھگت ہو۔ پیسہ بڑوں بڑوں کا ایمان خراب کر دیتا ہے، یہ لوگ تو پھر سو پچاس کے ملازم تھے۔

سب سے اہم بات یہ تھی کہ حوالات کے تالے کو توڑا نہیں گیا تھا بلکہ چابی سے کھولا گیا تھا۔ جیسا کہ پہریدار نے بتایا وہ صرف تین منٹ کے لیے چھٹ پر گیا تھا۔ اس مختصر وقفے میں ایک مضبوط تالے کو اس کی صحیح چابی لگا کر کھولنا اور فرار ہونا سمجھ میں نہیں آتا تھا..... اچانک میرا دھیان مبارک علی کی طرف چلا گیا۔ میں نے اے ایس آئی سے پوچھا۔ ”مبارک علی کہاں

سے پیٹ رہا تھا۔ مبارک علی اس سے جھگڑ پڑا۔ اس نے کہا کہ ملزم بے ہوش ہو گیا ہے اس لیے اسے ”ٹارچر“ دینے کا کوئی فائدہ نہیں۔ دیوی لال نے کہا کہ بے ہوش نہیں ہوا، فریب کر رہا ہے۔ مکر کئے پڑا ہے اتفاقاً اس دن موہنی بھی آئی ہوئی تھی۔ اس نے دیوی لال کی حمایت کی تو مبارک علی اُس پر اُلٹ پڑا۔ غرا کر بولا۔

”تو یہاں آم لینے آئی ہے۔ بھاگ یہاں سے۔ یہ مر گیا تو تیرا باپ بھرے گا اسے۔“
موہنی بھی کم نہیں تھی۔ اس نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

جھگڑے کی آواز سن کر میں حوالات میں پہنچا تو موہنی اور مبارک علی دونوں لال بھبھو کے ہو رہے تھے۔ میں نے بمشکل دونوں کو رام کیا اور مبارک علی کو ڈانٹ ڈپٹ کر باہر بھیج دیا۔

☆=====☆=====☆

آٹھ دس روز مزید گزر گئے۔ مختلف کیسوں کے سلسلے میں دوار کا سنگھ سے پوچھ گچھ جاری رہی۔ بعض مجبوریوں کے تحت ابھی تک ہم نے دوار کا کی گرفتاری کا غدو میں نہیں دکھائی تھی۔

یہ تمام تفتیش بھی ریمانڈ وغیرہ کے بغیر ہی ہو رہی تھی۔ مگر اب اس معاملے کو مزید لٹکایا نہیں جاسکتا تھا۔ ملزم کو عدالت میں پیش کرنا ضروری تھا۔ ان آٹھ دس دنوں میں صرف ایک اہم واقعہ ہوا۔ دوار کا کا وہ ساتھی جو میلے والے واقعے میں زخمی ہوا تھا امرتسر ہسپتال میں چل بسا۔

ایک دوسرا واقعہ بھی پیش آیا جو اس کیس میں زیادہ اہم نہیں تھا لیکن اُس کا ذکر ضروری ہے۔ موت کے کنویں میں بھڑکنے والی آگ ارد گرد کے شامیانوں تک بھی پھیل گئی تھی۔ لوگوں کا کافی نقصان ہوا۔ اسی افراتفری میں سرکس کے چڑیا گھر سے ہاتھی کا ایک کم سن بچہ غائب ہو گیا۔ سرکس والوں نے اس چوری کا الزام اپنے کاروباری رقیبوں پر لگایا۔ یوں راتوں رات دونوں پارٹیوں میں زبردست تصادم ہوا۔ پورا میلہ اجڑ کر رہ گیا اور کئی افراد زخمی ہوئے۔

اب میں اس واقعے کی طرف آتا ہوں جو دوار کا کی گرفتاری کے بیس پچیس روز بعد پیش آیا۔ میں تھانے ہی کے ایک حصے میں رہائش پذیر تھا۔ صبح سویرے حوالدار دیوی لال نے میرا دروازہ کھٹکھٹایا اور یہ پریشان کن خبر دی کہ دوار کا حوالات سے غائب ہے۔ میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی کپڑے بدل کر دیوی لال کے ساتھ بھاگ بھاگ حوالات میں پہنچا۔ خبر سو

”ہے؟“

وہ بولا۔ ”میں نے اسے پچھلے پیر گشت پر بھیجا تھا..... بس اب آنے ہی والا ہوگا۔“

مجھے یاد آیا کہ مبارک علی کے دل میں ملزم کے لیے ایک نرم گوشہ موجود تھا۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ یہ کام مبارک علی کا ہو۔ یا اس کی ملی بھگت سے کیا گیا ہو..... تھوڑی ہی دیر میں مبارک علی اور ایک کانسٹیبل گھوڑوں پر سوار پہنچ گئے۔ میں نے مبارک علی سے پوچھ گچھ شروع کی تو وہ کچھ گھبرا گیا۔ اُس کا صفائی پیش کرنے کا انداز ایسا تھا کہ مجھے شک ہونے لگا۔ میں نے سوچا کہ مجھے اپنی تمام تر توجہ مبارک علی پر مرکوز کر دینی چاہیے۔ میں اُسے لے کر ایک علیحدہ کمرے میں چلا گیا۔

☆=====☆=====☆

اگلے چند روز میرے لیے انتہائی پریشان کن اور اذیت ناک تھے۔ میرے دونوں کندھوں پر جیسے کسی نے دو پہاڑ رکھ دیئے تھے۔ میری حراست سے دوار کا سنگھ کا فرار ہونا کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا۔ میری ساری عزت خاک میں مل رہی تھی۔ وہی ڈی ایس پی اور ایس پی صاحبان جو دو ہفتے پہلے میری تعریفوں کے بل باندھ رہے تھے اور شاباش دیتے نہیں تھکتے تھے اب افسری کا ڈنڈا لے کر میرے پیچھے پڑے ہوئے تھے۔ کیسے فرار ہوا؟ کیوں فرار ہوا؟ کیسے پکڑا جائے گا؟ کب پکڑا جائے گا؟ ہر گھڑی یہ سوال تیروں کی طرح میرا دل چھید رہے تھے اور ایک لحاظ سے افسروں کا رویہ ٹھیک بھی تھا۔ دوار کا سنگھ جیسے مجرم قسمت سے ہاتھ آتے ہیں اور اُن کا ہاتھ میں آکر نکل جانا بد قسمتی ہوتا ہے بلکہ بہت سی بد قسمتیوں کا آغاز بھی ہوتا ہے۔ جیسے چیتا شکاری کے وار سے جانبر ہو کر اور خطرناک ہو جاتا ہے ایسے ہی ”ڈاکو حضرات“ جیل توڑ کر اور نڈر ہو جاتے ہیں۔

اُن دنوں مجھے کھانے پینے کا ہوش تھا نہ آرام کا۔ ارد گرد کے دیہات میں دن رات دوار کا کو ڈھونڈ رہا تھا۔ جہاں کسی مخبر نے تھوڑا سا بھی سراغ بتایا گھوڑی پکڑی اور پہنچ گیا۔ اپنے تھانے میں سے میرا شک دو افراد پر تھا یعنی حوالات کا پہریدار اور حوالدار مبارک علی۔ تیسرا شخص جیون پور گاؤں کا تھا۔ یہ وہی شخص تھا جو وقوعہ سے کچھ دیر پہلے ”سائل“ بن کر تھانے آیا تھا۔

ایک روز رات کو دیر تک نیند نہ آئی میں نہا دھو کر صبح سویرے تھانے پہنچ گیا۔ ڈیوٹی تبدیل ہو چکی تھی مگر صبح والا اعلان ابھی حاضر باش نہیں ہوا تھا۔ میں یونہی کمرے میں بیٹھ کر دوار کا کے بارے سوچ کے گھوڑے دوڑانے لگا۔ اچانک ایک مخبر بھاگتا ہوا اندر داخل

ہوا۔ اُس نے مجھے بتایا کہ چوہدری شاہ مراد کے کھیتوں میں ایک آدمی پڑا سو رہا ہے۔ چلے سے شک ہوتا ہے کہ وہ دوار کا کے ساتھیوں میں سے ہے۔ دوار کا کا ساتھی اور ہمارے گاؤں میں؟ ذہن نہیں مان رہا تھا مگر ملزم کی تلاش میں مارا مارا پھرنے پر ایک ایسا وقت بھی آتا ہے جب وہ معمولی معمولی شک پر بھی کارروائی کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ میرا حال بھی کچھ ایسا ہی ہو رہا تھا۔ میں نے اسی وقت سروس ریوالور لیا اور مخبر کے ساتھ چل پڑا۔

گاؤں سے نکل کر ہم کھیتوں میں پہنچے۔ سورج ابھی طلوع نہیں ہوا تھا۔ ہلکے سے کہرے اور تاریکی نے کھیتوں کے رنگ مدھم کر رکھے تھے۔ ہم گیلڈنڈیوں پر چلتے اس جگہ پہنچ گئے جہاں چند ہفتے پہلے ایک شاندار میلہ شروع ہوا تھا۔ اب یہ جگہ ویران پڑی تھی۔ کہیں کہیں بھینوں کی کچی انٹیں بکھری ہوئی تھیں اور مٹی کے ٹوٹے پھوٹے چبوترے نظر آرہے تھے۔ ایک جانب کوئلے اور لکڑی کے ادھ جلتے شہتیروں کا بہت بڑا ڈھیر تھا۔ زمین سے اُس کی اونچائی قریباً پندرہ فٹ تھی۔

یہی وہ موت کا کنواں تھا جس میں چند ہفتے پہلے موٹر سائیکلس چلتی تھیں اور لوگ جس کے چبوترے پر کھڑے ہو کر تالیاں بجاتے تھے۔ اب وہاں کچھ نہیں تھا..... صرف ایک شخص کے پاؤں نظر آرہے تھے۔ یہ شخص دو شہتیروں پر بن جانے والے قدرتی سائبان کے نیچے سویا پڑا تھا۔ غالباً وہ کہیں سے بہت تھکا ہوا آیا تھا اور اس جگہ کو محفوظ جان کر لیٹ گیا تھا۔ اجالا ہونے کے باوجود ابھی یہ نیند ٹوٹی نہیں تھی۔

میں لمبے کے اندر احتیاط سے قدم رکھتا ہوا چند گز آگے گیا اور اُس شخص کے سر ہانے کھڑا ہو کر غور سے اسے دیکھنے لگا۔ وہ شکل سے معمولی چوراچکا لگتا تھا..... اچانک مجھے ایک غراہٹ سی سنائی دی۔ یوں لگا جیسے سوئے ہوئے شخص کے حلق سے نکلی ہے لیکن نہیں..... یہ کچھ اندر سے آرہی تھی۔ لمبے کی گہری تاریکی میں ضرور کچھ تھا میرا ہاتھ خود بخود ریوالور تک پہنچا لیکن اس سے پہلے کہ میں اسے ہولسٹر سے کھینچتا، یکا یک تیز آہٹیں سنائی دیں اور پھر خونخوار شکلوں والے دو قد آدم کتے مجھ پر بچھنے۔ یہ حملہ اتنا اچانک تھا کہ میں پشت کے بل ادھ جلی لکڑیوں پر گرا۔ کتوں نے چند لمحوں میں مجھے بھنبھوڑ کر رکھ دیا۔ میں نے ایک کتے کے سر کا نشانہ لیا اور بے دریغ گولی چلا دی۔ بلڈاگ کے منہ سے ایک ناقابل فہم آواز نکلی اور وہ بل کھا کر ایک طرف لڑھک گیا۔ لکڑی کی ضرب کھانے والا کتاب سنبھل کر تیار ہو رہا تھا۔ میں نے یکے بعد دیگرے تین گولیاں اُس کے جسم میں بھی اتار دیں اور نیم جان ہو کر زمین

پر لیٹ گیا۔

پشت کے بل گرنے سے میرے سر کے پچھلے حصے میں شدید چوٹ آئی تھی۔ ناگوں اور پیٹ پر بھی پنچوں کے زخم تھے۔ قیص تار تار ہو چکی تھی میں نے لیٹے لیٹے اسے کھینچ کر پھینک دیا۔ دور کھیتوں کی طرف سے لالچی بردار دیہاتی بھاگے آرہے تھے۔ غالباً انہوں نے فائرنگ کی آواز سن لی تھی۔ (بعد میں پتہ چلا کہ یہ ملک میرا بھگواڑا بھولے کر آیا تھا) یہ سب لوگ میرے گرد اکٹھے ہو گئے۔ میں اب اٹھ کر ککڑیوں کے سہارے بیٹھ چکا تھا لوگ کبھی میری طرف اور کبھی مردہ کتوں کی طرف دیکھ رہے تھے۔ یکا یک مجھے میں میری نگاہ موہنی پر پڑی۔ وہ بڑی عجیب نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں حیرت اور بے یقینی یکجا ہو گئی تھی۔ اس کی نگاہ میرے سینے پر تھی۔ دفعتاً ساری بات میری سمجھ میں آ گئی اور اُس کے ساتھ ہی جسم میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی۔ میرے جسم پر قیص نہیں تھی اور گولی کا پرانا نشان نمایاں تھا۔ وہی نشان جو موہنی اُس سے پہلے بھی ایک بار دیکھ چکی تھی..... چوہدری شاہ مراد کے فارم میں پیش آنے والا واقعہ اب موہنی کے لیے راز نہیں رہا تھا۔

کچھ ہی دیر بعد موہنی کا چہرہ میری نگاہوں سے اوجھل ہو گیا اور دوسرے لوگ میرے ارد گرد جمع ہو گئے۔ اُن کی مزاج بُری میری تکلیف کو کم نہیں کر رہی تھی لیکن اُس سے ایک طرح کا اطمینان ضرور محسوس ہو رہا تھا وہی اطمینان جو محبت کرنے والے لوگوں کی موجودگی سے محسوس ہوتا ہے۔

جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا کتوں والا نامعلوم شخص ایک قریبی گاؤں ”سکھیا“ کا سانی تھا۔ وہاں مار پیٹ کی ایک واردات کے بعد وہ یہاں بھاگ آیا تھا۔ اس کا دوار کا سنگھ یا اس کے گروہ سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ نہ ہی وہ جرائم پیشہ تھا۔ اس کا اتنا قصور ضرور تھا کہ وہ دو نہایت خطرناک کتوں کو آزاد لیے پھر رہا تھا۔ اور اس قصور کی اسے قرار واقعی سزا بھی مل گئی تھی۔ وہ دونوں کتوں سے محروم ہو گیا تھا۔ اُسے میرے آدمیوں نے ایک قریبی شمشان گھاٹ سے گرفتار کر لیا اور تھانے لے آئے۔ اُس پر کیس بن سکتا تھا لیکن میں نے پوچھ گچھ کے بعد اُسے معاف کر دیا۔

میرے جسم کے کئی حصے بیٹوں میں جکڑے ہوئے تھے۔ بہر حال میں چلنے پھرنے کے قابل تھا اور کوئی زخم بھی ایسا نہیں تھا کہ مجھے بستر پر لیٹنا پڑتا۔

وہ ایک بڑی سہانی رات تھی۔ آٹھ پہر کی مسلسل بارش کے بعد مطلع صاف تھا اور موسم

خوشگوار، ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ کئی ہفتوں کی سخت گرمی کے بعد موسم کی یہ کروٹ اچھی لگ رہی تھی۔ میں نے درد کم کرنے کے لیے اسپرین کی دو گولیاں نگلیں اور کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر نیم دراز ہو گیا۔

اُس وقت آہٹ ہوئی اور سنتری نے آکر اطلاع دی کہ بی بی موہنی آپ سے ملنا چاہتی ہے۔ میں موہنی کی اس وقت کی آمد پر حیران ہوا۔ تاہم میں نے اُسے اندر بلا لیا۔ وہ ویل کی کڑھائی دار قیص اور شلوار میں ملبوس تھی۔ جوڑے میں موہنی کے پھول لگائے ہوئے تھے۔ لگتا تھا کہیں جانے کے لیے تیار ہو کر آئی ہے۔ اس نے میری طرف عجیب نظروں سے دیکھا پھر بولی۔ ”صیب جی! آپ کو مجھ سے چھپانے کی کیا ضرورت تھی..... آپ نے نیکی کا کام کیا تھا کوئی برائی تو نہیں کی تھی۔“

میں نے سوالیہ نظروں سے اُس کی طرف دیکھا۔ اُس نے میرا دیا ہوا گرہ چادر کی اوٹ سے نکالا اور میری میز پر رکھ دیا۔ ”بہت بہت شکریہ جی۔“ اس نے عجیب معصومیت سے کہا۔ اُس فقرے میں وہ سارے جذبے موجود تھے جو اپنی عزت بچانے والے کے لیے ایک لڑکی کے دل میں موجود ہو سکتے ہیں۔ احسان مندی اور شکریے کے اظہار کے لیے وہ گھنٹوں بھی بولتی رہتی تو مجھے اس ایک فقرے سے زیادہ متاثر نہ کر سکتی۔

میں نے اخلاقیات کہا۔ ”موہنی۔ اس میں شکریے والی کون سی بات ہے۔ میں سرکار کی طرف سے محافظ بنایا گیا ہوں تم لوگوں کا۔“

اُس نے جیسے میری بات سنی ہی نہیں تھی۔ کھوئے ہوئے سے لہجے میں بولی۔

”تھانیدار صیب! دوار کا سنگھ کو پکڑو گے؟“

موہنی کے اس ڈرامائی جملے نے مجھے ششدر کر دیا۔ میں نے بے پناہ حیرت سے کہا۔

”کیا کہہ رہی ہو موہنی؟ دوار کا سنگھ کے بارے میں تجھے کیا پتہ؟“

وہ بولی۔ ”صیب جی! میں سب کچھ بتا دوں گی۔ اس وقت جلدی کرو۔ اگر اسے پکڑنا ہے تو میرے ساتھ آؤ۔“

مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہی تھی اور نہ ہی موہنی کچھ بتانا چاہتی تھی۔ مجھے اس کی ذہنی حالت پر شک ہو رہا تھا مگر اس کے ساتھ جانے کے سوا چارہ بھی نہیں تھا۔ میں نے دو ہیڈ کانسٹیبل ساتھ لیے اور موہنی کے ساتھ روانہ ہو گیا۔ میں نے پوچھا۔ ”کہاں جانا ہے؟“

وہ بولی۔ ”نزدیک ہی۔“ وہ ہمیں گاؤں سے باہر لے گئی اور پگڈنڈیوں پر چلتی کوئی چار پانچ فرلانگ آگے آ گئی۔ میرے بار بار پوچھنے پر اس نے بتایا کہ دوار کا سنگھ آج

فردوسی کے مزار کے پچھواڑے نیلے میں کسی سے ملنے آئے گا۔ اُس کی یہ بات مجھے بری طرح چونکا گئی۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ دوار کا سنگھ موہنی سے ملنے آ رہا ہو؟ اس سے پہلے کہ میں کسی نتیجے پر پہنچتا ہوں فردوسی کے مزار پر پہنچ چکے تھے مزار کے پیچھے درختوں کے گھنے جھنڈ تھے۔

موہنی نے مجھے کہا کہ میں اپنے آدمیوں کو مزار کے پاس ہی چھپا دوں۔ میں نے اس کی ہدایت پر عمل کیا۔ وہ مجھے ساتھ لے کر گھنے درختوں میں گھس گئی۔ چاروں طرف ہوکا عالم طاری تھا بس کبھی کبھار ہوا شاخوں سے اٹھکیلیاں کر جاتی تھی۔ موہنی اب بڑی احتیاط سے دیے پاؤں آگے بڑھ رہی تھی۔ اس نے شلوار دونوں طرف سے چٹکیوں میں پکڑ کر اوپر اٹھا رکھی تھی۔ اس کی سفید ننگی پنڈلیاں مدھم چاندنی میں چمک رہی تھیں۔ موہنی کا محتاط انداز دیکھتے ہوئے میرا دل بھی ریو الوور کا لٹنے کو چاہ رہا تھا۔

ایک ایک موہنی ٹھنک گئی۔ میں نے اس کے عقب سے اُس کی نظر کا تعاقب کیا اور دل اچھل کر بے قابو ہو گیا۔ چند گز آگے لیکر کے درختوں تلے ایک سانڈنی کھڑی تھی۔ اُس کے پاس ہی ایک لمبا ترنگا شخص درخت سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ اس کے ڈیل ڈول سے میں پہچان گیا۔ وہ دوار کا سنگھ ہی تھا۔ موہنی نے مڑ کر معنی خیر نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے اثبات میں سر ہلایا اور بڑی احتیاط سے درختوں کا چکر کاٹ کر دوار کا سنگھ کے پہلو میں پہنچ گیا۔

وہ اپنے حال میں مست تھا اور کوئی دو ہانگنٹا رہا تھا۔ اُس کا ہتھیرا ایک دیسی بندوق تھی جو درخت کی جڑ میں پڑی ہوئی تھی۔ میں جانتا تھا دوار کا کے بندوق سنبھالتے سنبھالتے میرا ریو الوور اس کی کپٹی پر پہنچ جائے گا اور پھر میں نے ایسا ہی کیا۔ لپک کر میں دوار کا کے سامنے آیا۔ اُس نے حیرت سے مجھے دیکھا۔ پھر بے اختیار اپنی بندوق کی طرف بڑھا۔ میں نے ایک قدم بڑھا کر اس کی بندوق کو ٹھوکر ماری وہ برساتی پانی کے ایک چھوٹے سے گڑھے میں جاگری۔ دوار کا شپٹا کر میری طرف مڑا تو 38 بور ریو الوور کی نال اس کی پیشانی کی طرف اٹھی ہوئی تھی۔ وہ ناچ کر رہ گیا۔ ”بس دوار کا سنگھ۔“ میں نے بے رحم لہجے میں کہا۔ ”آگے بڑھے تو کھوپڑی اڑا دوں گا۔“

وہ میرے بازو پہلے بھی آزما چکا تھا۔ جب میں نے میلے میں اسے گھوڑے سے اٹھا کر زمین پر پٹخ دیا تھا میرے ریو الوور کی گولی بھی اس نے کھائی ہوئی تھی لہذا وہ اپنی جگہ بت بنا رہ گیا۔ پھر اُس کی نگاہ درختوں کی طرف اٹھی اور جیسے جم کر رہ گئی۔ میں نے سر گھمائے بغیر نظر

پھیری۔ دوار کا کی نگاہوں کا مرکز موہنی تھی۔ وہ بھی ایک تک دوار کا کو دیکھ رہی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو مدھم چاندنی میں قیمتی موتیوں کی طرح چمک رہے تھے۔

میں اب اتنا بھی انجان نہیں تھا۔ میں ان آنسوؤں کا مطلب سمجھ رہا تھا۔ بلکہ پوری صورت حال میری نظروں کے سامنے تھی۔ میں سوچ رہا تھا یہ عورت بھی کیا چیز ہے۔ اس کے دل کی گہرائی کوئی نہیں جان سکا اور شاید کبھی نہ جان سکے۔ وہ کیا سوچتی ہے اور کس طرح سوچتی ہے، صرف اسی کو معلوم ہوتا ہے ضروری نہیں کہ وہ جس سے نفرت کرتی ہو، جس کے خون کی پیاسی ہو، اس کے لیے دل میں بھی ایسے ہی جذبات رکھتی ہو۔ یا جس کے ساتھ ہنستی بولتی ہو جس سے محبت جتاتی ہو اور جسے زندگی کا ساتھی بنانے پر آمادہ ہو جائے اس سے واقعی محبت کرتی ہو..... ہم سب کا خیال تھا کہ موہنی دوار کا سے شدید نفرت کرتی ہے اور اُس کا تماشا دیکھنے کے لیے تھانے آتی ہے..... اور شاید شروع میں وہ اسی لیے آئی تھی..... لیکن کب اور کس گھڑی اس کے دل کا موسم بدل گیا تھا، ہمیں ہرگز معلوم نہیں ہوا تھا۔ وہ اپنے عاشق سے محبت کرنے لگی تھی۔ خود بھی اس کے رنگ میں رنگی گئی تھی۔ نفرت کے بیج سے محبت کا پودا پھوٹ نکلا تھا۔ بقول شاعر:-

دل کی بستی عجیب بستی ہے
لُونے والے کو ترستی ہے

اب یہ بات بھی یقینی تھی کہ دوار کا کو حوالات سے بھگانے والی موہنی ہی تھی۔ جیسا کہ بعد کی تفتیش سے پتہ چلا اس روز علی الصبح موہنی کھیتوں میں جانے کے لیے نکلی تھی۔ تھانے کے قریب سے گزرتے ہوئے اُس نے ایک کھڑکی سے اندر جھانک کر دیکھا۔ حوالات کا پہریدار ستون سے ٹیک لگائے خراٹے لے رہا تھا۔

وہ کئی دنوں سے ایسے ہی موقع کی تلاش میں تھی۔ وہ چکر کاٹ کر تھانے کی عقبی چار دیواری سے اندر داخل ہوئی اور اے ایس آئی کی نگاہ بچاتی ہوئی حوالات کی طرف چلی گئی۔ پہریدار سے اس کی تھوڑی سی بے تکلفی بھی تھی۔ اس بے تکلفی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اُس نے اُس کی جیب میں ہاتھ ڈال دیا۔ تالے کی چابی اسی جیب میں موجود تھی۔ سوئے ہوئے پہریدار کو پتہ بھی نہ چلا اور موہنی نے چابی نکال کر بے آواز تالا کھول دیا۔ وہ موہنی جیسے صرف شوخیاً کرنا آتی تھیں اور جس کی باتوں پر سارا تھانہ ہنستا تھا جب محبت میں گرفتار ہو کر سنجیدہ ہوئی تو کتنا خطرناک کام کر گزری۔

اس نے چند ہی لمحوں میں دوار کا سنگھ جیسے خطرناک مجرم کو قانون کی گرفت سے نکال کر

آزاد فضا میں پہنچا دیا لیکن بات پھر وہیں آتی ہے۔ عورت کا دل ایک گورکھ دھندا ہے کب کیا ہو جائے؟ کسی کو کیا معلوم۔ اس موہنی نے آج دوار کا سنگھ کو گرفتار کر دیا تھا۔ کیوں؟ اس کا جواب مجھے اچھی طرح معلوم تھا۔ اُس کے دل کا موسم آج ایک بار پھر بدل گیا تھا۔ آج اُس کے دل میں میرے نام کی ہوا چل رہی تھی۔ میں، جس نے اس کی عزت بچائی تھی اور کبھی اس پر احسان نہیں جتایا تھا۔ وہ احسان کے اس بوجھ تلے دبی جا رہی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ میری پریشانیوں کی اصل وجہ کیا ہے؟ اور یہ ”وجہ“ اسی کی پیدا کی ہوئی تھی۔ آج اس نے اپنے محبوب کو گرفتار کر کے میری پریشانیاں ختم کر دی تھیں اور وہ احسان اتار دیا تھا جو زندگی بھر کے لیے اس کے ضمیر کو بے قرار رکھ سکتا تھا۔

میں دیر تک موہنی اور دوار کا سنگھ کو دیکھتا رہا۔ موہنی آنسو بہا رہی تھی اور دوار کا ہارے ہوئے جواہری کی طرح خاموش کھڑا تھا۔ شاید دل ہی دل میں موہنی سے شکوے کر رہا تھا اُن دونوں کے درمیان اب جدائی کی ابدی دیوار حائل ہونے والی تھی۔ اب اُن کے بچھڑے ہوئے ہاتھوں کو کبھی نہیں ملنا تھا۔ اب اُن کے ترے ہوئے جسموں کو ہمیشہ ایک دوسرے سے دور رہنا تھا۔ محبت کا تیز رفتار سفر ”گرفتاری“ کے اس موڑ پر اچانک ختم ہو گیا تھا۔ موہنی کی بچکیاں لیتی ہوئی آواز فضا میں ابھری۔ ”صیب جی! اپنے مجرم کو گرفتار کر لو پر میری ”کھاتر“ اسے جیادہ مارنا نہ۔ یہ خود نہیں بھاگا تھا اسے..... اسے میں نے بھاگایا تھا۔ اس کے بھاگنے کی سزا مجھے ملنی چاہیے۔“

میں اُن دونوں کو دیکھ رہا تھا اور ذہن تیزی سے کسی فیصلے پر پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اُس گھڑی سب کچھ میرے بس میں تھا۔ میں دوار کا سنگھ کو گرفتار بھی کر سکتا تھا، اسے چھوڑ بھی سکتا تھا اور اسی جگہ گولی بھی مار سکتا تھا۔

نہ جانے کیوں میرا ذہن کہہ رہا تھا کہ دوار کا سنگھ بہت بدل چکا ہے اور اگر اُسے موہنی مل جائے تو اس کی زندگی کا رخ تبدیل ہو سکتا ہے اور اس کا ایک ثبوت یہ بھی تھا کہ پچھلے چھ مہینوں سے اس نے کوئی واردات نہیں کی تھی اور پچھلے دو سالوں سے اس کا نام بہت کم سنا گیا تھا۔ لیکن اگر میں اسے چھوڑ دیتا تو یہ قانون اور انصاف سے بہت زیادتی ہوتی۔ دوسری طرف موہنی کی بچکیاں میرا دل ہلا رہی تھیں۔

ایک لمحے کے لیے میں نے سوچا۔ کاش میں قانون کا محافظ نہ ہوتا۔ ایک عام شخص ہوتا اور دوار کا سنگھ سے نیک چلتی کا وعدہ لے کر اُسے آزاد کر دیتا۔ اس سے کہتا۔ ”موہنی کو لے جاؤ اور اپنی اس سائنڈنی پر بیٹھ کر جرم اور سزا کی دنیا سے بہت دور نکل جاؤ۔“ مگر یہ سب

سمجھ کرنا میرے بس میں نہیں تھا۔ میں نے دو ہوائی فائر کیے چند ہی لمحوں میں رائفل بردار کانشیل بھاگتے ہوئے موقع پر پہنچ گئے۔ انہوں نے دوار کا سنگھ کو ہتھکڑیاں لگا دیں۔ موہنی نے الوداعی نظروں سے اُس کی طرف دیکھا اور بچکیاں لیتی ہوئی گاؤں کی طرف بھاگ گئی۔ کوئی ایک مہینہ بعد کی بات ہے دوار کا سنگھ جیل میں پہنچ چکا تھا۔ اُس کا چالان مکمل ہو کر سیشن میں چلا گیا تھا اور کیس کی سماعت شروع ہونے والی تھی۔

ایک روز میں شام کے وقت کھیتوں سے گزرتا ہوا فردوسی کے مزار کی طرف گیا۔ مزار کے پچھواڑے گھنے درختوں میں اچانک مجھے ایک زرد لباس کی جھلک نظر آئی۔ میں نے آگے جا کر دیکھا وہ موہنی تھی۔ ایک کیکر سے ٹیک لگائے وہ خاموش کھڑی تھی۔ اُس کی نظریں شہر کی طرف تھیں جیسے دور کسی کا راستہ دیکھ رہی ہو۔ میں اس کا چہرہ دیکھ کر حیران ہو گیا۔ وہ بہت ہی کمزور نظر آرہی تھی۔ چہرہ لباس ہی کی طرح زرد ہو رہا تھا اور شوخ آنکھوں میں ویرانیوں نے ڈیرے ڈال رکھے تھے۔ مجھے دیکھ کر وہ بُری طرح چونکی۔ پھر رخ موڑ کر تیز قدموں سے گاؤں کی طرف چل دی۔

”موہنی۔“ میں نے تحکمانہ لہجے میں آواز دے کر اُسے ردکا۔ وہ ذرا سہم کر رک گئی۔ میں اُس کے سامنے پہنچا تو وہ اُلٹے ہاتھ سے اپنے آنسو پونچھ رہی تھی۔ میں نے کہا۔ ”موہنی مجھے معلوم ہے تجھے دوار کا کی گرفتاری کا دکھ ہے۔ شاید تُو مجھ سے بھی ناراض ہے لیکن میں تیرے لیے اتنا برا ثابت نہیں ہوا جتنا تُو سمجھتی ہے۔ دوار کا ایک ڈکیت تھا پھر بھی میں نے اُس کے لیے وہ سب کچھ کیا ہے جو کر سکتا تھا۔“

موہنی نے پلکیں اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ میں نے کہا۔ ”ہاں موہنی..... میں نے اپنی طرف سے پوری کوشش کی ہے۔ مجھے امید ہے دوار کا کو پھانسی نہیں ہوگی اور اگر اسے اچھے وکیل مل گئے تو ہو سکتا ہے قید بھی زیادہ نہ ہو۔ تُو آٹھ دس سال اس کا انتظار کر سکتی ہے نا..... بول کر سکتی ہے نا؟“

موہنی نے پلکیں جھکا لیں۔ دو آنسو اس کے نوخیز رخساروں پر پھسلے اور پنجاب کی شرمال والی باؤ فامٹی میں جذب ہو گئے۔ موہنی کے تاثرات نے خاموشی کی زبان میں پکار کر کہا۔

”صیب جی! میں نے اس سے پیار کیا ہے۔ میں زندگی بھر اُس کا انتظار کر سکتی ہوں۔“

میں نے پھر پوچھا۔ ”بول۔ انتظار کر سکتی ہے نا؟“

وہ معصومیت سے بولی۔ ”لیکن صیب جی! چوہدری صاحب تو کہتے ہیں وہ میری

برادری کا کوئی اچھا سا لڑکا دیکھ کر اسی سال میرا بیاہ کر دیں گے۔“

میں نے دیکھا اُس کی ناک کی خوبصورت نہتہ جیسے انجانے خوف سے لرز رہی تھی۔ یہی لرزش اُس کی رس بھری آواز میں بھی تھی۔ میٹھے گیت سنانے والی آواز آج روتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ میں نے پورے یقین اور اعتماد کے ساتھ کہا۔

”موہنی! یہ معاملہ تو مجھ پر چھوڑ دے۔ میں چوہدری مراد سے بات کر لوں گا۔ وہ کبھی تجھے شادی پر مجبور نہیں کرے گا اور جب تک تو اپنی مرضی سے بیاہ نہیں کر لیتی تجھے حویلی سے بھی نہیں نکالے گا۔۔۔۔۔“

موہنی نے نظر بھر کر میری طرف دیکھا۔ اُس کے آنسوؤں میں احسان مندی کی جھلک بھی تھی۔ شاید وہ کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن اسے الفاظ نہیں سوجھ رہے تھے۔ پھر اچانک اس نے رخ پھیرا اور کسی کم سن بچی کی طرح درختوں میں بھاگتی چلی گئی۔

☆=====☆=====☆

اُس کی گلی میں

ایک مجبور لڑکی کی داستانِ غم، حالات کے جبر نے اسے ایک ایسے شخص کی بیچ پر پہنچا دیا تھا جو اس کے ملازموں سے بھی بدتر تھا۔ وہ اس شخص کے پاؤں دبائے جیسی ذلت پر مجبور تھی۔

ملزم سے پوچھ گچھ کا ایک ہی راستہ تھا۔ اُس کا نام پوچھو نہ کام۔ بس کپڑے اتار دو اور فرش پر اوندھالنا دو۔ باقی کا کام اس دوفٹ لمبے چمڑے کے ٹکڑے کا ہے جسے لوگ چھتر کہتے ہیں۔ اُسے اذیت دینے کے ایسے ایسے طریقے آتے تھے کہ ہم جیسے پولیس والے بھی دیکھ اور سن کر دنگ رہ جاتے تھے۔ بعض ملزم تو بلراج کی شکل دیکھتے ہی جھوٹے سچے الزام اپنے سر لے لیتے تھے۔ تھا تو وہ میرا ہم پیشہ لیکن حقیقت میں وہ ایک برے پولیس والے کی تمام خصوصیات پر پورا اُترتا تھا۔ جو توڑ کا ماہر، شراب اور عورت کا رسیا اور راشی۔ میرے ساتھ اُس کے تعلقات بس واجبی سے تھے۔ مجھے وہ ”باؤ تھانیدار“ کہہ کر پکارتا تھا۔ میں جانتا تھا پیٹھ پیچھے وہ میرا مذاق اڑانے سے بھی نہیں بچتا۔

میں اپنے کمرے میں بیٹھا دیوار کی دوسری طرف ہونے والی گفتگو سن رہا تھا۔ بلراج نے ملزم کو ماں بہن کے سامنے ذلیل کرنے کی دھمکی دی تھی اور وہ چوری بتانے پر تیار ہو گیا تھا۔ مجھے ملزم کے ہانپنے کی آواز اپنے کمرے میں بھی صاف سنائی دے رہی تھی۔

”جلدی بتا۔“ (ایک نگلی گالی) بلراج کی آواز آئی۔

”بتاتا ہوں حضور مجھے ذرا پیشاب کر لینے دیں۔“

”میں کہتا ہوں پہلے بکواس کر۔“

”حضور میں..... میں..... بہت سخت آیا ہے۔“

”اوئے کرم داد۔“ بلراج کی آواز آئی۔ ”جا اسے موت کرا کے لا۔“

میں بڑے غور سے یہ گفتگو سن رہا تھا۔ ملزم کے آخری فقرے میں نہ جانے کیا بات محسوس ہوئی کہ میں چونک سا گیا۔ کچھ عجیب سا ہر سکون سا لہجہ تھا اُس کا۔ پھر میں نے اپنے کمرے کی چٹ سے دیکھا، دو سپاہی ملزم کو سہارا دے کر پیشاب خانے کی طرف لے جا رہے تھے۔ بے چارے کی حالت بڑی پتلی دکھائی دیتی تھی۔ میں فارغ بیٹھا تھا۔ یونہی ٹہلتا ہوا باہر آ گیا۔ سردیوں کے دن تھے شام ہونے والی تھی۔ تھانے کا محرر میرے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ اچانک مجھے چھت پر دھا چوڑی کی آوازیں آئیں، ابھی چند لمحوں پہلے ملزم کو پیشاب کرانے چھت پر لے جایا گیا تھا اور اب یوں لگ رہا تھا جیسے اوپر کوئی کشتی ہو رہی ہے۔

مجھے کسی خطرے کا احساس ہوا اور میں سیڑھیوں کی طرف لپکا، تھانے کی عمارت کافی پرانی تھی، چھت کوئی بیس فٹ اونچی رہی ہوگی۔ میں دو دو سیڑھیاں پھلانگتا چھت پر آیا، محرر میرے پیچھے تھا۔ جونہی چھت پر پہنچا میں نے ملزم کو پرلی جانب بھاگتے دیکھا۔ ایک سپاہی زمین پر گر رہا تھا جب کہ دوسرا ملزم کے تعاقب میں تھا۔ میں فوراً سمجھ گیا کہ ملزم کیا چاہتا ہے وہ

ساتھ والے کمرے سے چیخ و پکار کی آواز آرہی تھی۔ انسپکٹر بلراج آج پھر کسی کی کم بختی لے آیا تھا۔ نگلی پیٹھ پر چمڑے کا جوتا کھانے والا ذبح ہوتے ہوئے بکرے کی طرح چیخ رہا تھا۔

”خدا کا واسطہ تھانیدار صاحب! مجھے معاف کر دو، آپ کے بچوں کا واسطہ مجھے بخش دو..... میرا کوئی قصور نہیں۔“

بلراج نے بھاری بھر کم آواز میں ایک نہایت غلیظ گالی دی اور بولا۔ ”سیدھی طرح بک دے ورنہ میں تیرے مُردے پر بھی چھتر لگانے سے باز نہیں آؤں گا۔ بول کہاں رکھا ہے چوری کا مال؟“

ملزم کی گھگھپائی ہوئی آواز آئی۔ ”میرا رب جانتا ہے تھانیدار، میں بے قصور ہوں۔“
بلراج گرج کر کسی سپاہی سے بولا۔ ”لاؤ اس بد بخت کی ماں اور بہن کو بھی کمرے میں، وہ بھی اس کا حشر دیکھیں۔“

ملزم چیخا۔ ”خدا کا واسطہ تھانیدار صاحب یہ ظلم نہ کرو میری ماں مر جائے گی۔“

”مر جائے گی تو پھر بتاتا کیوں نہیں۔“

”اچھا بتاتا ہوں تھانیدار، بتاتا ہوں۔“

میں اپنے کمرے میں بیٹھا عموماً انسپکٹر بلراج کی قہر آلود آواز اور ملزموں کی چیخ و پکار سنتا رہتا تھا۔ یہ ایک شہری تھا نہ تھا۔ انچارج ایک ڈی ایس پی تھا۔ میرے علاوہ جو دوسرا انسپکٹر یہاں تعینات تھا وہ بلراج تھا۔ بلراج موٹی تو نہ والا اور نہایت سخت گیر چہرے والا ایک روایتی تھانیدار تھا۔ میں نے کئی بار اُس کے منہ سے نکلے ہوئے فقرے کے الفاظ گئے تھے۔ آٹھ الفاظ کا فقرہ ہوتا تھا تو یقین کریں اُس میں چار انتہائی نگلی گالیاں ہوتی تھیں۔ اُس کے نزدیک

میں ایسے ہی دعوے کیا کرتے ہیں۔ میں نے بڑھیا اور اُس کی بیٹی سے کہا کہ وہ میرے کمرے میں نہ بیٹھیں اس طرح ان کا کيس اور خراب ہو جائے گا لیکن وہ دونوں شاید مجھے ہی ”ڈی آئی جی“ سمجھتے ہوئے تھیں۔ بڑھیا نے زار و قطار روتے ہوئے بتایا کہ وہ اور اُس کی بیٹی لوگوں کے گھروں میں برتن مانجھ کر گزارا کرتی ہیں۔ یہ لڑکا مڈل پاس ہے اور آج کل نوکری کی تلاش میں ہے اُس کے بڑے بھائی علیحدہ رہتے ہیں۔ بڑھیا نے کہا۔

”میرا خاوند ایک پاؤں سے معذور ہے اور بیمار رہتا ہے۔ وکیل نے اسے بتایا تھا کہ اگر 500 روپے کا بندوبست ہو جائے تو تمہارے بیٹے کی ضمانت ہو سکتی ہے۔ میں نے بیٹی کے بیاہ کے لیے بڑی مشکلوں سے تھوڑا سا زور بنایا تھا۔ وہ بیچ کر بھی صرف 400 روپیہ اکٹھا ہو سکا۔ میرا خاوند تین روز تک مسلسل روٹی کوٹتا رہا۔ اُس کے اسے 50 روپے ملے۔ 50 روپے ایک خدا ترس سے ادھار لے کر ہم یہاں آئے لیکن پتہ چلا کہ ابھی ولایت کی ضمانت نہیں ہو سکتی۔ جو کچھ ہمارے پاس تھا، تھانیدار کو دے دیا لیکن وہ 500 روپیہ اور مانگتا ہے۔ بتاؤ بیٹا ہم اور پیسے کہاں سے لائیں۔ اب تو ہماری جانیں ہی ہیں کہیں بک سکتی ہیں تو بیچ دو۔“

بڑھیا بلک بلک کر رو رہی تھی اور دوسری طرف بلراج ایک بار پھر ولایت سے پوچھ گچھ کرنے کی تیاری کر رہا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے اُس کی ہدایت پر ولایت علی ولد محمد بونا کے خلاف حوالات سے فرار کی کوشش اور پولیس ملازمین کو زد و کوب کرنے کے الزام میں پرچہ درج ہو چکا تھا۔ حالانکہ میرے خیال میں اگر ملزم سے بہت سختی بھی کی جاتی تو اقدام خودکشی کا پرچہ درج ہونا چاہیے تھا۔ میں سب کچھ دیکھ اور سن رہا تھا لیکن جانتا تھا کہ اگر میری طرف سے اس معاملے میں مداخلت ہوئی اور بلراج آگ بگولہ ہو گیا تو جھگڑا ہو جائے گا۔

اب تک ولایت کی ماں اور بہن نے جو باتیں مجھے بتائی تھیں ان سے بظاہر یوں لگتا تھا کہ ولایت کو کسی چکر میں پھنسا دیا گیا تھا۔ ایسا چکر جس نے اسے زندگی تک سے بیزار کر دیا ہے۔ انسپکٹر بلراج یہی رٹ لگا رہا تھا کہ ملزم نے فرار ہونے کی کوشش کی ہے جب کہ ایک عام سوجھ بوجھ کا شخص بھی سمجھ سکتا تھا کہ بیس فٹ اونچی چھت سے پختہ سڑک پر گر کر ہاتھ پاؤں کا سلامت رہنا ہی بڑی بات تھی فرار ہونا تو دور کی چیز ہے۔ پھر میں نے ملزم کو خود چھت سے پکڑا تھا۔ اُس کا رویہ یقیناً ایک خودکشی کرنے والے کا تھا۔ ”مجھے مر جانے دو..... مر جانے دو۔“ اُس کے یہ الفاظ ابھی تک میرے کانوں میں گونج رہے تھے۔

عام طور پر پولیس والے خواہ مخواہ کے جھنجھٹ میں نہیں پڑتے، لیکن ولایت علی کا جھنجھٹ ایسا تھا جسے میں نے خود قبول کیا۔ ہوا یوں کہ جب ولایت علی کو پھر مار پڑنا شروع

چھت سے چھلانگ لگانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ میں پوری رفتار سے اُس کے پیچھے لپکا۔ ملزم منڈیر سے کوئی بیس گز کے فاصلے پر تھا میرا اور اُس کا درمیانی فاصلہ دس فٹ کے قریب تھا۔ عین اُس وقت جب وہ منڈیر پر پہنچ چکا تھا، میں نے اسے چھاپ لیا۔ ہم اوپر نیچے گرے اور تھوڑا سا لڑھک کر عین منڈیر کے اوپر پہنچ گئے۔ بیس فٹ نیچے سڑک پر آمد و رفت جاری تھی کچھ لوگوں نے چونک کر اوپر دیکھا۔ میں ملزم کو گھسیٹتا ہوا منڈیر سے پیچھے لے آیا۔ وہ بری طرح چلا رہا تھا۔ ”چھوڑ دو مجھے چھوڑ دو، مر جانے دو مجھے۔“

اُس کے چہرے پر دیوانگی طاری تھی۔ میں نے اسے اڑنگا لگا کر چھت پر گرادیا۔ محرر اور دونوں سپاہیوں نے اسے دبوچ لیا وہ خود کو چھڑانے کے لیے دیوانہ وار زور لگا رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے سڑک پر اور چھت پر جمع لگ گیا۔ راغبیر بڑی دلچسپی سے تھانے کی چھت پر ہونے والا تماشا دیکھ رہے تھے۔ سپاہیوں نے چیختے چلاتے ملزم کی ٹانگیں اور بازو پکڑے اور اسے نیچے لے آئے۔

انسپکٹر بلراج ہمیشہ سے زیادہ آگ بگولہ نظر آ رہا تھا۔ پہلے تو اُس نے ملزم کو لے جانے والے سپاہیوں کو تھپڑ مارے پھر ملزم پر پل پڑا۔ اپنی بیٹی اتار کر اُس نے ملزم کو اتنی بے دردی سے پیٹا کہ اسے غش آ گیا۔ ملزم کی بہن اور ماں جو بلراج کے دفتر میں بیٹھی تھیں شور سن کر باہر نکلیں۔ جب انہوں نے ملزم کی حالت دیکھی تو چیختی ہوئی بلراج کے قدموں میں گر پڑیں لیکن بلراج کے ہاتھ رکنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ وہ غش کھاتے ہوئے ملزم کو بھی مارے جارہا تھا۔ اس وقت مجھ سے برداشت نہ ہوا۔ میں آگے بڑھا اور بلراج کا اٹھا ہوا ہاتھ تھام لیا۔ اُس نے سرخ آنکھوں سے مجھے گھورا۔

”پیچھے ہٹ جاؤ نواز۔“

”بس کر بلراج۔“ میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ”اسے قتل ہی کرنا ہے تو اندر لے جا۔ وہ دیکھ تھانے کے گیٹ پر لوگ اکٹھے ہو رہے ہیں۔“

”تھانے کو آگ نہیں لگا دیں گے لوگ۔“ وہ غصے سے پھینکا را۔ پھر لوگوں کی ماں بہن ایک کرتا اپنے کمرے میں چلا گیا۔

☆=====☆=====☆

ملزم کا نام ولایت علی تھا وہ اسی شہر کا رہنے والا تھا۔ اُس کی ماں اور بہن بار بار میرے سامنے ہاتھ جوڑ رہی تھیں۔ بڑھیا دہائی دے رہی تھی کہ اُس کا بیٹا بے گناہ ہے، اس طرح کا الزام اُس پر کبھی نہیں لگا، وغیرہ وغیرہ۔ بہر حال یہ عام باتیں تھیں، ملزم کے لواحقین تھانوں

”جج..... جی ہاں!“ لڑکی کے منہ سے نکلا۔ میرا دماغ چکرار ہاتھا۔
”پھر کیا ہوا؟“ میں نے پوچھا۔

لڑکی نے میلی کچلی چادر سے آنسو پونچھے اور بولی۔

”میں اور ماں دونوں سپاہی کے ساتھ گئی تھیں لیکن وہ ہمیں تھانیدار صاحب کے بجائے اپنے گھر لے گیا۔ اُس نے ہمیں بہت ڈرایا دھمکایا اور کہا کہ تمہارے آدمی پر قتل کا کیس بھی پڑ جائے گا۔“
”پھر؟“

”پھر اُس نے کہا کہ میں تھانیدار صاحب سے کہہ کر ولایت کی ضمانت کرا سکتا ہوں..... دراصل..... دراصل اس کی نیت خراب تھی۔ وہ مجھے بڑی بری نظروں سے دیکھ رہا تھا پھر اُس نے میری ماں کو باہر بھیجنے کے لیے بہانہ بنایا۔ اسے ایک فارم دے کر کہنے لگا کہ ڈاکخانے سے اس پر نمکٹیں لگوا لاؤ۔ میری ماں کو شک ہو گیا۔ جونہی وہ کسی کام سے دوسرے کمرے میں گیا، ماں مجھے ساتھ لے کر باہر نکل آئی۔ ہم نے کسی سے اس بات کا ذکر نہیں کیا پھر بھی آج میرے بھائی پر اتنی سختی ہوئی ہے اگر ہم بتا دیتیں تو پتہ نہیں کیا ہوتا۔“
لڑکی کی آنکھیں جو رونے سے اور بھی شفاف ہو چکی تھیں لگاتار آنسو بہا رہی تھیں۔
لبے سپاہی کا اشارہ میں اچھی طرح سمجھ گیا تھا وہ بلراج کا ہیڈ کانسٹیبل عنایت مسیح تھا۔ میں نے بڑھیا کی طرف دیکھا اسے اب ہوش آ گیا تھا۔ میرے ہیڈ کانسٹیبل خوشی محمد نے اسے عقب سے سہارا دے رکھا تھا۔ وہ بار بار کہہ رہی تھی۔ ”ہائے میرا بچہ۔ وہ میرے بچے کو مار دے گا۔ خدا کے لیے کوئی اسے بچائے۔“

میں نے عورت کو تسلی و تشفی دے کر چپ کرایا۔ پھر میں نے ایک فیصلہ کیا اور تیز قدموں سے ڈی ایس پی صاحب کے کمرے کی طرف چل دیا۔ سیلوٹ کر کے میں نے ان کے سامنے کرسی سنبھالی۔ وہ چھت پر پیش آنے والے واقعے کے بارے میں تفصیلات معلوم کرنے لگے۔ میں نے بلراج کے خلاف کوئی بات نہیں کی جب گفتگو کا سلسلہ ختم ہوا تو میں نے عطاء صاحب سے کہا۔

”جناب میں چاہتا ہوں کہ اس لڑکے ولایت کا کیس میں ہینڈل کروں..... بلراج صاحب آج کل خاصے مصروف ہیں اور میرے خیال میں یہ کیس کافی وقت اور توجہ مانگتا ہے۔“

”تو تمہارا مطلب ہے بلراج پوری توجہ نہیں دیتا؟“ ڈی ایس پی کا لہجہ کچھ بدلا سا تھا۔

ہوئی اور اُس کی ماں بہن نے میرے کمرے میں رونا چلانا شروع کیا تو میں اٹھ کر بلراج کے پاس گیا اُس نے ملزم کو چھت سے الٹا لٹکا رکھا تھا۔ میں نے بلراج کو ایک طرف لے جا کر کہا۔

”دیکھ یار! ابھی دو گھنٹے پہلے کتنا بڑا حادثہ ہونے والا تھا۔ اگر یہ مر جاتا تو ہم سب مصیبت میں پڑ جاتے۔ کہیں اب پھر یہ کوئی ایسی حرکت نہ کر دے میرا خیال ہے اسے آج کی رات سوچنے کا موقع دو۔“
وہ تنک کر بولا۔

”ایک تو باؤیار! میں تجھ سے بڑا تنگ ہوں۔ ہر چور اُچکے کا ماما بن جاتا ہے تو۔“
مجھے اُس کے لہجے پر اتنا طیش آیا کہ میرا ہاتھ اٹھتے اٹھتے رہ گیا۔ مجھے اس تھانے میں آئے ابھی مہینہ ڈیڑھ ہوا تھا اور بلراج میرے مزاج سے واقف نہیں تھا۔ یہاں صرف ایک شخص تھا جو مجھے اچھی طرح سمجھتا تھا اور وہ تھا یہاں کا انچارج ڈی ایس پی عطاء اللہ خان۔ میں ایک لفظ کہے بغیر بلراج کے پاس سے چلا آیا۔ اپنے کمرے میں پہنچا تو بڑھیا بے ہوش ہو چکی تھی۔ اُس کے دانت مضبوطی سے ایک دوسرے پر جمنے ہوئے تھے اور ہاتھ پاؤں مڑ گئے تھے۔ پنجابی میں اسے ”دندن پڑنا“ کہتے ہیں۔ اُس کی جواں سال بیٹی ماں کا سر گود میں رکھتے زار و قطار رو رہی تھی۔ اُس کے لمبے سیاہ بال ماں کے سفید بالوں سے چھورے تھے۔
مجھے دیکھ کر وہ جلدی سے اٹھ کھڑی ہوئی اور ہچکیاں لیتے ہوئے بولی۔
”تھانیدار صاحب! میری ماں اور بھائی کو بچا لیجئے۔ آپ جو بھی کہیں میں کرنے کو تیار ہوں۔ مجھے جہاں کہیں میں چلی جاؤں گی۔“

میں ایک لمحے کے لیے سنانے میں آ گیا۔ تو معاملہ یہاں تک پہنچا ہوا تھا۔ میں نے ایک نظر غور سے لڑکی کو دیکھا، بمشکل انیس بیس سال کی ہوگی۔ شکل گویا زیادہ خوبصورت نہیں تھی لیکن جسم پر کشش تھا۔ اُس نے نہایت یوسیدہ سے کپڑے پہن رکھے تھے، پاؤں سے ننگی تھی۔ میرے کانوں میں اُس کے الفاظ نشتر چھورے تھے۔ ”تھانیدار صاحب! آپ جہاں بھی کہیں میں چلی جاؤں گی۔“

میں نے اسے گھورتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا کسی نے تم سے کہیں چلنے کو کہا تھا؟“
”جی ہاں..... کل اُس لبے سپاہی نے کہا تھا کہ تھانیدار سے گھر چل کر بات کرو وہاں وہ تمہاری بات سن لے گا۔“
”پھر تم وہاں گئیں؟“

”نہیں جناب، میں نے توجہ کے ساتھ ”وقت“ کا لفظ بھی استعمال کیا ہے۔ ان کے پاس اتنا وقت نہیں، جو میں سمجھتا ہوں اس کیس کے لیے ضروری ہے۔“

”بھئی یہ تو ایک سیدھا سادا معاملہ ہے۔ تم خواہ مخواہ پریشان ہو رہے ہو، اس قسم کی باتوں سے شاف میں بدلی پھیلتی ہے۔“

مجھے ڈی ایس پی سے اس قسم کے جوابات کی توقع نہیں تھی۔ میرا شک یقین میں بدل گیا کہ جب میں ملزم کی بہن سے باتیں کر رہا تھا۔ بلراج آکر ڈی ایس پی سے مل گیا تھا۔ دیرینہ ساتھ کی وجہ سے ان دونوں میں گہرے تعلقات تھے، لیکن ڈی ایس پی کا رویہ مجھ سے اب تک مہربانہ رہا تھا۔ وہ میرے سابقہ ریکارڈ سے بخوبی واقف تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ وہ خوشی مجھے تفتیش کی اجازت دے دیں گے لیکن لگتا تھا بلراج اس معاملے کو انا کا مسئلہ بنا رہا ہے۔ اگر میں ڈی ایس پی سے بحث کرتا تو ممکن تھا وہ بھی ایسا ہی سمجھنے لگتے۔

ابھی میں اٹھنے کی تیاری کر رہی رہا تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی، دوسری طرف یقیناً کوئی اعلیٰ افسر تھا۔ شاید ایس ایس پی صاحب تھے۔ ڈی ایس پی کا لہجہ مؤدبانہ ہو گیا۔ وہ قریباً دس منٹ تک گفتگو کرتے رہے۔ اس گفتگو سے میں نے جو اندازہ لگایا وہ یہ تھا جب چھت پر ملزم اور تھانے کے عملے کے درمیان کشمکش ہو رہی تھی سڑک پر بہت سے لوگ جمع ہو گئے تھے۔ لوگوں کے جمع ہونے سے کچھ دیر کے لیے ٹریفک بھی رک گئی تھی۔ اُس جام ٹریفک میں ایک گاڑی کسی صوبائی وزیر کی تھی۔ وزیر کی گاڑی کے ساتھ ایک جیپ میں پریس کے نمائندے بھی تھے۔ ان لوگوں نے جیپ کی چھت پر کھڑے ہو کر چھت پر ہونے والی ہاتھ پائی کی تصویریں بنائی تھیں۔ وزیر صاحب نے بھی سارا معاملہ اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اب وہ متعلقہ حکام پر سخت برہم تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ اس تھانے میں پہلے بھی ایک دو واقعات ایسے ہو چکے ہیں۔ (بلکہ ایک واقعہ خود میری تعیناتی کے دوران ہوا تھا ایک حوالاتی نے بجلی کا بلب توڑ کر چبایا تھا بعد میں ہسپتال میں بمشکل اُس کی جان بچائی جاسکی تھی) انہوں نے پولیس کے اعلیٰ حکام کو ہدایت کی تھی کہ اس واقعے کے اسباب کا کھوج لگائیں اور اگر کسی پولیس اہلکار نے اختیارات سے تجاوز کیا ہے تو اسے سزا دی جائے۔ اب ایس ایس پی صاحب نے ڈی ایس پی سے فوراً اس کیس کی تفصیلات مانگی تھیں۔ ٹیلی فون رکھ کر عطاء صاحب نے پیشانی سے پسینہ پونچھا اور مجھ سے کہنے لگے۔

”نواز خان! یہ کیس تم خود ہینڈل کرو۔ بلراج سے سارا ریکارڈ لے لو اور اسے فوراً میرے کمرے میں بھیجو..... میں ابھی تم سے پھر بات کرتا ہوں.....“

میں سیلوٹ کر کے باہر چلا آیا۔ کافی دور ہی سے ملزم ولایت علی کی کراہیں سنائی دے رہی تھیں۔ بڑھیا اور لڑکی میرے کمرے میں موجود نہیں تھیں۔ میں نے اپنے ہیڈ کانسٹیبل سے پوچھا، اُس نے بتایا کہ بلراج صاحب نے ان دونوں کو گھر بھجوا دیا ہے۔ میں بلراج کے عقوبت خانے میں داخل ہوا، وہ کرسی پر ٹانگیں پیارے بیٹھا تھا۔ ایک حوالاتی اُس کے پاؤں دبا رہا تھا۔ ولایت اسی طرح لٹکا ہوا تھا۔ ہیڈ کانسٹیبل عنایت مسج ہاتھ میں بال اکھاڑنے والا موچنا لیے کھڑا تھا۔ اُس نے ولایت کی موچنوں کے چند بال موچنے میں جکڑ رکھے تھے اور آہستہ آہستہ انہیں کھینچ رہا تھا۔ ملزم کا بالائی ہونٹ کوئی دواچ تک کھینچتا چلا گیا اور وہ بری طرح چلا رہا تھا۔ گردن سے بہنے والا پسینہ، آنکھوں سے بہنے والا پانی اور ناک کا لعاب سب مل جل کر قطرہ قطرہ اُس کی پیشانی سے ٹپک رہے تھے۔ موچنوں کے بال کھینچنا ایک نہایت اذیت ناک سزا سمجھی جاتی ہے۔

”رک جاؤ۔“ میں نے غصے سے کہا۔ اُس نے بال چھوڑ دیئے۔ بلراج کڑی نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔ ”بلراج! عطاء صاحب بلا رہے ہیں۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ اُس کے چہرے پر حیرت کے آثار نظر آئے پھر کچھ کہے بغیر باہر نکل گیا۔ لمبا ہیڈ کانسٹیبل عنایت مسج بھی میری طرف اور کبھی ہاتھ میں پکڑے موچنے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر موچنا اُس کے ہاتھ سے لے لیا۔

”یہ موچنا مجھے دے دے عنایت! ہو سکتا ہے کل کلاں تیری موچنیں اکھاڑنی پڑیں۔“

”میں سمجھا نہیں صاحب؟“

”جس بہن کو گھر لے گیا تھا وہ سب بتا دے گی اور سمجھا بھی دے گی۔“ میں نے کہا۔ عنایت مسج کا تار ایک چہرہ اور تار ایک نظر آنے لگا۔

☆=====☆=====☆

ولایت علی کی حالت کافی خراب تھی۔ میں نے اسے چھت سے اتروایا ایک نزدیکی کلینک سے ڈاکٹر کو بلوایا۔ اُس نے بتایا کہ مریض کو اندرونی طور پر سخت چوٹیں آئی ہیں لیکن خطرے کی بات نہیں۔ گرم دودھ وغیرہ پلوا کر میں نے ہیڈ کانسٹیبل خوشی محمد کو کہا کہ اسے کبل دے کر چار پائی پر لٹا دے۔ خوشی محمد کی ڈیوٹی رات کی تھی، ضروری ہدایات دے کر میں تھانے سے چلا آیا۔

اگلے روز منہ اندھیرے ایک سپاہی نے میرا دروازہ کھٹکھٹایا اور اطلاع دی کہ ملزم ولایت حوالات سے فرار ہو گیا ہے۔ میں ایک لمبے کے لیے سشدرہ گیا۔ اُس کی حالت تو

ایسی نہیں تھی کہ بھاگ سکتا لیکن سپاہی جھوٹ تو نہیں بول سکتا۔ اچانک مجھے صورت حال کی سنگینی کا احساس ہوا۔ یہ معاملہ اعلیٰ افسران کے نوٹس میں تھا۔ اس کام کو اس طرح بگڑنا نہیں چاہئے تھا۔

میں نے اسی وقت کپڑے تبدیل کیے اور بھاگ بھاگ تھانے پہنچا۔ حوالاتیوں کو عام طور پر ایک بیرک کے اندر زمین پر بچھی ہوئی چاول کی چھال پر سلا یا جاتا تھا لیکن میری ہدایت پر ولایت علی کو ایک دوسری کونٹری میں چار پائی دی گئی تھی۔ میں نے جگہ کا معائنہ کیا۔ چار پائی، لحاف، تکیہ سب کچھ اسی طرح پڑا تھا۔ کمرے کی پکی دیوار میں کوئی ڈیڑھ مربع فٹ کا سوراخ نظر آ رہا تھا اور مجرم غائب تھا۔ یہ کونٹری عمارت کی بیرونی جانب تھی اور شاؤد نادر ہی یہاں کوئی حوالاتی رکھا جاتا تھا۔ بہر حال جیسے بھی ہوئی تھی غلطی ہو چکی تھی۔ میرے خیال میں سب سے زیادہ قصور وار ہیڈ کانسٹیبل خوشی محمد تھا۔ حوالاتیوں کی نگہداشت اُس کی ذمہ داری تھی اور میں نے خاص طور پر اسے ولایت کا خیال رکھنے کی تاکید کی تھی لیکن لگتا تھا رات کسی پہرہ سو گیا تھا اور ملزم کو نقب لگا کر فرار ہونے کا موقع مل گیا۔ بڑی شرم کی بات تھی کہ تھانے میں نقب لگائی گئی تھی یعنی چراغ تلے اندھیرے والا معاملہ ہو گیا تھا۔

میں نے کانسٹیبل خوشی محمد سے سوالات کیے وہ سخت پریشان نظر آتا تھا، شاید اسے اپنی نوکری کی فکر کھا رہی تھی۔ میں نے اُسے تسلی دی کہ جو کچھ ہونا تھا وہ ہو چکا اب ہمیں اس بگڑے ہوئے معاملے کو سنوارنا ہے۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ رات اُس کے ساتھ اور کون کون تھا۔ اُس نے چند ایک نام بتائے۔ ان میں کوئی شخص بھی ایسی حرکت نہیں کر سکتا تھا۔ بہر حال سب سے پہلا کام میں نے یہ کیا کہ ایک اے ایس آئی کو دو کانسٹیبلوں کے ساتھ ملزم کے متوقع ٹھکانوں پر بھیجا۔ ان میں اُس کے یار دوست اور ملنے والے شامل تھے۔ ایسے لوگوں کے پتے ملزم کی فائل میں موجود تھے۔ خود میں دو کانسٹیبلوں کے ساتھ اُس کے گھر روانہ ہوا وہ ایک کچی آبادی میں رہتا تھا۔ تنگ و تاریک گلیوں میں سے ہوتے ہوئے ہم اُس کے گھر پہنچے۔ ابھی اجالا پوری طرح نہیں پھیلا تھا۔ میں نے ٹاٹ کا پردہ اٹھا کر لکڑی کا بوسیدہ دروازہ کھٹکھٹایا۔

”کون ہے؟“

ایک عمر رسیدہ مردانہ آواز آئی اور ایک بوڑھے نے دروازہ کھولا۔ سامنے پولیس کو دیکھ کر اُس کی وہی حالت ہوئی جو غریب غرباء کی ہوا کرتی ہے، وہ تھر تھر کانپنے لگا۔ میں نے اسے کہا ”گھر میں پردہ کراؤ۔“

وہ بولا۔ ”مائی باپ آپ سے پردہ کرنے والا کون ہے آپ بادشاہ ہیں..... مالک ہیں۔“ اُس نے دروازہ کھول دیا۔ ہم اندر داخل ہوئے۔ بڑھیا اور اس کی بیٹی بھی جاگ گئی تھیں۔ بڑھیا کے بال بکھرے تھے اور لڑکی کا دوپٹہ پاؤں میں جھول رہا تھا۔ خوف کی بجائے وہ امید بھری نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھیں۔ ایک لمحے میں میں نے محسوس کر لیا کہ ملزم یہاں نہیں پہنچا یا کم از کم ان لوگوں کو اس کا پتہ نہیں۔ بڑھیا بولی۔ ”تھانیدار پتر! میرا ولایت ٹھیک ہے نا؟“

میں نے کانسٹیبلوں سے کہا کہ گھر کی تلاشی لیں۔ انہوں نے جلدی جلدی گھر کے کونے کھدے دیکھے اور کرنٹی میں سر ہلا دیا۔ بوڑھے بڑھیا کی نگاہوں میں اب حیرت پائی جاتی تھی۔ بڑھیا ڈری ہوئی بولی۔

”پتر خیر تو ہے نا؟“

میں نے سخت لہجے میں کہا۔ ”مائی تیرے پتر کو میری مہربانی راس نہیں آئی۔ وہ حوالات سے بھاگ گیا ہے..... اور مجھے یقین ہے کہ تم لوگوں نے ہی اسے چھپایا ہے سیدھی طرح اُس کا پتہ دو ورنہ برا حشر ہوگا۔“

میرے بدلے ہوئے تیور کو دیکھ کر بڑھیا کے ہاتھ کانپنے لگے، لڑکی بھی رونے لگی۔ بوڑھا بولا۔

”تھانیدار صاحب! رب جانتا ہے ہمیں اُس کے بارے کچھ پتہ نہیں۔ ہم تو امید لگائے بیٹھے تھے کہ آج اس کی رہائی ہو جائے گی۔ جنتے کا آپ کی تعریفیں کر کر کے منہ سوکھ رہا تھا۔ کبھی تھی اللہ نے میرے بچے کی مدد کے لیے فرشتہ بھیج دیا ہے۔ اب وہ ضرور گھر آ جائے گا..... خدا کی قسم ہمیں اُس کے علاوہ کچھ پتہ نہیں۔“

میں نے کہا۔ ”بابا کچی باتیں نہ کر۔ وہ تیرا بیٹا ہے تجھے اُس کے بارے پتہ نہیں ہوگا تو کسے ہوگا۔ تم لوگ اسے بچا کر اور زیادہ مصیبت میں ڈالو گے۔ اگر اپنی اور اس کی خیریت چاہتے ہو تو اُس کا پتہ بتادو۔“

میرا لہجہ اور رویہ دیکھ کر بڑھیا آگے بڑھی۔ پھر اپنی چادر اتار کر چار پائی پر بچھاتی ہوئی بولی۔ ”لے پتر! یہاں بیٹھ، میں تجھے بتاتی ہوں۔“ پھر اُس نے بازو سے پکڑ کر مجھے چار پائی پر بٹھا دیا۔

بوڑھا بولا۔ ”تھانیدار جی، ہم بے قصور ہیں.....“

بڑھیا نے اسے ڈانٹا ”تو چپ کر کے بیٹھ جا۔“ پھر میرے قرب بیٹھتی ہوئی بولی۔

اور دو عورتیں تھیں۔ صفائی کے دوران نظر بچا کر ولایت علی نے سیٹھ کی الماری سے ایک طلائی انگٹھی، تین ہزار روپے نقد اور تقریباً اتنی ہی مالیت کی ایک دستی گھڑی چرائی۔ اس چوری کا علم شام کو ہوا۔ پولیس نے ولایت علی کو ایک چائے خانے سے شراب کے نشے میں دھت گرفتار کر لیا تھا۔ ابتدائی رپورٹ سے پتہ چلتا تھا کہ ولایت علی اچھے کردار کا لڑکا نہیں، بے روزگار ہے۔ بس کبھی کہیں سفیدی کر لیتا ہے۔ کبھی دیواروں پر اشتہار لگاتا نظر آتا ہے اور کبھی قالینوں کی صفائی شروع کر دیتا ہے۔ نزدیکی آبادی جام نگر کی ایک شادی شدہ عورت سے اس کا چکر ہے عموماً اس کے گھر کے گرد منڈلاتا رہتا ہے۔ اس گلی میں ایک پان والے سے اس کی دوستی ہے اکثر اس کے ہاں بیٹھا نظر آتا ہے۔

یہ تمام معلومات میرے ذہن میں محفوظ تھیں۔ اب میرا رخ جام نگر کی طرف تھا۔ یہ ایک متوسط آبادی تھی۔ چھوٹی موٹی کوٹھیاں بھی نظر آتی تھیں۔ جس وقت ہم یہاں پہنچے دن کافی چڑھ آیا تھا۔ لوگ اپنے اپنے کاروبار سے جارہے تھے۔ میں نے جیب سیدھی پان شاپ پر رکوائی۔ پان والا ایک صحت مند نوجوان لڑکا تھا۔ جیب دکان کے سامنے رکے دیکھ کر وہ ٹھنک گیا۔ میں نے اسے جیب کے اندر بلا کر پوچھ گچھ شروع کی۔ حسب توقع اس نے ولایت کے فرار سے لاعلمی کا اظہار کیا۔ میں نے اس پر زیادہ سختی نہیں کی اور ولایت کے یارانے کے متعلق پوچھا پہلے تو وہ انکار کرتا رہا لیکن جب اسے پتہ چلا کہ پولیس کافی کچھ جانتی ہے تو اس نے تھوڑی دور ایک مکان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا کہ اس مکان میں رہنے والی عورت سے ولایت کے تعلقات رہے ہیں۔ اس عورت نے ولایت کو بڑے بڑے سبز باغ دکھائے تھے لیکن پھر ایک دوسرے شخص سے شادی کر لی۔ میں نے اس کے شوہر کے بارے میں پوچھا تو لڑکا جس کا نام شاہد حنیف تھا بتانے لگا کہ عورت کا شوہر کسی دفتر میں چپڑا سی ہے۔

میں یہ انکشاف سن کر حیران رہ گیا۔ میں نے ایک نظر پھر اس مکان کی طرف دیکھا۔ مکان گو بہت اچھا نہیں تھا لیکن ایک چپڑا سی کی تنخواہ میں تو ایسے مکان کا صرف خواب ہی دیکھا جاسکتا تھا۔ بہر حال یہ کوئی ایسی عجیب بات بھی نہیں تھی بعض اوقات چپڑا سی بھی کافی لمبے ہاتھ مار لیتے ہیں۔ اگر ہم کلرک کو بادشاہ مانتے ہیں تو چپڑا سی کو کم از کم وزیر تو ماننا چاہیے اور یہ بھی ضروری نہیں کہ یہ چپڑا سی ویسا ہی ہو جیسا عام تصور پایا جاتا ہے۔ یعنی منحنی جسم، ڈھیلی ڈھالی پتلون اور سر پر سینکڑے بینڈ ٹوپی۔ چپڑا سی بھی تو جوان جہان اور خوب ہو سکتا ہے۔ یقیناً یہ بھی کوئی ایسا ہی چپڑا سی تھا۔

”پُتر! خدا کے بعد تو ہی ہمارا آسرا ہے۔ میں تجھ سے کچھ نہیں چھپاؤں گی۔“ پھر اُس نے لڑکی کی طرف دیکھا۔ ”جارانی! ادھر کھڑی منہ کیا دیکھ رہی ہے۔“ لڑکی اندر چلی گئی۔ بڑھیا بولی۔ ”پُتر! میرا ولایت برائیں تھا۔ جیسا بھی تھا شام کو چار پیسے لے کر ہی آتا تھا۔ ریڑھی پر قلفی لگا کر بیچتا تھا۔ اڑوس پڑوس والی کہتی تھیں جتنے کا پُتر نیک اور کماؤ ہے۔ پھر اُسے ایک بد بخت ٹکڑی کی نظر کھا گئی۔ میں نے تو آج تک اس ڈائن کا نام بھی نہیں سنا، لیکن کہتے ہیں کہ کسی سکول میں پڑھاتی تھی۔ پگلا تو میرا بیٹا ہی تھا۔ کسی کو کیا کہوں۔ بھلا سوچتا کہاں وہ پڑھی لکھی نخرے والی ماسٹرانی اور کہاں یہ قلفیاں بیچنے والا لیکن یہ تو اس کے فریب میں ایسا آیا کہ ہر وقت اس کی لٹک میں رہتا۔ پتہ نہیں اس چڑیل نے کیسا جادو کر دیا میرے بیٹے پر۔

پھر وہی ہوا جو ہونا تھا۔ اس نے کسی اور سے بیاہ کر لیا اور یہ پاگل، ریڑھی چھوڑ چھاڑ فقیروں کے حال گلیوں میں پھرنے لگا۔ اب اسے پورے چار مہینے ہوئے ہیں کاروبار چھوڑے ہوئے صبح کا نکلا شام کو آتا ہے۔ میں نے سمجھا یا باپ نے سمجھایا۔ بہن نے واسطے دیئے لیکن وہ تو جیسے اس دنیا میں ہی نہیں۔ میں روز کبھی تھی اس طرح آوارہ پھرے گا تو کسی دن شام کو تیری راہ دیکھتی رہ جاؤں گی.....

پھر یہی ہوا۔ چار پانچ دن پہلے اسے پولیس نے پکڑ لیا۔ میں رات گئے تک دلیز پر بیٹھی رہی۔ ساری رات ہم اس کا انتظار کرتے رہے۔ صبح ایک محلے دار نے بتایا کہ رات ولایت پکڑا گیا ہے۔ اس نے کسی گھر میں چوری کی ہے۔ تھانیدار پُتر پتہ نہیں کس کرماں جملے نے ہم سے یہ بیر کمایا ہے۔ مجھے تو لگتا ہے یہ ایسا ماسٹرانی کے کسی ہوتے سوتے کا کام ہے۔ میرا بیٹا لاکھ آوارہ سہی لیکن اللہ جانتا ہے.....“

اس سے آگے بڑھانے بیٹے کی صفائی میں وہی تھانے والی تقریر شروع کرنی تھی۔ میں نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روکتے ہوئے کہا۔ ”اماں، دیکھو، اگر تمہارا بیٹا یہاں آئے یا تمہیں اس کی کوئی اطلاع ملے تو فوراً تھانے اطلاع کرو۔ صرف یہی ایک صورت ہے اس کی مدد کی۔“ یہ کہتا ہوا میں ولایت کے گھر سے باہر آ گیا اب میرا رخ اس ماسٹرانی کی طرف تھا جس کا ذکر ولایت کی ماں نے کیا تھا اور جس کے متعلق فائل میں بھی اندراج تھا۔ چوری کی رپورٹ کے ساتھ کوئی دس پندرہ شہادتیں موجود تھیں۔

ان شہادتوں سے پتہ چلتا تھا کہ بروز ہفتہ 9 دسمبر ولایت علی ولد محمد بوٹا لوہے کے معروف تاجر سیٹھ عبدالعزیز کے گھر آیا اور ان سے کہنے لگا کہ وہ قالینوں کی صفائی کرتا ہے۔ سیٹھ صاحب نے اسے کام بتا کر معاوضہ طے کر لیا اور خود دکان پر چلے گئے۔ گھر میں دو ملازم

ابھی لڑکے سے گفتگو ہو رہی تھی کہ سامنے والے مکان کا دروازہ کھلا۔ میں چونکا ہو کر دیکھنے لگا۔ ایک سائیکل کا پہیہ نظر آیا پھر سائیکل تھامنے والا شخص بھی دروازے کی اوٹ سے نکل آیا۔ اسے دیکھتے ہی میں پہچان گیا کہ یہ ولایت کی محبوبہ کا شوہر ہے۔ میرا دوسرا اندازہ بالکل غلط تھا۔ یعنی چیز اسی کوئی خوبصورت شخص نہیں تھا۔ منحنی جسم، ڈھیلا ڈھالا لباس اور سانولا رنگ۔ عمر بھی پینتیس سال سے کم دکھائی نہیں دیتی تھی۔ اس کے عقب میں کوئی عورت دکھائی دی۔ میں نے عورت کی صرف ایک جھلک دیکھی لیکن یہ ایک جھلک بتانے کے لیے کافی تھی کہ عورت جوان اور خوبصورت ہے۔

میں نے حیرانگی سے پان فروش کی طرف دیکھا۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ یعنی یہی شخص دروازے میں کھڑی عورت کا شوہر تھا۔ میرے ذہن میں کئی شے سر ابھارنے لگے۔ میں نے لڑکے سے کچھ اور باتیں پوچھیں جن سے پتہ چلا کہ چیز اسی کا نام نذیر محمد ہے۔ یہ انکم ٹیکس کے دفتر میں کام کرتا ہے۔ کافی ہوشیار آدمی ہے۔ ایک بیوی پہلے مار چکا ہے اس میں سے کوئی بچہ نہیں تھا یہ مکان بھی تین چار ماہ پہلے مکمل ہوا ہے۔ اس سے پہلے وہ اس جگہ ایک کمرے کے خستہ گھر میں رہتا تھا۔ لڑکے نے بتایا کہ یہ شخص طبیعت کا بڑا غصیلیا ہے۔ ذرا سی بات پر بھڑک اٹھتا ہے۔ بیوی پر بھی سختی کرتا ہے۔ اڑوس پڑوس والے کہتے ہیں کہ بیوی پر اس کا بڑا رعب ہے۔ اس کی اجازت کے بغیر وہ کسی سے بات بھی نہیں کر سکتی۔ لوگوں کو حیرانی ہوتی ہے کہ یہ عورت اس شخص کے ساتھ کیسے نباہ کر رہی ہے۔

میں نے پان فروش کا طویل بیان غور سے سنا۔ صورت حال کچھ ابھی ہوئی تھی۔ ایک حسین و جمیل لڑکی ایک بچی عمر کے چیز اسی کی بیوی تھی اور وہ اس پر سختی بھی کرتا تھا۔ پان فروش سے پتہ چلا کہ نذیر بیوی کے ساتھ اکیلا رہتا ہے اس کے ماں باپ فوت ہو چکے ہیں لیکن اس کی ساس کبھی کبھی یہاں آتی ہے۔ ایک دفعہ نذیر نے اپنی ساس کو بھی مارا تھا۔ پتہ نہیں اس نے کیا چیز اسے اٹھا کر ماری تھی کہ بے چاری کا ماتھا پھٹ گیا تھا۔ بعد میں گلی کے کپاؤ نڈر سے ہمسائے کے لڑکے نے اس کی پٹی کروائی تھی۔ پان فروش نے بتایا کہ یہ دو تین ہفتے پہلے کی بات ہے۔

اتنے میں ایک شخص ہمارے چپ کے قریب آیا اور بھاری بھر کم آواز میں ”السلام علیکم“ کہہ کر ہاتھ میری طرف بڑھا دیئے۔ میں نے مصافحہ کیا۔ تھوڑی سی کوشش سے میں اسے پہچان گیا۔ یہ گنپت لال اچاریہ تھا۔ تھا تو ہندو لیکن بڑا خوش اخلاق شخص تھا۔ ایک دو بار میں نے اخبار میں بھی تصویر دیکھی تھی۔ سیاست میں دلچسپی رکھتا تھا لیکن میں اسے سماجی کاموں

کے حوالے سے جانتا تھا۔ ایک دو بار کسی کی ضمانت کے سلسلے میں تھانے بھی آیا تھا۔ اس کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

”جناب! یہ تو بڑی زیادتی ہے۔ آپ اس علاقے میں آئیں اور ہم آپ کے درشنوں سے محروم رہیں۔ چلئے میرے ساتھ گھر۔“ اس نے اپنی کار آگے بھجوا دی اور خود ہمارے ساتھ ہی جیپ میں بیٹھ گیا۔ اس کا اصرار دیکھ کر میں انکار نہ کر سکا۔ یوں بھی مجھے چیز اسی اور اس کی بیوی کے بارے میں معلومات درکار تھیں اور گنپت لال سے زیادہ معلومات کوئی دوسرا نہیں دے سکتا تھا۔ چند فرلانگ دور اس کی کوٹھی تھی۔ ہمیں لے کر وہ ڈرائیونگ روم میں چلا آیا۔ میں نے اسے کہا کہ مجھے اس وقت بہت جلدی ہے۔ میں صرف اس علاقے کے ایک گھر کے متعلق جاننا چاہتا ہوں۔ وہ ہمد تن گوش ہو گیا۔ میں نے چیز اسی نذیر محمد کا نام لیا تو اس کے چہرے پر الجھن کے آثار نظر آنے لگے۔ بولا۔

”خان صاحب! نذیر محمد کو میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ میرے پاس آتا جاتا رہتا ہے۔ انکم ٹیکس میں چیز اسی ہے۔ میرا خیال ہے اس نے کہیں لمبا ہاتھ مارا ہے۔ بہر حال ان محکموں میں تو یہ سب کچھ چلتا ہے۔“

میں نے پوچھا۔ ”کوئی اور بات جو اس کے متعلق آپ کو معلوم ہو؟“ گنپت لال بولا۔ ”خان صاحب! بیوی بڑی خوبصورت ہے اس کی اور جوان بھی۔ پتہ نہیں کیا چکر چلایا ہے بد معاش نے۔“

میں نے کہا ”گنپت جی! میں بھی اس لڑکی کے متعلق ہی جاننا چاہتا ہوں۔ میرا خیال تھا آپ کو زیادہ پتہ ہوگا۔“

گنپت لال گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ پھر انگلی اٹھا کر بولا۔ ”میرا خیال ہے خان صاحب اس بارے میں لڑکی کی ماں آپ کو زیادہ بہتر طور پر بتا سکتی ہے۔ وہ یہاں سے کچھ دور ایک دوسرے محلے میں رہتی ہے۔ میرا ایک نوکر اس کے بارے میں جانتا ہے اگر ضرورت ہے تو اس عورت کو یہیں بلا لیتے ہیں۔ بلکہ میرا خیال ہے یہی مناسب رہے گا۔“

میرے بولنے سے پہلے ہی گنپت لال اپنے کسی ملازم کو آوازیں دینے لگا۔ ملازم آیا تو گنپت لال نے اسے کچھ ہدایتیں دے کر روانہ کر دیا۔ مجھے لگ رہا تھا جیسے وہ بھی اس معاملے میں دلچسپی لے رہا ہے۔ ہم بیٹھے ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ کوئی ایک گھنٹہ بعد گنپت لال کا ملازم ایک فربہ اندام عورت کو لئے اندر داخل ہوا۔ عورت کی عمر چالیس سال کے لگ

بھگ تھی۔ لباس اوسط درجے کا تھا۔ پان فروش کے بیان کے عین مطابق اس کے ماتھے پر زخم کا دو تین ہفتے پرانا نشان دکھائی دے رہا تھا۔ عورت بے حد خوفزدہ تھی۔ میں نے اسے کہا ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ میں صرف اس سے چند باتیں پوچھنا چاہتا ہوں۔ ظاہر ہے سب سے پہلے میں نے اس سے بیٹی کی شادی کے بارے پوچھا ہوگا۔ عورت نے بتایا کہ نذیر کو اس نے اپنی مرضی سے داماد بنایا ہے۔ اس سلسلے میں اس پر یا اس کی بیٹی پر کوئی دباؤ نہیں ڈالا گیا۔ اس نے کہا۔

”تھانیدار صاحب! اچھے رشتے کہاں ملتے ہیں۔ بیٹیوں کی عمر ڈھلتے دیر نہیں لگتی۔ ایک بار وقت ہاتھ سے نکل جائے تو ساری عمر پچھتانا پڑتا ہے۔ میں اکیلی جان بیٹی کی کہاں تک حفاظت کرتی بس جیسا اس کے مقدر میں تھا مل گیا۔ اللہ اسے اپنے گھر میں خوش رکھے۔“

عورت دانائی کی باتیں کر رہی تھی لیکن یہ باتیں مجھے ہضم نہیں ہو رہی تھیں۔ جیسا کہ میں نے بتایا ہے لڑکی نہ صرف جوان اور خوبصورت تھی بلکہ پڑھی لکھی اور برسر روزگار بھی تھی۔ ایک رنڈوے چڑا سی سے اس کا بیاہے جانا کچھ عجیب سا لگتا تھا۔ پھر میرا دھیان ولایت علی کی طرف چلا گیا۔ ممکن تھا لڑکی کی بدنامی ہو چکی ہو اور مزید بدنامی کے خوف سے ماں نے اسے چڑا سی نذیر کے کھونٹے سے باندھ دیا ہو۔

میں نے کہا۔ ”اماں! دراصل کل رات تھانے سے ایک مجرم بھاگا ہے میں اسی کی تلاش میں ہوں۔ اس کا نام ولایت علی ہے میری اطلاع کے مطابق ماضی میں تمہاری بیٹی کے ساتھ اس کا نام لیا جاتا رہا ہے۔“

عورت کے چہرے پر ایک سایہ سا آ کر گزر گیا۔ کھنکھار کر بولی۔ ”تھانیدار صاحب! اس لڑکے نے بھی ہم ماں بیٹیوں کو بڑا دکھ دیا ہے۔ نہ جانے وہ کہاں سے میری معصوم زلیخا کے پیچھے پڑ گیا تھا۔“

میں نے کہا۔ ”کیا تمہیں معلوم ہے وہ اب بھی تمہاری بیٹی کے پیچھے ہے۔ اسے اکثر چڑا سی نذیر کے گھر کے سامنے دیکھا جاتا تھا۔ مجھے ایک اطلاع ملی ہے کہ وہ اب بھی ملتے ہیں۔“

میں نے اندھیرے میں تیر جھوڑا تھا۔ عورت کے ہونٹ کاپنے لگے۔ ”نہیں تھانیدار صاحب میری بیٹی بدکردار نہیں۔ وہ ایسا نہیں کر سکتی۔ کسی نے اس پر الزام دھرا ہے وہ تو اپنے میاں کے ساتھ بہت خوش ہے۔“

”اور تم بھی اپنے داماد سے خوش ہو؟“

”بالکل جی..... بالکل۔“

عورت کے ماتھے کا نشان اس کے جھوٹ کی چنٹی کھار ہا تھا۔

☆=====☆=====☆

کوئی بارہ بجے میں گنپت لال کے ہاں سے واپس تھانے روانہ ہوا۔ عورت سے ولایت علی کے بارے کوئی پتہ نہیں چل سکا بہر حال اپنی بیٹی کے رشتے کے بارے میں اس نے جو صفائی پیش کی تھی اسے میرے ذہن نے قبول نہیں کیا۔ معاملہ کچھ الجھا ہوا تھا۔ گنپت لال نے اس سلسلے میں مجھے ہر قسم کے تعاون کا یقین دلایا۔

میں تھانے پہنچا تو فضا کچھ خراب دکھائی دے رہی تھی۔ سارے عملے کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ پتہ چلا کہ تھوڑی دیر پہلے ایس ایس پی صاحب خود تھانے تشریف لائے ہوئے تھے۔ وہ ڈی ایس پی صاحب پر بہت برہم تھے۔ اب ڈی ایس پی صاحب اپنے کمرے میں مجھ پر برہم ہونے کے لیے بے چین تھے۔ میں خود کو اس مصیبت کے لیے تیار کرتا ان کے کمرے میں داخل ہوا۔ وہ بے قراری سے کمر پر ہاتھ باندھے ٹہل رہے تھے۔ انسپکٹر بلراج منہ پھلائے ایک کونے میں کھڑا تھا۔ میں نے سیلوٹ کیا۔ عطاء صاحب نے قہر آلود نگاہوں سے مجھے گھورا پھر جیسے خود پر ضبط کرتے ہوئے بولے۔

”کیا رپورٹ ہے نواز؟“

”جناب! صبح کا تفتیش پر نکلا ہوا ہوں۔ کچھ پیش رفت ہوئی ہے۔“

”پیش رفت نہیں..... مجرم چاہیے مجرم۔“ وہ میز پر چھڑی مار کر چلائے۔ ”تمہیں پتہ ہے یہاں کیا ہوا ہے پتہ ہے تمہیں کچھ؟“

”نہیں سر!“ میں نے کہا۔

وہ ایک قدم چل کر آگے آئے۔ ”ابھی صرف آدھ گھنٹہ پہلے تھانے کے سامنے دو ہزار آدمی کھڑا تھا..... وہ مطالبہ کر رہے تھے۔ پتہ ہے کیا مطالبہ کر رہے تھے؟“

”کیا سر؟“ میرے منہ سے نکلا۔

”وہ کہہ رہے تھے پولیس تشدد سے ہلاک ہونے والے بے گناہ شہری کی لاش دو۔ ان الہکاروں کو ہمارے حوالے کرو جو اس قتل کے ذمے دار ہیں۔ ورنہ ہم اس تھانے کو آگ لگا دیں گے..... بولو اب کہاں ہے وہ حوالاتی؟“

میں سکتے کے عالم میں کھڑا تھا۔ معاملہ یہ رنگ اختیار کر لے گا اس کی مجھے توقع نہیں تھی۔ اس کا مطلب تھا ملزم کے ”فرار“ کو اس کی موت سمجھا جا رہا تھا۔ لوگ سمجھ رہے تھے کہ

کل تھانے کی چھت پر نظر آنے والا ملزم پولیس تشدد سے مرگیا ہے اور اس کی لاش کو غائب کر کے اس کے فرار کی کہانی گھڑی گئی ہے۔ صورت حال نہایت تشویش ناک تھی۔

بلراج بولا۔ ”یہ سارا تمہاری نرمی کا نتیجہ ہے نواز خان، اگر.....“

”خاموش رہو!“ میں ڈی ایس پی کی موجودگی کی پرواہ کیے بغیر دہاڑا۔ ”یہ میری نرمی کا نہیں تمہاری سختی کا نتیجہ ہے۔ تم نے اسے جانوروں کی طرح مارا۔ تم نے اس سے پیسے وصول کیے۔ تمہارے ماتحت نے اس کی ماں اور بہن کو تنگ کیا۔ وہ میری وجہ سے خودکشی کرنے چھت پر نہیں گیا تھا۔ میں نے اسے صرف پکڑا تھا اور اگر نہ پکڑتا تو تمہاری جتلون پر اس وقت یہ بیٹی نہیں ہوتی۔“

میرا غصہ دیکھ کر بلراج چپ ہو گیا۔ ڈی ایس پی عطاء قدرے نرمی سے بولے۔ ”یہ وقت ایک دوسرے پر انگلیاں اٹھانے کا نہیں کچھ کرنے کا ہے۔ صورت حال ہماری توقع سے کہیں زیادہ خراب ہو سکتی ہے۔ کچھ لوگ اس معاملے کو ہوا دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔“

انہوں نے اپنی گھڑی پر نگاہ دوڑائی اور فیصلہ کن لہجے میں بولے۔ ”اس وقت ٹھیک ساڑھے بارہ بجے ہیں۔ ہمارے پاس کل 22 گھنٹے ہیں کل ساڑھے دس بجے سے پہلے پہلے ملزم اس تھانے میں پہنچنا چاہئے۔ یہ اب تم دونوں کی ذمہ داری ہے۔ وہ زمین کے سات پردوں میں بھی ہے تو اسے ڈھونڈنا ہوگا۔ اس سلسلے میں جس مدد کی ضرورت ہو مل سکتی ہے۔ ایس ایس پی صاحب سے میرا مستقل رابطہ قائم ہے۔ مجھے یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہونی چاہئے کہ کل ساڑھے دس بجے تک ملزم برآمد نہ ہونے سے کیا صورت حال پیش آ سکتی ہے۔“ اتنے میں ٹیلی فون کی گھنٹی بجی اور ڈی ایس پی صاحب کسی اعلیٰ افسر کو تازہ صورت حال سے آگاہ کرنے لگے۔

☆=====☆=====☆

میں اپنے کمرے میں آیا تو ایس ایس پی نے مفروضہ روایت علی کے چار دوستوں کو زمین پر بٹھا رکھا تھا۔ ان میں وہ پان فروش بھی شامل تھا جس سے کل میں نے بات کی تھی۔ باقی تینوں کی عمریں بھی بیس بائیس سال کے درمیان تھیں۔ ان میں سے ایک قالینوں کا کام کرتا تھا جب کہ دو موٹر مکینک تھے۔ ان سے میں نے دو گھنٹے پوچھ گچھ کی۔ وہ ولایت کے بارے کچھ نہ بتا سکے۔ ان چاروں سے ولایت اور زلیخا کے چکر کے بارے جو کچھ پتہ چلا اس کا لب لباب یہ تھا۔

”ولایت ایک اسکول کے سامنے اپنی قلفی کی ریڑھی لگا تا تھا ایک دفعہ یہ ہوا کہ چھٹی کے وقت زلیخا جو اس اسکول میں پڑھاتی تھی۔ برقعہ پہنے باہر نکلی اور گیٹ پر کھڑے ایک تانگے میں بیٹھ گئی۔ کوچوان کچھ دوسرے بچوں کو لینے گیٹ پر کھڑا تھا اچانک گھوڑا بدکا اور بھاگ نکلا۔ زلیخا کی چیخیں سن کر ولایت نے تانگے کے پیچھے دوڑ لگا دی، کوئی آدھ فرلانگ بھاگ کر وہ سرپٹ دوڑتے تانگے پر سوار ہو گیا۔ اس نے گھوڑے پر قابو پانے کی بڑی کوشش کی لیکن وہ ایک چھوٹی سی پٹی سے ٹکرایا اور تانگے سمیت نہر میں جا گرا۔ نہر میں پانی کا بہاؤ بہت تیز تھا۔ زلیخا ڈوبنے لگی لیکن ولایت نے یہاں بھی ہمت سے کام لیا اور اسے کھینچتا ہوا نہر سے باہر لے آیا۔ کنارے پر پہنچتے ہی وہ بے ہوش ہو گیا۔ اس کے سر پر گہری چوٹ آئی تھی۔

وہ ایک ہفتہ ہسپتال رہا اور زلیخا اسے باقاعدگی سے دیکھنے آتی رہی۔ بس یہیں سے ان کی محبت کا آغاز ہو گیا۔ اس کے دوست اکثر اسے سمجھاتے تھے کہ اس بیمار کا انجام اچھا نہیں ہوگا لیکن وہ کسی کی نہیں سنتا تھا دن رات زلیخا کا دم بھرتا تھا۔ اکثر کہا کرتا تھا اگر وہ نہ ملی تو خودکشی کر لے گا..... لیکن پانچ چھ مہینے پہلے لڑکی نے اچانک شادی رچا لی۔ اس وقت سے وہ نیم پاگل بنا پھرتا تھا۔ بس کبھی کبھار نشے کی لت پوری کرنے کے لیے کوئی کام کر لیتا تھا۔

ان چاروں لڑکوں سے اپنی پوچھ گچھ کے دوران میں نے کئی اہم نکتے دریافت کیے۔ ایک بات یہ معلوم ہوئی کہ جس روز ولایت پر چوری کا الزام لگا اس روز ایک کوشی کا ملازم خود ولایت کو لے کر گیا تھا۔ اس شخص کے مالک نے اس کے خلاف چوری کی رپورٹ درج کرائی۔ جب کہ اپنے بیان میں مدعی یعنی سیٹھ عبدالعزیز نے کہا تھا کہ ملزم خود اس کے دروازے پر آیا اور کام طلب کیا تھا۔ رپورٹ میں لکھا تھا کہ ملزم صبح نو بجے کے قریب آیا جب کہ پان فروش اور ایک دوسرے لڑکے نے فردا فردا بیان دیا تھا کہ ساڑھے نو بجے تک ولایت ان دونوں کے پاس بیٹھا رہا تھا۔

ایک بات یہ بھی قابل غور تھی کہ آٹھ نو ہزار روپیہ چوری کرنے کے بعد بھی ملزم نے کہیں روپوش ہونے کی کوشش نہیں کی۔ شام سات بجے چوری کا علم ہوا اور ٹھیک ایک گھنٹہ بعد آٹھ بجے اسے اس چائے خانے سے پکڑ لیا گیا جہاں وہ اکثر بیٹھا کرتا تھا لیکن سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ چوری کا کیس اگر جھوٹا بھی تھا تو اس سے ملزم کی برآمدگی میں کیا مدد مل سکتی تھی۔

پڑ سکتی ہے۔

سیٹھ سے ملنے کے بعد میں نے نہایت رازداری سے ایک سادہ لباس والا اس کی دکان کی گمرانی پر لگا دیا۔ ایک دوسرے شخص کو اس کی کوٹھی پر نظر رکھنے کے لیے بھیج دیا۔ سیٹھ کے ہاں سے میں سیدھا چڑھ کر نذیر کے گھر پہنچا۔ ہیڈ کانسٹیبل نے اس کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ چڑھ کر نذیر کی گرفتاری اور اس کے گھر کی تلاشی کے وارنٹ میری جیب میں پڑے تھے۔ اسی عورت نے دروازہ کھولا۔ پولیس کو دیکھ کر اس کا حسین چہرہ زرد ہو گیا۔ میں ایک لمحہ ضائع کرنا نہیں چاہتا تھا۔ میں دندنا تا ہوا اندر گھس گیا۔

”تیرا شو ہر کہاں ہے لڑکی؟“ سب انسپکٹر نے پوچھا۔

”جی..... جی وہ..... ابھی دفتر سے نہیں آئے۔“ میں نے گھڑی دیکھی پانچ بج چکے تھے۔ سردیوں کا سورج شام کی چادر میں منہ چھپا چکا تھا۔ رات سر پر کھڑی تھی۔ اس رات کی صبح مفروضہ ملزم کو ہمارے درمیان ہونا چاہئے..... یہ نہایت ضروری تھا۔ میں نے گھبرائی ہوئی لڑکی پر ترس کھانے کی بجائے اس کچھ اور خوفزدہ کیا۔

”دیکھ لڑکی! اگر اپنی اور اپنی ماں کی عزت چاہتی ہے تو ولایت کے بارے میں سب کچھ بتا دے۔ ورنہ ایسا حشر ہوگا کہ زندگی بھر نہیں جھولے گی۔“

ایک لمحے میں لڑکی کے ہونٹ مرجھا گئے۔ وہ سخت خوفزدہ دکھائی دے رہی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ جب پولیس والوں پر اوپر سے سختی ہوتی ہے تو وہ آگے سختی کرتے ہیں اور یہ حقیقت ہے۔ شکوک کے ڈھیر سے حقائق کے تنکے چننا کوئی سہل کام نہیں۔ آدمی بری طرح جھنجھلا جاتا ہے اور پھر جب افسران کی طرف سے بھی دباؤ ہو تو بڑے بڑے ٹھنڈے مزاج کے پولیس افسر بھی چنگیز خان بن جاتے ہیں۔ جو درگت اس وقت ہماری بن رہی تھی اگر کوئی دوسرا پولیس والا ہوتا تو اب تک کئی افراد کی ”چھستروں“ کر چکا ہوتا۔ میں بہت تحمل سے کام لے رہا تھا۔ لڑکی نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا لیکن ہونٹ کپکپا کر رہ گئے۔

”دیکھ لڑکی تیرے خلاف بہت سی گواہیاں ہیں۔ ہمیں پورا یقین ہے کہ ولایت کے ٹھکانے کا تجھے علم ہے۔“ اس نے چہرہ ہاتھوں میں چھپا لیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ٹھٹھکیاں پر ہاتھ مار کر گر جا۔

”رونے دھونے سے کچھ نہیں ہوگا۔ جان چھڑانے کی ایک ہی صورت ہے سب کچھ صاف صاف بتا دے۔“

”وہ ہچکیاں لیتے ہوئے بولی۔“ وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا۔ جان سے مار دے گا۔“

وقت بہت کم تھا۔ ایس ایس پی صاحب کے دیئے ہوئے بائیس گھنٹوں میں سے بھی ڈھائی گھنٹے گزر چکے تھے۔ میں نے فوری طور پر سیٹھ عزیز اور چڑھ کر نذیر سے ملنے کا فیصلہ کیا۔ زیر تفتیش افراد کو سب انسپکٹر کے سپرد کر کے میں بلراج کے کمرے میں آیا۔ وہ کرسی سے ٹیک لگائے گہری سوچ میں گم تھا۔ یوں لگتا تھا وہ میز پر بیٹھے بیٹھے یہ کیس حل کرنا چاہتا ہے۔ میں نے کہا۔

”بلراج میرا خیال ہے ہم دونوں کو مل کر کام کرنا چاہیے۔ اگر تمہارے ذہن میں کوئی تجویز ہے تو مجھے بتاؤ۔“

اس نے ایک موٹی سی گالی ”ذہن“ کو اور ایک ”تجویز“ کو دی پھر ایک گالی اپنے آپ کو نکال کر ٹوپی سنبھالتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ ”نواز خان! تیرا میرا راستہ نہیں مل سکتا۔ ٹو اپنے راستے جا مجھے اپنے راستے جانے دے۔“ یہ کہتا ہوا وہ باہر نکل گیا۔

میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس کا راستہ اتنی دور نکل جائے گا۔ وہ جیسا بھی تھا میرا ہم پیشہ اور ساتھی تھا..... وہ تیز قدموں سے چلتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا..... پھر میں نے اسے کبھی زندہ نہیں دیکھا۔

☆=====☆=====☆

میں کوئی سواتین بجے تھانے سے نکلا۔ روانہ ہونے سے پہلے میں نے تھانے کی تقریباً نصف نفری کو مختلف ٹکڑیوں میں بانٹ کر ولایت کی تلاش میں لگا دیا۔ اس سلسلے میں دو تین نزدیکی تھانوں سے بھی مدد لی جا رہی تھی۔ میرا رخ اب سیٹھ عزیز کی دکان کی طرف تھا۔ سیٹھ ایک چالیس پینتالیس سالہ شخص تھا۔ وہ دراصل ترازو، فرزندے اور اس قسم کی دوسری چیزیں بیچنے کا کام کرتا تھا۔

جس وقت میں دکان پر پہنچا۔ ارد گرد کے دو تین بہرے بکندار اس کے پاس بیٹھے تھے۔ سیٹھ کے متعلق ایک منجر کی زبانی پتہ چلا تھا کہ وہ کچھ رنمیر مزاج بھی ہے، اس نے دفتری کام کے لیے ایک نوخیز اور خوبصورت لڑکی ملازم رکھی ہوئی ہے۔ منجر کا کہنا تھا کہ یہ لڑکی اس کی ”رکھیل“ ہے۔ بہر حال میں سیٹھ سے ملا۔ وہ مجھے کچھ مغرور اور اکھڑا نظر آیا۔ میں نے اس سے کچھ سوالات کئے، اس نے وہی باتیں کیں جو اپنے بیان میں کر چکا تھا۔ میں نے اپنے ذہن میں اٹھنے والے سوالات سے اس کے بیان کی صحت جانچی اور مجھے اندازہ ہوا کہ کچھ گڑبڑ ضرور ہے۔ میں نے اٹھتے وقت سیٹھ کو سختی سے ہدایت کی کہ اگلے چوبیس گھنٹوں میں وہ گھر اور دکان کے علاوہ کہیں نہیں جائے گا کسی وقت بھی اس کی ضرورت

”کوئی تجھے ہاتھ نہیں لگا سکتا۔“ میں گرجا۔ ”یہ قانونی معاملہ ہے ہم تیری پوری مدد کریں گے۔ آخر تک تیرے ساتھ چلیں گے۔ کون ہے جس کا تجھے ڈر ہے؟“
 ”وہ..... وہ۔“ لڑکی ہکلا کر رہ گئی۔
 ”شوہر سے ڈرتی ہے۔“ میں نے پوچھا۔

وہ پھر منہ چھپا کر رونے لگی۔ اتنے میں بیرونی دروازہ کھلا اور سائیکل کا اگلا پہیہ نظر آیا۔ کوئی غصیلے لہجے میں بولا۔ ”یہ سائیکل پکڑ ذرا۔“ میں نے لڑکی کی طرف دیکھا۔ ”کہاں مرگے حرام خور..... سائیکل پکڑ۔“ بولنے والے کا چہرہ دروازے کے پردے کی دوسری طرف تھا۔ ایک کانٹیل اٹھا اور اس نے سائیکل کا ہینڈل پکڑ لیا۔ سائیکل والے نے اس کے کیرئیر سے کوئی چیز اتاری اور بولا۔
 ”چل لے جاندر۔“

کانٹیل سائیکل کو اندر لے آیا۔ ذرا سی دیر میں صبح والا چڑا اسی کندھے پر چلانے کی لکڑیاں اٹھائے اندر داخل ہوا۔ اندر کا نقشہ دیکھ کر اس کے چہرے پر بے تحاشا حیرت برسنے لگی۔ لکڑیاں پھینک کر اس نے مجھے سلام کیا اور سوالیہ نظروں سے آنسو بہاتی ہوئی بیوی کی طرف دیکھنے لگا۔ ساتھ والے مکانوں پر کچھ عورتیں اور بچے کھڑے تماشا دیکھ رہے تھے۔ ہڈ کانٹیل نے انہیں ڈرا دھمکا کر پیچھے ہٹا دیا۔ نذر بار بار ہونٹوں پر زبان پھیر رہا تھا۔ میں نے بغیر کسی تہید کے پوچھا۔

”کتنی تنخواہ ہے اوئے تیری؟“

”جی..... وہ..... سو سو روپیہ۔“

”پھر سہ ماہی وغیرہ کرتا ہے ٹو۔“ میں نے اس کے مکان پر نظریں دوڑائیں۔

”جناب آپ کیا کہہ رہے ہیں میں عزت دار آدمی ہوں.....“ ابھی فقرہ اس کے منہ میں تھا کہ میرا بھرپور تھپڑ اس کے گال پر پڑا۔ وہ اچھل کر اپنے سائیکل پر گرا۔ میں اسے بک کر کمرے میں لے آیا۔ وہ بری طرح لرز رہا تھا۔ شاید بیوی کے سامنے ہونے والی بے عزتی نے اسے مشتعل کر دیا تھا۔ اچانک وہ تپائی کی طرف لپکا اور وہاں سے سبزی کاٹنے والی چھری اٹھالی۔ یہ نوکدار چھری کوئی آٹھ انچ لمبی تھی۔ مجھے اس سے اس اقدام کی بالکل توہین نہیں تھی۔

میرے کانوں میں پان فروش کے الفاظ گونجنے۔ اس نے کہا تھا کہ عورت کا شوہر نہایت غصیلا ہے..... وہ نہایت تیزی سے گھوما اور مجھ پر حملہ کر دیا۔ چھری میرے پیٹ سے

کوئی دوا بچ کے فاصلے سے گزر گئی۔ یقیناً اس نے مجھے قتل کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ اگر میں ذرا سا ہلکا جاتا تو وار کارگر ہو گیا ہوتا۔ میں نے دونوں ہاتھ پھیلائے۔ دوسرا وار اس نے میرے سینے پر کیا تھا لیکن اس دفعہ میری نگاہیں چھری پر مرکوز تھیں۔ میں نے نہایت اطمینان سے وار بچایا اور نذیر کی کلائی تھام لی۔ اس نے نتائج سے بے پرواہ ہو کر میرے پیٹ میں لات جمانی چاہی لیکن اس دوران میں نے اس کا بازو مروڑ دیا اور وہ کراہ بھر کر گھوم گیا۔ چھری ہاتھ سے نکلتے ہی میں نے ایک بھرپور ٹانگ اس کی کمر پر جمانی وہ کراہتا ہوا ایک کرسی پر جا گرا۔ سب انسپکٹر نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اس پر کموں اور لاتوں کی بارش کر دی۔ ایک منٹ کے اندر نذیر عرف نجی کی ساری اکڑفون ختم ہو گئی..... اب حالت یہ تھی کہ کمرے کی بیشتر چیزیں ٹوٹ چکی تھیں اور وہ فرش پر پڑا ہانپ رہا تھا۔ مجھے امید تھی کہ اب اس کی بیوی کے سر سے خوف کا بھوت بہت حد تک اتر گیا ہوگا۔ میں اسے دوسرے کمرے میں لے گیا۔

”دیکھ لڑکی کسی سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ میں پھر کہتا ہوں کہ جو کچھ تیرے دل میں ہے بغیر کسی خوف کے بتا دے۔“

لڑکی نے اپنی سرخ سرخ آنکھیں اٹھا کر میری طرف دیکھا اور بولی۔ ”انسپکٹر صاحب! مجھے اور میری ماں کو کوئی نقصان تو نہیں پہنچے گا۔“

میں نے اسے یقین دلایا کہ ذاتی طور پر ہر طرح اس کی مدد کروں گا۔ وہ ایک دم جیسے کھل گئی۔ آنسوؤں کی شفاف لڑیاں اس کے گلابی رخساروں پر بہہ نکلیں۔ یہ وہ آنسو نہیں تھے جو وہ کچھ دیر پہلے بہا رہی تھی۔ یہ تو خوف سے ٹھٹھا ہوا وہ پانی تھا جو آج سورج کی تمازت پا کر جھرنوں کی طرح بہہ نکلا تھا۔ وہ کچھ دیر خود کو سنبھالنے کی کوشش کرتی رہی، پھر بولی۔

”انسپکٹر صاحب..... مجھ پر بڑا ظلم ہوا ہے۔ مجھے بری طرح لوٹا گیا ہے۔ اتنا ظلم کسی تھپر پر بھی کیا جاتا تو وہ پھٹ جاتا لیکن میں نے یہ ظلم اپنی اور اپنی ماں کی زندگی کے لیے برداشت کیا ہے۔ آج سے کوئی 9 مہینے پہلے کی بات ہے میں مقامی سکول میں پڑھاتی تھی۔ سکول کے ایک ملازم نے عداوت کی وجہ سے میری کئی ماہ کی تنخواہ رکوار کھی تھی۔ میری ایک سہیلی نے مجھے گنپت لال اچاریہ سے ملنے کا مشورہ دیا۔ شاید آپ جانتے ہوں یہ وہی گنپت ہے جو سماجی کارکن کے طور پر مشہور ہے اور دو سال پہلے الیکشن میں بھی کھڑا ہوا تھا۔“

درد کو محسوس کر رہا تھا۔ اس کے کرب کی آنچ نہایت تیز تھی۔ جابر ہاتھوں نے اسے ایک ایسے شخص کی بیچ پر بٹھا دیا تھا جو کسی طرح اس کے لائق نہیں تھا۔ اسکول میں جیسے ملازم اس کے لیے چائے لاتے تھے۔ وہ ایسے ملازم کے پاؤں دبانے پر مجبور کر دی گئی تھی۔ بہت بڑی ذلت تھی جو وہ سہہ رہی تھی۔ حوا کی مجبور بیٹی کا دکھ سن کر میں لرز گیا۔ وہ کہہ رہی تھی۔

”کبھی میری ماں مجھ سے ملنے آتی ہے تو نذیر اس کے ساتھ بھی بڑی سختی سے پیش آتا ہے۔ کچھ روز پہلے اس نے ششے کا گلاس مار کر میری ماں کا ماتھا زخمی کر دیا تھا۔ شادی کے بعد پہلی بار میں نے اس سے احتجاج کیا۔ وہ سخت آگ بگولا ہو گیا۔ اس روز گنپت لال نے میری ماں کو اپنے گھر بلایا اور اسے دھمکی دی کہ اگر تیری بیٹی نے شوہر کی عزت نہ کی تو تم سب کا انجام برا ہوگا۔ کہنے لگا تیری بیٹی تو ایک قلفی والے سے شادی کرنے لگی تھی۔ چڑا اسی قلفی والے سے تو اچھا ہے۔“ روانی میں زلیخا خود ہی اصل موضوع کی طرف آگئی تھی۔

”ہاں! یہ ولایت کا کیا معاملہ ہے۔“ میں نے پوچھا۔

زلیخا بولی۔ ”انسپکٹر صاحب میں نادان بچی نہیں۔ تھوڑا بہت پڑھی لکھی بھی ہوں۔ برا بھلا سمجھتی ہوں۔ ولایت سے میں نے کبھی شادی کا نہیں سوچا۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ گنپت لال اچاریہ سے بہتر انسان ہے۔ اس نے میری زندگی بچائی ہے۔ انسپکٹر صاحب میں یہ احسان تاحیات فراموش نہیں کر سکتی۔ میرے دل میں اس کی بڑی عزت ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ میں پورے یقین سے کہہ سکتی ہوں انسپکٹر صاحب کہ اس پر چوری کا جو مقدمہ بنا ہے وہ جھوٹا ہے یہ سب گنپت لال اور اس کے آدمیوں کی سازش ہے۔ شاید آپ کو معلوم نہ ہو سیٹھ عزیز اور گنپت لال گہرے دوست ہیں۔“

یہ ایک اہم نقطہ تھا جو میں نے ذہن میں محفوظ کر لیا۔ آخر کے دن بندرہ منٹ میں میں نے لڑکی کو کریدنے کی بہت کوشش کی کہ وہ ولایت علی کے بارے میں کچھ بتا سکے لیکن لگتا تھا کہ اسے اس بارے میں کوئی علم نہیں۔ بہر حال وہ بار بار یہی کہہ رہی تھی کہ سر، ماں اور بھائی کی زندگی بچائی جائے۔

دیکھا جائے تو لڑکی نے مجھ پر اعتماد کر کے ایک بہت بڑا رسک لیا تھا۔ ایک طرف سے اس نے چادر کا پلو جھاڑ کر اپنا سب کچھ مجھے سونپ دیا تھا۔ میں نے پورے خلوص سے اسے یقین دلایا کہ اس پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔ اس کی مصیبتوں کا دور گزر چکا ہے اب جو دن آئے گا پہلے سے اچھا ہوگا۔

لڑکی نے سلسلہ کلام جوڑا۔ ”میں اس شخص سے ملی۔ یہ بڑی مروت سے پیش آیا اور کام کروانے کا وعدہ کیا۔ میں وقفے وقفے سے اس کے پاس آتی جاتی رہی۔ مجھے پتہ ہی نہ چلا کہ وہ مجھ پر بری نظر رکھنے لگا ہے۔ یہ شخص نیتا کے روپ میں ڈاکو ہے۔ انسان کے بھیس میں شیطان ہے انسپکٹر صاحب۔ اس نے مجھے اپنے جال میں اس طرح پھنسا لیا کہ مجھے اپنی بر بادی صاف نظر آنے لگی۔ جب اسے اندازہ ہوا کہ میں اس کے ہاتھ آسانی سے اپنی عزت نہیں گنواؤں گی تو اس نے پینتیرہ بدلا۔

ایک روز اس نے مجھ سے کہا۔ ”زلیخا میں تم سے بیاہ کرنا چاہتا ہوں۔“

میں نے ایک لمحہ سوچے بغیر انکار میں جواب دے دیا۔ وہ حیرت سے میرا منہ دیکھنے لگا۔ اس کا خیال تھا کہ اتنے مشہور و معروف اور امیر کبیر شخص کی پیشکش میں کبھی نہیں ٹھکرا سکوں گی۔ وہ سخت برہم ہوا اور بولا ٹوٹنے میرا دوسرا روپ نہیں دیکھا۔ تجھے ایسی سزا دوں گا کہ ساری عمر یاد رکھے گی۔ میرا شوہر نذیر گنپت لال کی چلمیں بھرا کرتا تھا۔ ایک دفعہ اس نے مجھے کوئی مذاق کیا تھا اور میں نے گنپت لال کے سامنے اسے تھپڑ مارے تھے۔ گنپت لال نے کچھ روز بعد نذیر سے کہا کہ وہ میری ماں سے رشتہ مانگے۔ ایک نائن نذیر کے لیے میرا رشتہ مانگنے ہمارے گھر آئی تو ماں نے اسے سخت برا بھلا کہا۔ صاف ظاہر تھا کہ اس گنپت لال کی شرارت ہے۔ روز آتے جاتے نذیر مجھے تنگ کرتا تھا اور یہ سب گنپت لال کی شہ پر ہو رہا تھا۔

کچھ دن ٹھہر کر انہوں نے پھر رشتہ مانگا میری ماں نے پھر انکار کیا اور اس سے اگلے روز میرے چھوٹے بھائی کو جو اسکول کے ہوسٹل میں رہتا ہے کچھ لوگوں نے اغوا کر لیا۔ ہم نے گنپت لال کے خلاف رپورٹ درج کرانا چاہی لیکن کسی نے رپورٹ درج نہیں کی۔ الٹا ہمیں ڈرایا دھمکایا گیا کہ اتنے بڑے آدمی کے خلاف رپورٹ درج کرا کے ہم مصیبت میں پڑ جائیں گے۔ گنپت لال کے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔

انسپکٹر صاحب! اسی رات ہمیں ایک رقعہ ملا۔ جس میں مجھے لکھا گیا تھا کہ تمہارا بھائی واپس ہوسٹل پہنچ گیا ہے لیکن اگلی دفعہ جب وہ غائب ہوگا تو ہسپتال کے مُردہ خانے سے ملے گا۔ اس رات میں اور میری ماں ایک دوسرے کے گلے لگ کر خوب روئیں۔ اور پھر..... نذیر سے میری شادی ہوگئی۔“

لڑکی نے آخری الفاظ ادا کیے اور منہ پھیر کر پشیمانی کے آنسو بہانے لگی۔ میں اس کے

جوڑ رہا تھا۔ ظاہر ہے کیس میرے پاس منتقل ہونے سے بلراج کی سبکی ہوئی تھی۔ اسے معلوم تھا میں نے ملزم کو ”لاک آپ“ کی بجائے علیحدہ کوٹھری میں سلا یا ہے اور وہاں سے با آسانی اسے نکالا جاسکتا ہے۔ ظاہر ہے ملزم کے غائب ہونے میں میری سخت بدنامی تھی۔ کیونکہ میں نے ہی اس کے ساتھ نرمی کا سلوک کیا تھا..... ذہن پکارا تھا۔ یقیناً..... یہی بات ہے ورنہ خود ملزم تو اس قابل تھا ہی نہیں کہ دیوار توڑ کر فرار ہو جاتا۔ بلراج نے اسے سازش کے تحت فرار کرایا تھا لیکن پھر حالات غیر متوقع طور پر دوسرا رنگ اختیار کر گئے لوگوں نے سمجھا کہ ملزم پولیس تشدد سے ہلاک ہو گیا ہے اور پولیس نے اس کے فرار کا ذرا مہ کیلا ہے۔ ظاہر ہے اس صورت میں مجھ سے زیادہ بلراج تصور وار ٹھہرتا تھا..... کیونکہ ملزم پر تشدد اسی نے کیا تھا۔

میں دریا کے کنارے سب سے الگ ریت پر ٹھل رہا تھا اور ذہن جیسے گھڑ دوڑ کا میدان بنا ہوا تھا۔ واقعات خود بخود ایک دوسرے سے پیوست ہو رہے تھے..... جب افسران بالا کا دباؤ بڑھا اور بلراج کو گردن پھنستی نظر آئی تو اس نے ملزم کو واپس لانے کا فیصلہ کیا۔ ممکن تھا کہ اسے ملزم کے ٹھکانے کا علم ہو..... بلکہ اس بات کا زیادہ امکان تھا کہ وہ بلراج کے کسی یار دوست کی تحویل میں ہو..... وہ ملزم کو واپس لانے یا کہہ لیجے کہ ”برآمد کرنے“ کے لیے تھانے سے روانہ ہوا لیکن قتل ہو گیا۔

بظاہر یہی نظر آتا تھا کہ جب اس نے ملزم کو واپس لانا چاہا تو اس نے اسے گولی مار دی لیکن اس مرحلے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا۔ اگر میرا یہ مفروضہ درست تھا کہ ملزم از خود فرار نہیں ہوا تو پھر اسے بلراج کے سوا اور کون فرار کرا سکتا تھا۔ جہاں تک گنپت لال، سیٹھ عزیز اور نذیر وغیرہ کا تعلق تھا انہیں ولایت کے فرار سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔ میں نے ابھی گنپت لال اور سیٹھ عزیز پر ہاتھ نہیں ڈالا تھا۔ اس وقت مجھے صرف اور صرف ولایت علی کی بازیابی سے کام تھا۔ ہاں میں نے سیٹھ عزیز کی طرح گنپت لال کے مکان پر بھی سفید پٹروں میں پولیس کا ایک آدمی تعینات کر دیا تھا۔ جیسا کہ زلیخا کے بیان سے ظاہر ہو چکا تھا گنپت لال بھی ولایت کو گرفتار کروانے میں شریک تھا۔ اس لیے ممکن تھا کہ فرار کے بعد ملزم ان دونوں کو نقصان پہنچانے کے لیے پہنچتا اور پکڑا جاتا۔

☆=====☆=====☆

ڈی ایس پی سمیت تھانے کا تمام عملہ ڈیوٹی پر تھا۔ جوں جوں رات بیت رہی تھی۔ ہماری بے چینی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ تفتیشی پارٹیاں سرگرمی سے کام کر رہی تھیں۔ پولیس

نذیر عرف نچے کو گرفتار کر کے میں نے ایک کانشیل کو لڑکی کی حفاظت پر چھوڑا اور ایک دوسرے ہیڈ کانشیل کو ہدایت کی کہ لڑکے کے ہوشل پہنچے اور نگران سے اجازت لے کر اسے یہاں بہن کے پاس لے آئے۔ اگر سکول کی انتظامیہ کوئی رکاوٹ ڈالے تو ڈائریکٹ ایس ایس صاحب سے رابطہ قائم کرے۔ اس کے بعد میں نے ملزم نچے کو جیب میں بٹھایا، تھانے لے آیا۔ تھانے پہنچا تو بہت سے اہلکاروں کو بیرونی گیٹ پر کھڑے دیکھا۔ چروں پریشانی منڈلا رہی تھی۔ میں سمجھ گیا کوئی اور گڑبڑ ہوئی ہے۔ جیب رکی ہی تھی کہ ایک کانشیل آیا اور بغیر سیلوٹ کے گلوگیر لہجے میں بولا۔

”بلراج صاحب کو گولی لگ گئی ہے..... کسی نے انہیں قتل کر دیا ہے۔“

ایک لمحے کے لیے میں بھونچکا سا رہ گیا۔ کانشیل نہ جانے کیا کچھ کہہ رہا تھا میرا ذہن ماؤف ہو چکا تھا۔ پھر حواس بجا کر کے میں نے کانشیل کو جیب میں بیٹھنے کا حکم دیا اور ملزم کے کو دو سپاہیوں کے حوالے کر کے موقعہ واردات کی طرف چل دیا۔ راستے میں کانشیل نے کہا کہ بلراج صاحب کی لاش ایک بوری میں بند دریا کے کنارے سے ملی ہے۔ یوں لگتا ہے کہ لوگ لاش کو دریا برد کرنے کے لیے لائے تھے لیکن پھر کسی وجہ سے اسے کنارے کے قریب چھوڑ کر بھاگ گئے۔

کوئی آدھ گھنٹے بعد ہم دریا کے کنارے پہنچ گئے۔ لاش وہیں موجود تھی۔ پولیس اہلکار ضروری کارروائی کر رہے تھے۔ ڈی ایس پی صاحب بھی وہیں موجود تھے۔ میں نے لاش دیکھی اور یقین نہیں آیا کہ چند گھنٹے پہلے مجھ سے باتیں کرنے والا شخص ہمیشہ کے لیے خاموش ہو چکا ہے..... کاش میں اس وقت اسے جانے سے روک لیتا۔ وہ کنارے کی ریت پر چن لیتا تھا۔ گولی اس کے حلق میں لگی تھی اور گردن کے پچھلے حصے تک چلی گئی تھی۔ جسم پر دراز موجود تھی اور اس کی حالت سے اندازہ ہوتا تھا کہ قاتل یا قاتلوں اور مقتول کے درمیان باہمی پائی ہوئی ہے۔

میں اس کی لاش دیکھ رہا تھا اور آنکھوں میں اس سے آخری ملاقات کا منظر گھوم رہا تھا۔ اچانک میرے ذہن میں ایک خیال آیا اور جسم میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔ اس سے پہلے اتنی مصروفیت رہی تھی کہ مجھے سوچنے کا بالکل موقع نہیں ملا تھا۔ بلراج چند گھنٹے پہلے تھانے سے بڑے اعتماد کے ساتھ روانہ ہوا تھا۔ یوں لگتا تھا اس کے ذہن میں کوئی خاص بات ہے جو اسے سیدھی مفروضہ ملزم کے ٹھکانے تک پہنچا دے گی۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ وہ ملزم کے متعلق جانتا ہو..... یا پھر اس نے ملزم کو فرار کرایا ہو۔ ذہن تیزی سے واقعات کی کڑی

آئیں جن میں گنپت لال کی سفارش بھی تھی۔ پھر تھانے میں کاروں کی آمد کا سلسلہ شروع ہوا۔ علاقے کے تین چار نہایت بااثر افراد نے سیٹھ کی ضمانت دینی چاہی لیکن ایس ایس پی صاحب خود تھانے پہنچ چکے تھے۔ انہوں نے اس دباؤ کو خاطر میں لائے بغیر ہمیں تفتیش کا حکم دیا۔ ڈی ایس پی صاحب خود سیٹھ عزیز سے پوچھ گچھ کر رہے تھے۔ صبح ساڑھے آٹھ بجے تک اس نے کچھ نہیں بتایا۔ اب ہمارے پاس صرف دو گھنٹے تھے۔ میں تھانے کے برآمدے میں ٹہل رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ سیٹھ عزیز کو ولایت علی کے فرار سے کیا فائدہ ہو سکتا تھا..... اچانک ذہن میں ایک ایسی بات آئی کہ میں اچھل پڑا۔ تقریباً بھاگتا ہوا میں ایس ایس پی صاحب کے پاس پہنچا۔ بغیر کسی تمہید کے میں نے پوچھا۔

”سرا یہ جلوس جو نکل رہا ہے اس کے پیچھے کس کا ہاتھ ہے؟“

ایس ایس پی چند لمحے مجھے گھورتے رہے پھر بولے۔ ”بھئی کئی لوگ ہیں لیکن..... وہ کیا نام ہے اس کا گنپت اچار یہ..... اسے کچھ زیادہ تکلیف ہو رہی ہے۔“

ایک لمحے میں میرا دماغ جیسے روشنی سے بھر گیا۔ سب کچھ صاف صاف نظر آنے لگا تھا۔ میں بغیر کچھ کہے واپس مڑا اور چند سپاہیوں کو لے کر عطاء صاحب کی جیب کی طرف بڑھا۔

☆=====☆

ٹھیک ڈیڑھ گھنٹے بعد میں جب تھانے جانے والی سڑک کی طرف مڑا۔ ٹریفک پولیس والوں نے بتایا کہ راستہ بند ہے، ایک جلوس تھانے کی طرف گیا ہے۔ میں نے گھڑی کی طرف نگاہ دوڑائی گیارہ بجنے والے تھے۔ ملزم ولایت علی دو سپاہیوں کے درمیان پچھلی نشست پر بیٹھا تھا۔ میں نے جیب کو ایک دوسری سڑک پر ڈالا اور لمبا چکر کاٹ کر تھانے پہنچ گیا۔ اس وقت میں نے دیکھا کہ ایک ہجوم جس کے شرکاء کی تعداد کم از کم چار ہزار ہے تھانے کے قریب پہنچ چکا ہے۔ پولیس والوں نے ہجوم کو قریباً پچاس گز دور روک رکھا تھا۔ مجھے کبھی اس قسم کی صورت حال سے واسطہ نہیں پڑا تھا۔ نہ ہی مجھے معلوم تھا کہ ہجوم سے کس طرح بات کی جاتی ہے۔ پھرے ہوئے لوگوں کو کیسے کنٹرول کیا جاتا ہے لیکن نیک نیتی اور سچائی کا جذبہ تھا جو مجھے سیدھا جلوس کے روبرو لے گیا۔ جیب کے بریک چرچرائے، میں لائٹی بردار پولیس کی دیوار میں راستہ بنا کر آگے بڑھا۔

حسب توقع ہجوم میں سب سے آگے مجھے گنپت لال نظر آیا۔ اس کے گرد پھرے ہوئے نوجوانوں نے گھیرا ڈال رکھا تھا۔ وہ سب نعرے لگا رہے تھے۔ میں نے ڈی ایس پی

انسپکٹر کے قتل نے اس معاملے کو اور بھی سنگین بنا دیا تھا۔ ہمارے پاس صبح ساڑھے دس بجے تک کا وقت تھا۔ پولیس کے مجرموں کی یہ اطلاع بالکل درست ثابت ہوئی تھی کہ علاقے میں صورت حال کشیدہ ہے۔ ایس ایس پی صاحب کی اطلاع کے مطابق کل ساڑھے دس بجے احتجاج کے لیے ایک اور بڑا جلوس نکالا جانے والا تھا۔ اندیشہ تھا کہ پھرے ہوئے لوگ تڑپ پر اتر آئیں گے۔ اگر جلوس کی روانگی سے پہلے پہلے ملزم برآمد ہو جاتا تو اس خطرے کو جاسکتا تھا۔

گھڑی کی ٹک ٹک سارے دلوں کی دھڑکن میں اضافہ کر رہی تھی۔ اس وقت تقریباً ڈھائی بجے تھے جب ڈی ایس پی صاحب نے مجھے اپنے کمرے میں بلایا۔ ان کے پاس ایک اہم اطلاع پہنچی تھی۔ میں اس وقت نذیر عرف نچے سے پوچھ گچھ کر رہا تھا۔ بے حد کھانے کے بعد اس نے بتایا تھا کہ اس کے کہنے پر گنپت لال اچار یہ نے ولایت کو چورہ کے جھوٹے کیس میں پھنسایا تھا لیکن اس کے فرار کے متعلق وہ کچھ نہیں جانتا تھا۔ میں اسے چیختا چلاتا چھوڑ کر ڈی ایس پی صاحب کے کمرے میں پہنچا۔

وہاں وہ پولیس اہلکار موجود تھا جسے میں نے سیٹھ عزیز کی کوٹھی پر لگایا تھا۔ وہ ساہ کپڑوں میں تھا۔ ڈی ایس پی کے کہنے پر اس نے میرے سامنے اپنی رپورٹ دہرائی۔ اس رپورٹ سے پتہ چلا کہ کل سہ پہر کوئی پونے چار بجے انسپٹر بلراج سیٹھ عزیز کے گھر پر تھا۔ پھر چند منٹ بعد وہ دونوں ایک کار میں بیٹھ کر کہیں چلے گئے۔ اس کے ٹھیک ڈیڑھ گھنٹہ بعد بلراج کی لاش ملی۔ پولیس اہلکار اپنی رپورٹ کی اہمیت سے واقف نہیں تھا اس نے سمجھا انسپٹر صاحب معمول کی تفتیش پر آئے ہیں۔ اس لیے اس نے اتنی دیر سے اطلاع دی تھی۔

اس رپورٹ میں یہ نکتہ بہت اہم تھا کہ بلراج پونے چار بجے سیٹھ عزیز کے ہاں پہنچا۔ اس کا مطلب تھا۔ تھانے سے روانہ ہو کر وہ سیدھا سیٹھ عزیز کے پاس گیا۔ اگر میرا اندازہ درست تھا کہ انسپٹر بلراج ملزم کے فرار کا ذمے دار ہے تو پھر سیٹھ عزیز کو بھی اس میں ملوث سمجھا جاسکتا تھا۔ ڈی ایس پی سے مشورے کے بعد میں اسی وقت روانہ ہوا اور جب صبح کی اذانیں ہو رہی تھیں ہم سیٹھ عزیز کو گرفتار کئے تھانے میں داخل ہوئے۔

سیٹھ نے اپنی گرفتاری پر بہت شور مچایا تھا اور مسلسل سنگین نتائج کی دھمکیاں دے رہا تھا۔ ہم نے سیٹھ کی کوٹھی کی اچھی طرح تلاشی لی تھی لیکن ملزم وہاں نہیں تھا۔ سیٹھ کے تھانے پہنچتے ہی وقفے وقفے سے ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ آدھ گھنٹے کے اندر اندر کوئی دس سفارشات

ہوئے کہ لوگ مقامی پولیس سے بدظن ہو گئے اور انہوں نے تھانے کے سامنے احتجاج کیا۔

یہی وہ موقع تھا جب گنپت لال نے ایک تیر سے تیسرے شکار کی ٹھانی۔ وہ مقامی انتظامیہ کو بدنام کرنے کا موقع ہاتھ سے نہیں گنونا چاہتا تھا۔ اس نے لوگوں کو بھڑکایا کہ ولایت علی پولیس تشدد سے مرگیا ہے لیکن اس مقام پر آکر انسپکٹر بلراج اور گنپت لال میں اختلاف پیدا ہو گیا۔ انسپکٹر بلراج کی نوکری خطرے میں تھی اور گنپت لال اپنی سیاست چکار رہا تھا۔ وہ سیٹھ عزیز کو ساتھ لے کر گنپت لال کے گھر گیا اور اسے حوالاتی واپس کرنے کو کہا۔ اس مسئلے پر دونوں میں تلخ کلامی ہوئی جو بعد میں ہاتھ پائی کا رنگ اختیار کر گئی۔ ہاتھ پائی میں انسپکٹر بلراج نے پستول نکالا جس کی گولی اسی کو لگ گئی۔

جب مجھے ایس ایس پی صاحب سے معلوم ہوا کہ اس جلوس کے پیچھے گنپت لال کا ہاتھ ہے تو میں فوراً سمجھ گیا کہ اصل معاملہ کیا ہے۔ میں نے گنپت لال کے گھر چھاپہ مارا اور ولایت علی کو ایک تاریک کمرے سے برآمد کر لیا۔

بعد میں ولایت علی کا کیا ہوا، زلیخا کا کیا بنا۔ اس بارے میں آپ یقیناً جانتا چاہیں گے۔ ملزم نذیر عرف نجا بڑے مجرموں کا ساتھی ثابت ہوا۔ اس پر غبن کا بھی ایک مقدمہ بنا۔ میں نے اس کا چالان تیار کرنے میں کوئی رعایت نہیں برتی۔ مختلف دفعات کے تحت اسے سات سال کی سزا ہوئی۔ دونوں بڑے مجرموں یعنی سیٹھ عزیز اور گنپت لال کو سیشن کورٹ سے موت کی سزا ہوئی جو بعد ازاں ہائی کورٹ نے عمر قید میں تبدیل کر دی۔ زلیخا نے کیس لڑ کر اپنے خاوند سے طلاق بلکہ نجات حاصل کر لی۔ اس کے بعد مجھے ان کے بارے میں کچھ پتہ نہیں چلا۔

ایک دن مقامی ہسپتال سے اطلاع آئی کہ ایک خودکشی کا کیس ہے۔ خودکشی کرنے والی عورت تھی اور اس کا نام زلیخا تھا۔ میرا ماتھا ٹھکا۔ بہر حال میں بیان لینے کے لیے ہسپتال پہنچا۔ بیڈ پر لیٹی ہوئی عورت کو میں فوراً پہچان گیا وہ زلیخا ہی تھی۔ اس کے قریب کھڑا نو جوان ولایت تھا۔ وہ صاف ستھرے کپڑوں میں ملبوس تھا اور خوشی جیسے اس کے چہرے پر پھوٹی پڑ رہی تھی۔ مجھے اس افسوس ناک واقعے پر نو جوان کی خوشی پر حیرت ہوئی۔ وہ مجھے دیکھتے ہی اٹھ کھڑا ہوا اور ایک جانب لے گیا۔ اس نے انتہائی جوش و خروش سے مجھے بتایا کہ زلیخا بچ گئی ہے۔ اور وہ مجھ سے شادی کرنے پر بھی تیار ہو گئی ہے۔

بغیر میرے پوچھے وہ بے ٹکان بولتا چلا گیا۔ اس کی باتوں سے پتہ چلا کہ دو ڈھائی

صاحب سے میگا فون طلب کیا۔ (ان دنوں یہ آلہ نیا نیا آیا تھا) میں نے گنپت لال کا نام پکارا تو ہجوم کی نعرہ زنی ماند پڑ گئی۔ میں نے کہا۔

”گنپت لال، کیا مطالبہ ہے تمہارا۔ کیا چاہتے ہو؟“

گنپت لال نے مجھے گھورا پھر بھڑک کر دو قدم آگے آیا۔ ”آگ لگانا چاہتے ہیں ہم اس ظلم کے گڑھ کو..... جہاں سے بے گناہ جتنا پر ظلم ہوتا ہے۔ اگر ہمارا مطالبہ مان سکتے ہو تو بے گناہ ولایت علی ہمیں دے دو، جسے تم نے اپنے تشدد کی بھینٹ چڑھایا ہے..... خون کیا ہے جس کا۔“ گنپت لال نہایت جذباتی ہو رہا تھا۔ لوگ ایک بار پھر فلک شگاف نعرے لگانے لگے۔

”ظہرو۔“ میں نے چلا کر کہا۔ ”گنپت لال تمہارا مطالبہ ہم پورا کرتے ہیں۔“ میں نے سب انسپکٹر کو اشارہ کیا اور وہ ولایت علی کو تھامے ہجوم کے سامنے آکھڑا ہوا۔ میں نے دیکھا۔ گنپت لال کا چہرہ سیاہ رات کی طرح تاریک ہو گیا ہے۔ وہ پھٹی ہوئی نگاہوں سے ولایت کو دیکھ رہا تھا۔ ہجوم میں ولایت کے کچھ رشتے دار بھی موجود تھے۔ دو آدمی دوڑ کر آگے آئے اور ولایت کو گلے سے لگا لیا۔ میں نے بلند آواز سے پوچھا۔ ”بتاؤ ولایت علی تم کس کی قید میں تھے؟“

ولایت علی کی حالت ٹھیک نہیں تھی۔ اس نے کمزوری آواز میں گنپت لال کا نام لیا۔ ولایت علی کے ایک رشتے دار نے میگا فون اس کے ہاتھ سے لے لیا اور عجیب جوش سے بولا۔ ”بھراؤ! پولس دا کوئی قصور نہیں ہے سارا کم ایس گنپت لال دا ہے.....“

مجمع میں سرگوشیاں ابھریں۔ میں گنپت لال کی طرف دیکھ رہا تھا اچانک وہ لڑکھڑایا۔ پھر چند قدم چلا اور اوندھے منہ لوگوں پر گرا۔ اسے دل کا دورہ پڑ گیا تھا۔ پولیس والے تیزی سے اس کی طرف لپکے لوگوں کے ہجوم میں راستہ بنا کر اسے بمشکل پولیس کی گاڑی تک پہنچا دیا گیا جس وقت گنپت لال ہسپتال روانہ ہو رہا تھا۔ لوگ اس طرح ولایت علی کو دیکھنے کے لیے اندر رہے تھے جیسے وہ مچھلی کے پیٹ سے برآمد ہوا ہو۔

میرا وہ اندازہ درست ثابت ہوا تھا کہ سورگ باشی بلراج نے ہی گنپت لال اور سیٹھ عزیز کے ساتھ مل کر ولایت کو حوالات سے نکلوایا تھا۔ بلراج کے ساتھ دونوں بڑے مجرموں کے گہرے تعلقات تھے۔ اس طرح ان لوگوں نے ایک تیر سے دو شکار کئے تھے۔ بلراج نے مجھ سے بدلہ لینا تھا اور گنپت لال کو وہ شخص مل گیا تھا جسے وہ قتل کرنا چاہتا تھا۔ اسے قتل کر کے چڑا اسی نذیر کی دیرینہ خواہش پوری کرنا چاہتا تھا لیکن پھر حالات بدل

سالوں میں اس نے حیرت انگیز ترقی کی ہے اور آج کل ایک برف خانے میں حصے دار ہے۔ وہ زلیخا سے محبت کرتا تھا اور اس سے شادی کرنا چاہتا تھا لیکن وہ کہتی تھی میں اب کبھی شادی نہیں کروں گی۔ اس طویل کشمکش کا انجام زلیخا کے اقدام خودکشی کی صورت میں ہوا تھا..... لیکن وہ بچ گئی تھی اور ابھی چند منٹ پہلے اس کہانی کا انجام یہ ہوا تھا کہ اس نے ولایت کی بات مان لی تھی۔ میں نے بستر کی طرف دیکھا۔ اس وقت زلیخا کی نیم وا آنکھیں ولایت کی آنکھوں سے ٹکرائیں اور اس کے زرد چہرے پر دھیمی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ میں نے اس خوش و خرم جوڑے کو پریشان کرنا مناسب نہیں سمجھا اور کیس درج کئے بغیر واپس چلا آیا۔

☆=====☆=====☆

برقع اور جرم

ایک عورت کے لیے کڑا امتحان تھا۔ ایک طرف اس کا مجرم بھائی تھا جس کے پسینے پر وہ خون بہانے کو تیار تھی، دوسری طرف اس کا شوہر تھا جسے صرف اپنے فرض سے غرض تھی اور جو اس کے بھائی کو پھانسی کے تختے تک پہنچانا چاہتا تھا۔

دیکھا تھا۔ اسی لڑکے کو دیکھ کر میں تھانے سے جاتے جاتے رک گیا تھا۔ مجھے کوئی ایک ماہ پہلے کی بات یاد آ رہی تھی۔ میری بیوی نے بتایا تھا کہ یہ لڑکا ہمارے مالک مکان کی بیٹی پر نظر رکھتا ہے۔ دراصل اُن دنوں میں کرائے کے مکان میں رہتا تھا۔ مکان کچھ اس طرح کا تھا کہ مالک مکان کا اور ہمارا صحن ایک ہی تھا۔ ایک دوسرے کے گھر میں عام آنا جانا رہتا تھا۔ تعلقات کافی قریبی ہو گئے تھے۔ مالک مکان کی چار بیٹیاں تھیں۔ بڑی لڑکی فرزانہ کی عمر کوئی پندرہ سال رہی ہوگی۔ وہ دسویں یا نویں میں پڑھتی تھی۔

میری بیوی نے بتایا تھا کہ یہ لڑکا فرزانہ کے چکر میں دکھائی دیتا ہے۔ اُن کا گھر چند گھر چھوڑ کر تھا لیکن اتنا اونچا تھا کہ وہاں سے با آسانی ہمارے صحن میں نظر پڑ سکتی تھی۔ میری بیوی کا کہنا تھا کہ لڑکا اکثر چھت پر کھڑا دھرد دیکھتا رہتا ہے۔ گلی میں بھی ہمارے گھر کے سامنے گھومتا ہے۔ بہر حال مجھے اس سلسلے میں تردید کی ضرورت نہیں تھی۔ یہ مالک مکان کا معاملہ تھا اور جب اُس نے مجھ سے کچھ نہیں کہا تھا تو میں اس پھڈے میں ٹانگ کیوں اڑاتا۔ تاہم اب اُس لڑکے کو تھانے میں دیکھ کر میں نے اندازہ لگایا کہ ہونہ ہو یہ اسی لڑکی کا معاملہ ہے۔

تھوڑی ہی دیر میں بات کھل گئی۔ ادھیڑ عمر شخص (جس کا نام شریف تھا) نے بتایا کہ یہ لڑکانائی کی دکان میں اُس کی بھتیجی کے خلاف نازیبا کلمات ادا کر رہا تھا۔ پہلے تو وہ برداشت کرتا رہا پھر اُس نے لڑکے کو منع کیا جس پر مشتعل ہو کر اُس نے اُسٹرا پکڑ لیا اور بے دریغ گھمانے لگا۔ یہ شخص جس بھتیجی کا ذکر کر رہا تھا وہ میرے مالک مکان کی بیٹی ہی تھی۔

لڑکے نے کہا۔ ”تھانیدار صاحب! یہ شخص بات بدل رہا ہے۔ اسے صرف اس بات پر غصہ تھا کہ میں پہلے کیوں ڈاڑھی منڈوانے لگا ہوں۔ باقی ساری باتیں اس نے اپنی طرف سے گھڑی ہیں۔“

میں نے نائی، اُس کے ملازم اور ساتھ آنے والے دو آدمیوں سے پوچھ گچھ کی۔ انہوں نے بھی لڑکے کے بیان کی تصدیق کی۔ انہوں نے کہا کہ جھگڑا باری کا تھا۔ بہر حال مجھے جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ نائی اور اُس کے دونوں گاہک دراصل غفورے کے دوست ہیں۔ اس لیے اُس کی تائید کر رہے ہیں۔ ورنہ اُس سمجھدار شخص کو کیا ضرورت تھی اپنی بھتیجی کے بارے میں ایسی بات اچھالنے کی۔

اسی دوران میرا مالک مکان بھی تھانے پہنچ گیا۔ وہ چھوٹی چھوٹی ڈاڑھی والا ایک دبلا پتلا شخص تھا۔ اُسے سب حاجی کہتے تھے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اُس نے حج نہیں کیا تھا۔ حاجی کا لقب پیدائش کے پہلے روز سے اُس کے ساتھ تھا۔ دراصل وہ حج کے دن پیدا ہوا تھا۔ ماں

حجام کی دکان پر ہونے والی لڑائی عموماً خطرناک ثابت ہوتی ہے۔ یہ بھی ایک ایسی ہی لڑائی تھی۔ ایک نوجوان لڑکا ڈاڑھی منڈوا رہا تھا۔ ساتھ ساتھ وہ اپنے ایک دوست سے باتیں بھی کرتا جا رہا تھا۔ دونوں کے درمیان گفتگو کچھ اس قسم کی ہو رہی تھی کہ بال کنوانے کے انتظار میں بیٹھا ہوا ایک ادھیڑ عمر شخص مشتعل ہو گیا۔ دراصل دونوں نوجوان جس لڑکی کے بارے بات کر رہے تھے وہ اُس ادھیڑ عمر شخص کی کچھ لگتی تھی۔ اُس نے طیش میں آ کر ڈاڑھی منڈوانے والے لڑکے کا گریبان پکڑ لیا اور دو تین تھپڑ لگائے۔ بات بڑھ گئی۔ لڑکا بھی گرمی کھا گیا اُس نے سامنے ٹیبل پر رکھا ہوا اُسٹرا پکڑا اور ادھیڑ عمر شخص پر پل پڑا۔ چھڑانے کی کوشش میں نائی اور اُس کا ایک ملازم زخمی ہو گئے۔ لڑکے نے اُسٹرے کا ایک وار ادھیڑ عمر شخص پر کیا لیکن خوش قسمتی سے اُس نے کوٹ پہن رکھا تھا۔ کندھے پر معمولی زخم آنے کے علاوہ کوئی نقصان نہیں ہوا۔ ہاں بے چارے نائی کی دو انگلیاں کٹ گئیں۔

یہ ایک شہری تھانے کا واقعہ ہے۔ اُن دنوں میں نیا نیا انسپکٹر ہوا تھا۔ سہ پہر کا وقت تھا۔ میں روانگی لکھوا کر ایک تفتیش پر جانے کا ارادہ کر رہی رہا تھا کہ چار پانچ افراد تھانے میں داخل ہوئے۔ اُن کی صورتیں اور پھٹے ہوئے لباس یہ بتانے کے لیے کافی تھے کہ وہ لڑ جھگڑ کر آئے ہیں۔ پہلے تو میں نے سوچا کہ یہ معاملہ سب انسپکٹر کے حوالے کر کے اپنے کام پر چلا جاؤں لیکن پھر مجھے اُن میں ایک ایسی صورت نظر آئی جسے دیکھ کر میں رک گیا۔

میں نے فریقین کی بات سنی۔ لڑکا جس نے اُسٹرا چلایا تھا درزیوں کا کام کرتا تھا۔ شہر کے ایک کاروباری علاقے میں اُس کے باپ کی دکان تھی۔ اُس کا نام غفور تھا۔ لڑکے کا چال چلن کچھ مشکوک تھا۔ صحبت بھی اچھی نہیں تھی۔ میں یہ باتیں اس لیے یقین سے کہہ رہا ہوں کہ یہ لڑکا اسی محلے میں رہتا تھا جہاں میری رہائش تھی۔ میں نے اکثر اُسے گلی کے موڑ پر کھڑے

اسکا تار ہوتا ہے۔

تھوڑی ہی دیر کے بعد غفورے کے وارث بھی پہنچ گئے۔ وہ میری منتیں سمجھیں کرنے لگے۔ میں نے حاجی امین وغیرہ کو بھی بلا لیا۔ لڑکے نے معافی مانگی۔ اُس کے وارثوں نے اُس کے آئندہ چال چلن کی ضمانت دی۔ قصہ مختصر فریقین میں صلح نامہ ہو گیا۔

یہ واقعہ چوتھے یا پانچویں روز کا ہے۔ میں صبح کے وقت اٹھا۔ میری بیوی چارپائی پر نظر نہیں آئی۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ گھبرائی ہوئی اندر داخل ہوئی۔

”کچھ سنا آپ نے؟“ اُس نے ہراساں لہجے میں کہا۔ ”درزیوں کا لڑکا غفورا مر گیا..... اُس کی لاش ملی ہے۔“

”کیا کہہ رہی ہو؟“ میں نے حیرت سے کہا۔

اس دوران ٹکلیل بھی اندر گیا۔ ٹکلیل میری بیوی کا چھوٹا بھائی تھا اور اُن دنوں ہمارے پاس ہی رہتا تھا۔ اُس نے بھی گھبرائے ہوئے انداز میں اس خبر کی تصدیق کی۔ وہ بولا۔ ”میں کالج جانے کے لیے نکلا تھا۔ غفورے کے گھر کے سامنے لوگوں کا ہجوم ہے اور عورتیں بین کر رہی ہیں۔“

اب شبے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ میں نے جلدی جلدی لباس تبدیل کیا اور موقع کی طرف چل دیا۔

☆=====☆=====☆

غفور کی لاش ایک چھوٹے سے کمرے میں پڑی تھی۔ یہ الگ تھلگ کمرہ محلے کے منچلے لڑکوں کی آماجگاہ تھا۔ وہ اکثر رات گئے تک یہاں بیٹھے گپیں ہانکتے اور تاش کھیلتے تھے۔ فرش پر درزی بیٹھی ہوئی تھی کونے میں ایک چارپائی پڑی ہوئی تھی۔ لاش اسی چارپائی پر تھی۔ ایک دو معزز افراد کمرے کے اندر تھے۔ باہر لوگوں کا ہجوم تھا۔ پولیس کو باضابطہ طور پر اطلاع نہیں دی گئی تھی۔ میں نے احتیاط سے موقع کا معائنہ کیا۔ درمی ٹھیک ٹھیک تھی۔ سگریٹوں کے ٹوٹے، خالی پیکٹ، پان کی پچکاریاں جا بجا دکھائی دے رہی تھیں۔ لاش اکڑ چکی تھی اور رنگ سیاہی مائل نکلا تھا۔ ہونٹوں سے خون کی ایک تپلی لیکر نکل کر کان کے اندر چلی گئی تھی۔ بظاہر ایسا لگ رہا تھا کہ متوفی کو زہر دیا گیا ہے۔ میں نے موقع پر موجود افراد سے پوچھ گچھ کی۔ معلوم ہوا کہ یہ کمرہ ”شاہ“ نامی ایک نوجوان کا ہے۔

وہ یہاں شہر میں ملازمت کرتا ہے۔ پچھلے ایک ہفتے سے وہ گاؤں گیا ہوا ہے۔ اُس کی غیر موجودگی میں اُس کے دوست اس کمرے میں محفل جماتے تھے۔ کمرے کی چابی متوفی کے

باپ اُسے ”حاجی“ کہنے لگے۔ اب یہ لقب اتنا پرانا ہو چکا تھا کہ کسی کو اُس کا نام بھی یاد نہیں تھا۔ شہر کے معروف بازار میں اُس کی سلعے سلائے کپڑوں کی دکان تھی۔ کافی کھانا پیتا شخص نہ لیکن ایک کھٹارہ سائیکل پر سفر کرتا تھا۔ فطرتاً وہ خاموش طبع اور امن پسند شخص تھا۔ شاید بینیل کی کثرت نے اُس کے مزاج میں عاجزی پیدا کر دی تھی۔ میں نے اٹھ کر اُس کا استقبال کیا۔ وہ اس مصیبت میں خاصا پریشان دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے علیحدہ کمرے میں اُس سے ار جھگڑے کی بابت پوچھا۔ اُس نے بتایا کہ شریف اُس کا دور کا عزیز ہے اور یہیں قریب رہتا ہے۔ اُس نے جو کچھ کہا ہے درست ہے۔

میں نے کہا۔ ”آپ کا مطلب ہے یہ لڑکا واقعی فرزانہ پر.....“

”ہاں..... ہاں۔“ حاجی امین نے بے چینی سے کہا۔ ”میں ایک دفعہ اُسے سختی سے مڑ بھی کر چکا ہوں لیکن یہ باز نہیں آیا۔ کچھ عرصہ پہلے فرزانہ نے بھی شکایت کی تھی کہ یہ اسکل جاتے وقت اُس کا چپچھا کرتا ہے۔“

حاجی امین یہ بات کہتے کہتے بری طرح لرز رہا تھا۔ شریف آدمی کے دل پر ایسے موقعوں پر جوتی ہے وہی جانتا ہے۔ اُس کا رنگ ہلدی کی طرح زرد ہو رہا تھا۔ میں نے اُسے تسلی دی اور کہا۔ ”حاجی صاحب! آپ بے فکر ہیں۔ اس لڑکے کے کس بل اب میں نکالوں گا۔ یا تو محلہ چھوڑ جائے گا یا انسان کا بچہ بن جائے گا۔“

میں نے حاجی امین اور اُس کے عزیز کو واپس بھیج دیا۔ غفور اور اُس کے دوست جن میں نائی بھی شامل تھا رحم طلب نظروں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ میں نے غفورے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سب انسپکٹر کو کہا کہ اس ”رائنجے“ کو الٹا لٹکا کر ایسی مرلی پھیرو کہ سارے سُر ٹھیک ہو جائیں۔ سب انسپکٹر میرا اشارہ سمجھ رہا تھا۔ اُس نے غفورے کو پکڑا اور برآمدے میں لے گیا۔ یہاں چھت سے ایک رسہ لٹک رہا تھا۔ اُس نے غفورے کو الٹا لٹکایا اور بید کی چھڑی سے شروع ہو گیا۔

ابھی تین چار چیخیں ہی میرے کانوں تک پہنچی تھیں کہ میں باہر آ گیا۔ میں نے بینیل کا نشیمل کو ہاتھ سے رکنے کا اشارہ کیا۔ اٹا لٹکنے سے غفورے کی پنڈلیوں پر سے شلوار کھسک گئی تھی اور وہاں بیدوں کے سرخ نشان نظر آرہے تھے۔ ہیڈ کانسٹیبل چھڑی سونٹے میرے اگلے حکم کا منتظر تھا لیکن میں نے اُسے غفورے کو اتارنے کی ہدایت کی۔ نہ جانے کیوں مجھے اُس ترس آ گیا تھا۔ وہ سترہ اٹھارہ سال عمر کا تھا۔ یہ عمر ہوتی ہی بڑی ظالم ہے۔ ذہن ناچنے جذبات کی فراوانی اور اندھی خواہشیں، یہ سب کچھ مل کر نوجوانوں کو عجیب و غریب حرکات

پاس ہی ہوتی تھی۔ معلوم ہوا کہ کل رات بھی یہاں چار پانچ لڑکے موجود تھے۔

متونی کے والد نے روتے ہوئے کہا۔ ”صبح مجھے اُس کی ماں نے کہا کہ غفور رات بھر گھر نہیں آیا۔ اُس سے پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔ زیادہ سے زیادہ رات نوبے تک گھر آجاتا تھا۔ میں نے پہلے اُس کے چھوٹے بھائی کو بھیجا پھر خود تلاش کرنے نکلا۔ یہاں بیٹھک میں پہنچا تو دروازہ بند تھا لیکن میں نے دباؤ ڈالا تو کھل گیا۔ میرا بیٹا چار پائی پر مردہ پڑا تھا۔ اُس کا آدھا دھڑ چار پائی سے نیچے لٹک رہا تھا۔ میں یہ منظر برداشت نہ کر سکا اور بے ہوش ہو کر دہلیز ہی میں گر گیا۔ ہوش آئی تو دوسرے لوگ جمع ہو چکے تھے۔“

موقع کے معائنے کے دوران ہی میرا سب انسپکٹر سپاہیوں کے ساتھ پہنچ گیا۔ میں نے اُسے ضروری ہدایات دیں اور تھانے چل دیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد سب انسپکٹر متونی کے تین دوستوں کو لے کر تھانے پہنچ گیا۔ یہ تینوں بیس سال سے کم عمر تھے۔ ایک پڑھتا تھا اور دو کام کرتے تھے۔ میں نے اُن تینوں کو ایک ساتھ کھڑا کر کے کہا۔

”دیکھو! میں تم سے علیحدہ علیحدہ سوال کروں گا۔ کوشش کرنا کہ جھوٹ نہ بولو۔ اگر تمہارے جوابات ایک دوسرے سے نہ ملے تو تینوں کو اندر کر دوں گا۔“ لڑکے کم عمر تھے اس لیے کافی خوفزدہ دکھائی دیتے تھے۔ اُن میں سب سے چھوٹا بمشکل پندرہ سولہ سال کا رہا ہوگا۔ میں نے اُسے اپنے کمرے میں چلنے کا اشارہ کیا۔ میں نے کہا۔ ”غفورے کی موت سے قبل تم تینوں اُس کے ساتھ موجود تھے۔ ظاہر ہے تم تینوں میں سے ہی کسی نے اُسے زہر دیا ہے۔ اب اگر تم مجھے صاف صاف بتا دو گے تو میرا کام آسان ہو جائے گا۔ ہو سکتا ہے اس سے تمہاری مشکل بھی آسان ہو جائے۔ دوسری صورت میں قاتل کا پتہ تو مجھے چلانا ہی ہے۔“

لڑکے نے کہا۔ ”تھانیدار صاحب! میرا اس قتل سے کوئی تعلق نہیں۔ جو کچھ مجھے معلوم ہے میں سچ سچ بتا دیتا ہوں۔ میں کل رات ساڑھے سات بجے کے قریب بیٹھک میں گیا تھا۔ یونس اور منظور پہلے سے وہاں موجود تھے۔ تینوں تاش کی بازی لگا رہے تھے۔ میں بھی شریک ہو گیا۔ اس دوران کوئی خاص بات نہیں ہوئی سوائے اس کے کہ غفورے نے ایک دفعہ اٹھ کر پانی پیا۔“

میں نے کہا۔ ”مجھے یہ بتاؤ اُس دوران تم میں سے کسی نے اُسے کوئی چیز کھلائی؟“

لڑکے نے فوراً نفی میں جواب دیا لیکن پھر کچھ سوچ کر بولا۔ ”ہاں..... یاد آیا، یونس ایک دفعہ اٹھ کر گیا تھا اور گلی کے پان والے سے سگریٹ اور پان لے کر آیا تھا۔“

”غفورے نے بھی پان کھایا تھا؟“ میں نے پوچھا۔

”جی ہاں۔“ وہ ہکلا کر بولا۔

”تم کہتے ہو کہ تاش کھیلنے کے دوران دو تین دفعہ اٹھ کر پانی پینے گیا تھا۔ ایسا پان کھانے سے پہلے ہوا تھا یا بعد میں؟“

لڑکا ذہن پر زور دیتا ہوا بولا۔ ”جناب میرا خیال ہے پان کھانے کے بعد ایسا ہوا تھا..... اور ہاں، مجھے لگ رہا تھا کہ کھیل میں بھی اُسے مزہ نہیں آرہا۔“

لڑکے کی آنکھیں حیرت سے پھیل رہی تھیں۔ شاید اُسے بھی یونس کے کردار پر شبہ ہو رہا تھا۔ میں نے ایک دو باتیں کر کے اُس کے شبے کو ابھارا۔ میں نے پوچھا۔ ”کیا اس سے پہلے یونس اور غفورے میں کوئی تنازعہ موجود تھا؟“

لڑکے نے ذہن پر زور دیا لیکن کوئی ایسی بڑی وجہ دریافت نہ کر سکا جو غفورے کے قتل کا سبب بن سکتی تھی۔

میں نے اُس سے کہا۔ ”جو سوال میں اب پوچھ رہا ہوں اُس کا جواب نہایت سوچ سمجھ کر دینا۔ مجھے یہ بتاؤ فرزانہ والے چکر کا غفورے کے قتل سے کوئی تعلق ہو سکتا ہے؟“

لڑکے نے پریشانی سے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور بولا۔ ”مجھے اس بارے میں زیادہ کچھ معلوم نہیں جناب..... لیکن اگر یہ کام یونس کا ہے تو..... یہ کوئی اور ہی چکر ہوگا۔“ میں غور سے لڑکے کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ دفعتاً اُس کے چہرے کا رنگ تبدیل ہو گیا اور آنکھوں میں سخت حیرت دکھائی دینے لگی۔ اُس نے غور سے میری طرف دیکھا پھر بولا۔ ”جناب! مجھے جو کچھ معلوم ہے میں آپ کو بتا دیتا ہوں..... لیکن آپ وعدہ کریں کہ مجھے چھوڑ دیں گے۔“

میں بھانپ چکا تھا کہ لڑکا کسی اہم نتیجے پر پہنچا ہے۔ میں نے اُس کا حوصلہ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”برخوردار! میں کہہ چکا ہوں کہ اگر میرے لیے آسانی پیدا کرو گے تو تمہارے لیے بھی آسانی ہوگی۔ اگر تم بے قصور ہو تو تم پر کوئی آج نہیں آئے گی۔“

لڑکا بولا۔ ”تھانیدار صاحب! ابھی ابھی میرے ذہن میں ایک بات آئی ہے۔ ہو سکتا ہے آپ کی بات درست ہی ہو۔ غفورے کا قتل..... اس لڑکی کی وجہ سے بھی ہو سکتا ہے۔ آپ کو پتہ ہوگا کہ اُس لڑکی کے چچا سے غفورے کا کچھ روز پہلے جھگڑا ہوا تھا۔ اب مجھے یاد آرہا ہے کہ یونس کا اُس شخص کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا ہے۔ پرسوں ہی میں نے اُن دونوں کو اکٹھے سائیکل پر جاتے دیکھا تھا۔ میں نے سوچا بھی تھا کہ یونس سے اُس بارے میں پوچھوں گا لیکن پھر مجھے یاد ہی نہیں رہا۔ اب مجھے یاد آرہا ہے کہ اُس وقت یونس مجھے دیکھ کر گھبرا سا گیا تھا۔ اُس سے پہلے بھی ایک دفعہ میں نے اُن دونوں کو سینما ہال میں دیکھا تھا۔“

میں نے کہا۔ ”تمہارا مطلب ہے کہ یونس اُس شخص کے کہنے پر غفورے کو زہر کھلا سکتا

”انسپکٹر صاحب! میں آپ کو ایک اہم بات بتانا چاہتا ہوں۔ ایسی بات جو فدا حسین اور یونس کو بالکل معلوم نہیں۔“ پھر کچھ دیر سوچ کر بولا۔ ”انسپکٹر صاحب! میں ڈرتا ہوں کہ آپ اس بات پر یقین نہیں کریں گے..... اور ہو سکتا ہے آپ کو مجھ پر غصہ آجائے.....“

میں نے تحسمانہ لہجے میں کہا۔ ”دیکھو لڑکے! میرے پاس پہیلیاں بوجھنے کا وقت نہیں جو کچھ معلوم ہے صاف صاف بتا دو۔ ہو سکتا ہے جو تم بتانے جارہے ہو مجھے پہلے سے معلوم ہو۔“

منظور نے تھوک نگلا اور ڈرامائی لہجے میں بولا۔ ”انسپکٹر صاحب! کل رات مٹنا، غفور سے ملنے آیا تھا۔“

یہ اطلاع میری سماعت کے لیے بم کے دھماکے سے کم نہیں تھی۔ جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا ہے اُن دنوں بیوی کا چھوٹا بھائی یعنی میرا سالا میرے گھر میں رہ رہا تھا اُس کا نام نکلیں تھا لیکن سب مٹنا کہتے تھے۔ اُس نے مقامی کالج میں داخلہ لے رکھا تھا۔ کافی ہونہار لڑکا تھا۔ مجھے اُس میں کبھی کوئی برائی نظر نہیں آئی۔ میری بیوی تو اُس پر جان چھڑکتی تھی۔ یونس بھی اُس کا اکوٹا بھائی تھا۔ میری شادی کو قریباً دو سال ہوئے تھے۔ اُن دو سالوں میں وہ ہمارے پاس ہی رہا تھا۔ مجھے بہنوئی سے زیادہ وہ بڑے بھائی کی طرح سمجھتا تھا اور اسی طرح عزت کرتا تھا..... چند لمحے میں سکتے کے عالم میں بیٹھا رہا۔ پھر میرا ہاتھ بڑھا اور میں نے منظور کا گریبان پکڑ لیا۔ ”کیا جانتے ہو؟“ میں زور سے دھاڑا۔

منظور نے اپنے حواس درست کیے اور بولا۔ ”جناب! میں بالکل سچ کہتا ہوں۔ اگر میری بات جھوٹ نکلے تو جو جی چاہے سزا دیں۔“

میں نے کہا۔ ”کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ غفور کے قتل میں مٹنے کا ہاتھ ہے..... لیکن کیوں۔ وہ کیوں قتل کرنے لگا اُسے؟“

منظور نے خوفزدہ نظروں سے میری طرف دیکھا اور جھجک کر بولا۔ ”انسپکٹر صاحب! وہ..... وہ بھی فرزانہ سے..... محبت کرتا ہے۔“ یہ میرے لیے دوسرا ذہنی جھٹکا تھا۔ میرے گھر کے اندر یہ کھیل ہو رہا تھا اور مجھے معلوم ہی نہیں تھا..... نہیں یقیناً یہ لڑکا جھوٹ بول رہا ہے۔ میں نے اُسے گریبان سے جھنجھوڑا۔

”دیکھو! اگر تمہارے یہ الزامات غلط ثابت ہوئے تو برا حشر ہوگا تمہارا۔“

”جناب! میں آپ کو ثبوت پیش کر سکتا ہوں میرے پاس فرزانہ کے خطوط ہیں جو اُس نے غفور سے کو لکھے تھے اور جن میں مٹنے کا ذکر بھی ہے۔“

میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا لیکن ایک بات یقینی تھی کہ منظور جو کچھ کہہ رہا تھا اُس میں

ہے؟“

لڑکا گڑبڑا کر بولا۔ ”میں یہ نہیں کہہ رہا لیکن..... لیکن ہو سکتا ہے کہ غفور سے کی موت لڑکی کی وجہ سے ہوئی ہو۔“

میری اگلی گفتگو یونس عرف یونی سے ہوئی۔ وہ بھی درزیوں کا کام کرتا تھا۔ غفور سے ساتھ اُس کی دوستی پرانی تھی۔ میں نے شکل و شبابت سے اندازہ لگایا کہ وہ ہوشیار اور گہرا لڑکا ہے۔ اُس نے بھی کم و بیش وہی باتیں دہرائیں۔ اُس نے تسلیم کیا کہ وہ گلی کی دکان سے چار الاچکی سپاری پان لے کر آیا تھا۔ اُس سے فرزانہ کے بارے میں بھی کچھ مزید باتیں معلوم ہوئیں۔ اُس نے بتایا کہ غفور اُس کا دیوانہ تھا، تھانے کی ہوا کھا کر اُس کا عشق کچھ اور بھڑک گیا تھا۔ پچھلے دو تین دن سے وہ بہت زیادہ پریشان تھا اور اس پریشانی کا سبب فرزانہ ہی تھی۔ اُس نے مزید بتایا کہ فرزانہ کے بارے میں اُس کی زیادہ گفتگو منظور سے ہوا کرتی تھی۔ وہ اُس سے فرزانہ کو خط بھی لکھوایا کرتا تھا۔ یونس نے جو ایک نئی بات بتائی وہ یہ تھی کہ فرزانہ نے غفور سے کو خطوط بھی لکھے تھے۔ میں نے یونس عرف یونی پر پولیس والوں کا مخصوص داؤ آزمانے کی کوشش کی۔ میں نے اُسے کہا کہ فدا حسین (اس کے پہلے دوست) نے مجھے بہت کچھ بتا دیا ہے اور اگر وہ ساری بات سچ سچ نہیں بتائے گا تو اُس کا کیس اور خراب ہو جائے گا۔ وہ خوفزدہ ہو کر قسمیں کھانے لگا کہ اُس معاملے میں اُس کا کوئی ہاتھ نہیں ہے۔ میں نے اُسے کہا کہ وہ پچھلے دو تین روز سے فرزانہ کے چچا سے ملاقاتیں کر رہا ہے آخر کیوں؟ وہ پہلے تو گھبرایا پھر بولا۔

”جناب! چاچے شریف سے میری پرانی سلام دعا ہے ہمارے گھر قریب قریب ہی ہیں۔ راہ میں آتے جاتے آنا سامنا ہو جاتا ہے۔“

غرض میں نے اُسے کئی طرح سے گھیرنے کی کوشش کی لیکن وہ میرے ڈھب پر نہیں آیا۔ میں نے اُسے باہر بھیج کر منظور کو اندر بلایا۔ یہ ایک دبلا پتلا نوجوان تھا۔ عمر کوئی اٹھارہ سال رہی ہوگی۔ دونوں رخسار غیر معمولی طور پر ابھرے ہوئے تھے۔ میٹرک پاس تھا اور اب پرائیویٹ امتحان کی تیاری کر رہا تھا۔ اُس نے تسلیم کیا کہ وہ غفور سے کاراز داں تھا اور غفور سے ایک دو بار اُس سے فرزانہ کو خط بھی لکھوائے تھے۔ اُس نے اپنے پہلے دو ساتھیوں کے بیانات کی تصدیق کرتے ہوئے بتایا کہ رات قریباً سات بجے تک وہ تینوں غفور سے کے ساتھ موجود تھے۔ پھر نو ساڑھے نو کے درمیان فدا حسین اور یونس گھروں کو چلے گئے اور وہ غفور کے ساتھ رہا لیکن دس پندرہ منٹ بعد وہ بھی اپنے گھر کو روانہ ہو گیا۔ اُس نے کہا۔

ہو سکتا ہے، مٹا، فرزانہ سے ملاقات میں کامیاب ہو گیا، وہ کامیابی کے لڈو لے کر غفور سے کے پاس آیا ہو۔ میں اس بارے جاننے کے لیے بہت بے چین تھا لیکن صبح ہوئی تو غفور مجھے یہ سب کچھ بتانے کے لیے زندہ نہیں تھا۔“

منظور کی باتیں بظاہر عجیب سی تھیں لیکن مجھے یہ ناقابل یقین اس لیے نہیں لگیں کہ مٹا اور غفور وغیرہ جس عمر سے تعلق رکھتے تھے اس میں ایسی بے وقوفیاں عام سرزد ہوتی ہیں۔ اوائل شباب میں کسی پر عشق کا بھوت سوار ہو جائے تو بڑی مضحکہ خیز حرکات دیکھنے میں آتی ہیں..... لیکن یہاں جو حرکت سرزد ہوئی تھی وہ مضحکہ خیز نہیں، نہایت سنگین تھی۔ ایک نوجوان ہلاک ہو چکا تھا اور مجھے اُس کی موت کا سبب ڈھونڈنا تھا۔ اگر اُسے کسی نے قتل کیا تھا تو قاتل کی تلاش ضروری تھی۔ یہ سوچ کر میں لرز گیا کہ اس قتل کا ذمے دار اگر واقعی مٹا ہوا تو؟

ابتدائی تفتیش اور رپورٹ کے بعد لاش پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوا دی گئی۔ دوپہر کے وقت میں تھانے سے گھر پہنچا۔ مٹا گھر ہی میں تھا۔ وہ چار پائی پر بیٹھا کھانا کھا رہا تھا اور میری بیوی دوپٹے کا پلو ہلا ہلا کر کھیاں دور ہٹا رہی تھی۔ میرے تیور دیکھ کر وہ کچھ چونکا اور لقمہ اُس کے حلق میں اٹکنے لگا۔

”بسم اللہ بسم اللہ“ میری بیوی نے جلدی سے پانی کا گلاس اُس کی طرف بڑھایا۔ اُس نے پانی کے دو گھونٹ بھرے اور سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔ میری بیوی بھی اب میرا چہرہ تک رہی تھی۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ میرے سامنے بیٹھا ہوا یہ لڑکا قاتل ہے..... لیکن حالات کی انگلی دھیرے دھیرے جس شخص کی طرف اٹھ رہی تھی وہ یہی تھا۔ میں نے گھمبیر لہجے میں اُسے کہا کہ وہ کھانا کھا کر فوراً میرے کمرے میں آئے۔

اپنے کمرے میں پہنچ کر میں بے چینی سے ٹپٹنے لگا۔ ذرا دیر بعد میری بیوی اندر داخل ہوئی۔ وہ کچھ ڈری ہوئی تھی۔ کہنے لگی۔ ”کیا بات ہے۔ آپ کچھ غصے میں ہیں۔ مٹے سے کوئی غلطی ہوئی ہے۔“

میں نے کہا۔ ”تم باہر جاؤ اور اسے میرے پاس بھیجو۔ ابھی تمہیں سب کچھ پتہ چل جائے گا۔“ بیوی میرے لہجے پر اور بھی ڈر گئی۔ اس دوران مٹا کپڑے سے ہاتھ پونچھتا اندر آ گیا۔ میں نے بیوی کو باہر بھیج کر دروازہ بند کر لیا۔ جب وہ میری ہدایت پر چار پائی پر بیٹھ گیا تو میں نے کہا۔ ”کل رات ساڑھے نو اور گیا رہ بجے کے درمیان تو کہاں تھا؟“

اُس کا چہرہ تاریک ہو گیا۔ ہکلا کر بولا۔ ”میں اپنے کمرے میں پڑھ رہا تھا۔“
”بکواس بند کر۔“ میں دھاڑا۔ ”تو اپنے کمرے میں پڑھ نہیں رہا تھا بلکہ شاہ کی بیٹھک

کچھ نہ کچھ حقیقت ضرور تھی۔ میں نے اُس کا گریبان چھوڑتے ہوئے خود پر قابو پایا اور اُسے اپنے الزامات کی وضاحت کرنے کو کہا۔ اُس نے کہا۔

”جناب! یہ چکر کوئی ایک سال سے چل رہا ہے۔ پہلے مٹے اور فرزانہ کا چکر شروع ہوا۔ یہ دونوں کافی عرصہ چپکے چپکے ایک دوسرے کو خط لکھتے رہے۔ پھر غفور ابھی فرزانہ سے دل لگا بیٹھا۔ مٹا شروع شروع میں ذرا خاموش طبع اور شرمیلا تھا۔ اُس کے مقابلے میں غفور ذرا تیز طرار اور بے باک تھا۔ دونوں جانتے تھے کہ وہ ایک ہی لڑکی سے محبت کر رہے ہیں اور وہ اُن دونوں کو دھوکا دے رہی ہے اُس کے باوجود دونوں مجبور تھے۔ جہاں تک فرزانہ کا تعلق ہے وہ دونوں کی محبت کا جواب محبت سے دے رہی تھی لیکن ملتی کسی سے بھی نہیں تھی۔ اپنے خطوں میں اُس نے غفور کے کی حوصلہ افزائی کی ہے اور ظاہر ہے مٹے کی بھی کی ہوگی۔ دونوں اُس کے عشق میں دیوانے تھے۔“

جہاں تک میں جانتا ہوں مٹے کو یہ بات بالکل پسند نہیں تھی کہ فرزانہ اُس کے ساتھ ساتھ غفور سے بھی تعلق رکھے۔ کوئی ایک ماہ پہلے وہ غفور سے ملا بھی تھا۔ دونوں نے اس معاملے میں کھل کر بات کی تھی۔ اس ملاقات کے بعد وہ اکثر ایک دوسرے سے ملنے آتے۔ میں نے دو تین بار انہیں اکٹھے دیکھا لیکن کبھی مجھے یہ محسوس نہیں ہوا کہ وہ ایک دوسرے کے دشمن یا رقیب ہیں..... کل رات بھی مٹا غفور سے ملنے آ رہا تھا۔ غفور نے مجھے بتایا تھا کہ وہ کوئی اہم بات کرنا چاہتا ہے۔ میں نے غفور سے کہا تھا کہ میں تمہارے ساتھ رہتا ہوں لیکن وہ کہنے لگا کہ نہیں ہم تنہائی میں بات کرنا چاہتے ہیں۔ ویسے بھی مٹا پسند نہیں کرتا تھا کہ اُن دونوں کی گفتگو میں کوئی تیسرا شخص شریک ہو۔ میں نے غفور کو محتاط رہنے کا مشورہ دیا اور ساڑھے نو بجے کے قریب بیٹھک سے گھر چلا آیا۔ اُس کے بعد کیا پیش آیا، مجھے کچھ معلوم نہیں۔“

میں نے کہا۔ ”تمہارے خیال میں وہ کیا بات ہو سکتی ہے جو مٹا اُس سے کرنا چاہتا تھا۔“
منظور نے تھوڑی دیر توقف کیا پھر بولا۔ ”انسپکٹر صاحب! وہ تینوں..... میرا مطلب ہے غفور، مٹا اور فرزانہ عجیب و غریب حرکتیں کرتے رہتے تھے۔ پچھلے دنوں مجھے غفور نے بتایا تھا کہ کشمکش کا فیصلہ ہونے والا ہے۔ میں نے پوچھا کہ کون سی کشمکش کا کیا فیصلہ ہونے والا ہے۔ غفور نے بتایا کہ اگلے ہفتے فرزانہ ہم دونوں میں سے کسی ایک کو گھر سے باہر ملے گی۔ جو بھی اُس سے ملاقات کرنے میں کامیاب ہو وہ دوسرے کو لڈو کھلائے گا اور لڈو کھلانے والا ہمیشہ کے لیے فرزانہ کے راستے سے ہٹ جائے گا۔ میرا خیال ہے کہ یہ کوئی ایسا ہی معاملہ تھا۔“

میں غفورے کے پاس تھا۔“

”یہ..... یہ غلط ہے بھائی صاحب۔“ میرا ایک زوردار تھپڑ اُس کے منہ پر پڑا اور وہ چکرا کر رہ گیا۔ میں نے غصے سے کہا۔

”اور یہ بھی غلط ہے کہ تُو نے حاجی صاحب کی لڑکی سے یارا نہ لگا رکھا ہے..... اور یہ بھی غلط ہے کہ تُو اسے خط لکھتا ہے اور ملاقاتیں کرتا ہے..... دیکھ مجھے ٹھیک ٹھیک بتا دے کل رات تُو کہاں تھا اور کیا گل کھلایا ہے۔“

وہ قدرے تیزی سے بولا۔ ”تُو آپ کا خیال ہے کہ غفورے کو میں نے مارا ہے۔ جیراگی ہے آپ اتنی آسانی سے مجھ پر یہ الزام لگا رہے ہیں۔“

میں نے چلا کر کہا۔ ”اگر یہ الزام ہے تو بتا کل رات کہاں تھا تُو۔ میں نے خود ان آنکھوں سے تجھے کمرے سے نکلتے دیکھا تھا۔“

”میں صرف ایک بار پیشاب کرنے باہر نکلا تھا۔“

”پھر وہی جھوٹ۔“ مجھے طیش آگیا۔ میں نے اُس پر تھپڑوں اور کھوں کی بارش کر دی۔ اس دوران میری بیوی دروازہ پٹینے لگی۔ میں نے دروازہ کھولا۔ وہ ”ہائے میرا لال“ کہتی ہوئی بھائی سے لپٹ گئی۔ میں نے کہا۔ ”اسے اچھی طرح گلے سے لگا کر چوم چاٹ لے۔ ہو سکتا ہے کل تک یہ سلاخوں کے پیچھے چلا جائے۔“

”کیوں کیا کیا ہے اس نے؟“ وہ ڈر کر بولی۔

”اللہ کرے اس نے کچھ نہ کیا ہو..... لیکن مجھے ایسا لگتا نہیں۔“ میں یہ کہتا ہوا تیز قدموں سے باہر نکل گیا۔

تھانے میں پہنچ کر میں نے اپنا کمرہ بند کیا اور نہایت پریشانی کے عالم میں سوچ بچار کرنے لگا۔ حالات و واقعات سے ظاہر ہوتا تھا کہ تفتیش صرف تین راستوں پر چل سکتی ہے۔ پہلا راستہ اس واقعے سے نکلتا ہے جو چند روز پہلے نائی کی دکان پر پیش آیا تھا جس میں غفور نے اُسترے کے وار سے شریف نامی شخص کو زخمی کیا تھا۔ دوسرا راستہ خود میرے اپنے گھر سے شروع ہوتا تھا اور اگر یہ راستہ درست تھا تو اس کے دوسرے سرے پر میں اپنے سالے کو پھانسی کے تختے پر لٹکتا ہوا دیکھ سکتا تھا۔ تیسری صورت یہ ہو سکتی تھی کہ متوفی نے کسی واقعے سے دل برداشتہ ہو کر خودکشی کی ہو، لیکن اس کا فیصلہ پوسٹ مارٹم رپورٹ اور دوسری شہادتوں کے بعد ہی ہو سکتا تھا۔

غیر ارادی طور پر میرا دل چاہ رہا تھا کہ تفتیش کا پہلا راستہ ہی درست ثابت ہو اور میں

اُس طوفان سے بچ جاؤں جو میرے گھر کے دروازے پر دستک دے رہا تھا..... لیکن ایسا ہوا نہیں۔ اوپر تلے ایسے واقعات ہوئے جنہوں نے میرے گھر کا سکون درہم برہم کر دیا۔

موجودہ حالات میں فرزانہ سے پوچھ گچھ ضروری ہو چکی تھی۔ اگلے روز میں نے اُس کے باپ کو بلایا اور تمام صورت حال سے آگاہ کیا۔ وہ بھلا مانس شخص پیش آنے والے حالات کے تصور سے تھر تھرا کانپ رہا تھا۔ میں نے حتی المقدور اُس کی ڈھارس بندھائی اور اپنے پورے تعاون کا یقین دلایا۔ تھوڑی دیر بعد فرزانہ میرے کمرے میں بیٹھی تھی۔ وہ کافی پُرکشش اور شوخ لڑکی تھی لیکن اُس وقت بے حد سہمی ہوئی تھی۔ چہرے پر نیل پڑے ہوئے تھے لگتا تھا باپ نے اسے میرے پاس بھیجنے سے پہلے بری طرح پیٹا ہے۔ وہ مجھے چچا کہہ کر بلاتی تھی۔ میں نے بڑے پیار محبت سے اُس کا خوف دور کیا اور دھیرے دھیرے اسے بولنے کے لیے تیار کر لیا۔ مشکل میں اُس کو ڈھارس بندھانے والا ملا تو وہ زار و قطار رونے لگی۔ میں آہستہ آہستہ اس کے سر پر ہاتھ پھیرتا رہا۔

کچھ بھی تھا وہ ایک نیم پختہ ذہن کی بچی تھی۔ اُس سے غلطیاں ہوئی تھیں اور نہایت سنگین ہوئی تھیں، لیکن اس میں جہاں وہ قصور وار تھی وہاں اُس کے ارد گرد کا ماحول اور والدین بھی قصور وار تھے۔ اُس کا باپ صبح کا گیا رات گئے گھر آتا تھا، ماں کو گھومنے پھرنے سے فرصت نہیں تھی۔ نہ مناسب روک ٹوک اور نہ ضروری آزادی۔ ایسے میں کچا ذہن ادھر ادھر نہیں بھٹکے گا تو کیا ہوگا۔ بہر حال میں نے لڑکی کا ہمدرد بن کر اُس کے دل کی بات جاننے کی کوشش کی۔ پہلے تو وہ جھجکتی رہی لیکن جب میں نے اُسے اپنی معلومات سے آگاہ کیا تو وہ آہستہ آہستہ ذہن کی گرہیں کھولنے لگی۔ اُس کی طویل گفتگو کا لب لباب یہ ہے۔

منظور کی کہی ہوئی زیادہ تر باتیں درست تھیں۔ لڑکی مَنے اور غفورے دونوں کی حوصلہ افزائی کر رہی تھی۔ یہ سب کچھ اُس نے شغل کے طور پر شروع کیا تھا لیکن آہستہ آہستہ معاملہ سنجیدہ ہوتا گیا تھا۔ وہ دونوں اُسے اپنی طرف راغب کرنے کی کوشش میں لگے رہتے تھے۔ پچھلے چند دنوں سے یہ دوڑ اور بھی شدید ہو گئی تھی۔ مَنے اور غفور نے اسے کئی خط لکھے تھے جن میں اسے گھر سے باہر ملنے کی درخواست کی گئی تھی۔ فرزانہ یہ سمجھتی تھی کہ اب وہ مرحلہ آگیا ہے جہاں اسے دونوں ”دوستوں“ میں سے ایک کا انتخاب کر لینا چاہیے۔ کئی روز فیصلے کی سؤلی پر لٹکے کے بعد اُس نے دو دن پیشتر مَنے سے ملاقات کی تھی۔ یہ ملاقات ایک معروف تاریخی گرجا میں ہوئی تھی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ لڑکی کو اس معاہدے کا کوئی علم نہیں تھا جس میں دونوں لڑکوں نے اپنے طور پر فیصلہ کیا تھا کہ جو فرزانہ سے ملنے میں کامیاب ہو وہ اس کھیل کا

تباہ کھلاڑی تسلیم ہوگا۔

فرزانہ سے پوچھ گچھ کے بعد مئے کے متعلق میرے شبہات کو تقویت ملی..... ذہن تھوڑا سا زور ڈالا تو بہت سی کڑیاں آپس میں مربوط ہونے لگیں۔ اگر فرزانہ چند روز پہلے سے ملی تھی تو منظور کا لگایا ہوا اندازہ درست ثابت ہوتا تھا۔ فرزانہ سے ملنے کے بعد مئے رات غفور سے ملا تھا..... وہ شرط جیت گیا تھا اور شرط کے مطابق اُس کے پاس لڈوؤں کا لفافہ تھا لیکن یہ لڈو دراصل قتل کے ہتھیار تھے۔ مئے نے زہریلے لڈو کھلا کر غفور سے کومر کے گھاٹ اتار دیا تھا لیکن یہاں سوچنے کی بات تھی اگر مئے شرط جیت گیا تھا تو پھر زہریلے لڈو کھلانے کی کیا ضرورت تھی۔ اُس کے راستے کی رکاوٹ تو خود بخود دور ہو رہی تھی۔ غفور ان دونوں کے درمیان سے نکل رہا تھا۔

پھر ایک اور خیال میرے ذہن میں آیا اور امید کی ایک روشن کرن دکھائی دی۔ اگر اس کھیل میں کامیاب رہا تھا تو زیادہ امکان اس بات کا تھا کہ غفور نے دل برداشتہ خودکشی کی کوشش کی ہو..... میں نے اس پہلو سے غور کیا تو گتھی سلجھی ہوئی محسوس ہوئی۔ یقیناً خودکشی کا مرتکب ہوا تھا۔ مئے نے اُسے اپنی کامیابی کی اطلاع دی تھی اور یہ اطلاع اُس کی تمام امیدوں پر پانی پھیر گئی تھی۔ مئے کے جانے کے بعد وہ گھر نہیں گیا تھا۔ اُس بیٹھک کا دروازہ بند کر کے زہر کھایا تھا اور وہیں چارپائی پر لیٹ رہا تھا۔

اُسی روز شام کے وقت پوسٹ مارٹم رپورٹ بھی آگئی۔ رپورٹ میں موت کی وجہ خورانی بتائی گئی تھی۔ زہر رات دس اور گیارہ کے درمیان دیا گیا تھا۔ موت کوئی بارہ بجے ہو تھی۔ معدے سے ملنے والے مواد میں پان، لڈو اور چائے کے اجزاء موجود تھے۔ میری سابقہ معلومات کی روشنی میں یہ بات ثابت ہو جاتی تھی کہ مئے رات متونی سے ملا تھا۔ اُس نے اسے لڈو کھلائے تھے۔ کیمیکل ایگزامینر کی رپورٹ یہ بات بتانے سے قاصر نظر آئی تھی کہ متونی کے معدے اور انتڑیوں میں پایا جانے والا زہر کس چیز میں ملا کر کھلایا گیا تھا۔

☆=====☆

میں چونکہ خودکشی کی لائن پر سوچ رہا تھا اس لیے میں نے اگلے روز غفور کے دوستوں اور ملنے جلنے والوں سے ملاقات کی اور مذکورہ شک ذہن میں رکھتے ہوئے ان سے سوالات کیے۔ اس مغز کھپائی سے پتہ چلا کہ غفور اُس سے پہلے بھی خودکشی کی ایک کوشش کر چکا تھا۔ یہ واقعہ جس طرح میرے کانوں تک پہنچا میں من و عن آپ کو بتا دیتا ہوں۔ پتہ چلا کہ کچھ عرصہ پہلے غفور نے اپنے بڑے بھائی کی بیوی سے ناجائز تعلقات

قائم کرنے کی کوشش کی تھی۔ اُس کا بڑا بھائی دوسرے شہر میں کام کرتا تھا۔ اس کی غیر موجودگی میں یہ شاخسانہ شروع ہو گیا۔ ایک رات غفور نے مبینہ طور پر گھر کے تمام افراد کو کوئی نشہ آور چیز پلا دی۔ رات گئے جب وہ بری نیت سے بھائی کی بیوی کے پاس پہنچا تو اُس نے غفور کو بری طرح پیٹ ڈالا۔ شور سن کر گھر کے کچھ افراد بھی جاگ گئے۔ اس واقعے کی خبر گھر سے باہر بھی نکلنے لگی اور محلے میں خوب چرچا ہوا تھا۔ غفور نے کوسخت سرزنش کا سامنا کرنا پڑا۔ یقیناً اسی واقعہ سے متاثر ہو کر اس نے خودکشی کی کوشش کی تھی۔ اُس نے نیلا تھوٹھا کھلایا تھا لیکن بروقت طبی امداد سے جان بچ گئی۔ اس شہادت سے دو باتیں سامنے آئیں۔ غفور اڈھیلے کردار کا لڑکا تھا اور اس سے پہلے بھی اُس نے خودکشی کی کوشش کی تھی۔

میں نے مئے سے ایک بار پھر تفصیلی بات چیت کی۔ اُس روز میں نے اُسے تھانے ہی بلالیا۔ وہ اب تک سخت خوفزدہ تھا۔ ایک روز پہلے اُس نے اپنی بہن کے سامنے اعتراف کر لیا تھا کہ وہ رات کو غفور کے پاس گیا تھا اور اسے لڈو بھی کھلائے تھے لیکن اس سے زیادہ اُس نے کچھ نہیں کہا تھا۔ اُس کی بہن یعنی میری بیوی بھی بڑی بڑی قسمیں کھا رہی تھی کہ اُس کا بھائی ایسا نہیں ہو سکتا۔ میں نے مئے سے کہا کہ اگر غفور کی ہلاکت میں اُس کا ہاتھ نہیں تو پھر اُس کی موت کی کیا وجہ ہو سکتی ہے۔ مئے نے جو جواب دیا وہ میری توقع کے عین مطابق تھا اور اُس سے میری کافی تسلی بھی ہوئی۔ اُس نے کہا۔

”بھائی صاحب! میں سوچتا ہوں اُس نے خودکشی کی ہے۔ مجھ سے ملنے کے بعد وہ سخت پریشان ہو گیا تھا۔ اُس وقت مجھے امید نہیں تھی کہ وہ اپنی جان لینے کی کوشش کرے گا۔ کاش مجھے اُس وقت اُس کے ارادے کا علم ہو جاتا۔“ مئے نے یہ بھی بتایا کہ اُس کے آنے کے بعد غفور بیٹھک ہی میں رہا تھا اور اُس نے اندر سے کنڈی لگالی تھی۔

بہر حال غفور کی ہلاکت کے بعد چوتھے دن کی شام تک میں اس نتیجے پر پہنچ چکا تھا کہ یہ خودکشی کا کیس ہے لیکن پھر جیسا کہ میں نے بتایا ہے، اوپر تلے چند واقعات ایسے ہوئے جنہوں نے میری تفتیش کی عمارت دھڑام سے نیچے گرا دی اور ایک بار پھر میری نظریں مئے پر جم گئیں۔ اُس روز شام کے وقت تھانے کے پتے پر ایک خط موصول ہوا۔ پتے کے ساتھ میرا نام بھی لکھا ہوا تھا۔ میں نے لفافہ چاک کیا۔ یہ ایک گمنام خط تھا، لیکن مفصل اور حیرت انگیز حد تک مدلل۔ لکھنے والے نے اپنے خیالات نہایت مؤثر طریقے سے بیان کیے تھے۔ مضمون کچھ یوں تھا۔

”انسپکٹر صاحب! غفور کو قتل کیا گیا ہے۔ قاتل آپ کے گھر میں ہے۔“

میں آپ کو اس بات کا ثبوت فراہم کر سکتی ہوں۔ بدھ کی دو چہرے یعنی غفور سے قتل سے ایک روز پہلے ایک برقعہ پوش عورت شہر سے باہر کچی آبادی میں پہنچی تھی۔ وہاں ”راول“ نامی ایک جوگی سے اُس نے زہر خریدا تھا۔ یہ برقعہ پوش دراصل آپ کا برادر نسبتی شکیل عرف مُنا تھا۔ اُس نے جو زہر خریدا تھا اُس کا کچھ حصہ اب بھی اُس کے پاس موجود ہے۔ اگر آپ کوشش کریں گے تو مُنے کے سائیکل کی گدی کے نیچے ایک چھوٹی سی پڑیا آپ کو مل جائے گی لیکن ہو سکتا ہے وہ پڑیا آپ کو نہ ملے۔ میں ایک دوسرا ثبوت فراہم کرتی ہوں۔ وہی برقعہ پوش عورت آپ کے محلے میں مختار نامی حلوائی کے پاس بھی گئی تھی۔ اُس نے کہا تھا کہ اُسے لڈو چاہئیں۔ حلوائی کے پاس بوندی کے سخت لڈو تھے۔ اس عورت نے کہا تھا کہ اسے موتی پُور کے نرم لڈو چاہئیں۔ حلوائی نے کہا تھا کہ وہ موتی پُور لڈو نہیں بناتا لیکن موتی بوندی کے تازہ لڈو بننے والے ہیں۔ عورت تازہ لڈوؤں کے انتظار میں آدھ گھنٹہ دکان پر کھڑی رہی تھی۔ تازہ لڈو نرم ہوتے ہیں اور توڑ کر با آسانی بنائے جاسکتے ہیں۔ آپ میری بات سمجھ رہے ہوں گے۔ ایک تیسرا ثبوت اب میں آپ کو فراہم کرتی ہوں اور آپ اسے جھٹلا نہیں سکیں گے۔ آپ ایک ذہین پولیس والے ہیں لیکن یہ بات آپ کی سمجھ میں نہیں آئی۔ ظاہر ہے آپ کا برادر نسبتی دو یا تین لڈو لے کر تو مقتول کے پاس نہیں گیا تھا۔ اس کے پاس کم از کم ایک آدھ سیر لڈو ہوں گے۔ مقتول نے تمام لڈو تو نہیں کھائے ہوں گے۔ پھر باقی لڈو کدھر گئے۔ جی ہاں..... وہ لڈو موقع سے اٹھا لیے گئے تھے اس لیے کہ وہ زہر پیلے تھے۔ اب آپ سوچ رہے ہوں گے وہ لڈو کہاں ہیں۔ میں آپ کو بتاتی ہوں..... آپ کے گھر کے پچھواڑے کوڑے سے بھرا ہوا ایک چھوٹا سا گڑھا ہے۔ یہ لڈو لفافے میں بند اسی کوڑے میں پڑے ہیں۔ اب ایک ایسا ثبوت آپ کو فراہم کرتی ہوں جو اس قتل کا معہ صاف صاف حل کر دے گا۔ محلہ ”سادھو نگر“ میں ایک دوائیوں کی دکان ہے ڈاکٹر مہتا وہاں بیٹھتے ہیں۔ قتل کی رات وہ آپ کے محلے میں ایک مریض کو دیکھ کر سائیکل پر سوار واپس جا رہے تھے۔ انہوں نے شکیل عرف مُنے کو دیکھا۔ وہ ایک گلی سے نکلا اور گھبراہٹ میں ان کی سائیکل سے آنکرا یا۔ ڈاکٹر مہتا سے ایک دو بار اس نے دوائی لی تھی۔ وہ اسے پہچان گئے۔ انہوں نے اس سے پریشانی کی وجہ پوچھی وہ کچھ نہ بتا سکا۔ اس کے ہاتھ میں وہی لفافہ تھا جو

اس وقت آپ کے گھر کے پچھواڑے پڑا ہے اور جس میں سے اس نے غفور کو زہر پیلے لڈو کھائے تھے۔ سائیکل سے نکلنے کے بعد یہ لڈو گر گئے تھے اور ڈاکٹر مہتا نے اپنے ہاتھوں سے دوبارہ لفافے میں ڈالے تھے۔ وہ اس لفافے اور ان لڈوؤں کو با آسانی پہچان سکتے ہیں۔ میرے خیال میں یہ شہادتیں جرم کو بے نقاب کرنے کے لیے کافی ہوں گی۔

آپ سوچتے ہوں گے میں کون ہوں اور مجھے یہ سب باتیں کیسے معلوم ہیں۔ آپ یہ بھی سوچتے ہوں کہ میں یہ سب کچھ مُنے کو پھنسنوانے کے لیے کسی کی ایما پر لکھ رہی ہوں۔ یقین جانیے میں نے جو کچھ لکھا ہے اپنی مرضی سے لکھا ہے۔ آپ کے ذہن میں اٹھنے والے پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ مُنے سے میرا قریبی تعلق رہا ہے..... اور میں ایک مظلوم لڑکی ہوں اور یہی مظلومیت میرے قلم اٹھانے کا سبب بنی ہے۔“

یہ خط ایک دھماکے سے کم نہیں تھا۔ میں فوراً اٹھانے سے خط اور خط کے الزامات کی تصدیق کے لیے چل دیا۔ مختصر اُسب سے پہلے میں کچی آبادی میں پہنچا۔ وہاں سے حلوائی مختار کی دکان پر آیا اور وہاں سے اپنے گھر کا پچھواڑہ دیکھا۔ تینوں اطلاعات بالترتیب درست ثابت ہوئیں۔ یقیناً جو بھی اطلاع بھی درست تھی۔ مُنے کی سائیکل کی گدی کے نیچے ایک پڑیا موجود تھی لیکن وہ پھٹ گئی تھی اور اسپرنگوں میں کاغذ کا ایک ٹکڑا اٹکا رہ گیا تھا۔ آخری ثبوت کے لیے میں قریبی محلے سادھو نگر گیا۔ ڈاکٹر مہتا کچھ پڑی ڈاڑھی والا ایک شریف النفس سکھ تھا۔ وہ محض ایک کمپاؤنڈر تھا مگر خاصا قابلِ معالج تھا۔ اس لیے گاؤں والے اسے ڈاکٹر ہی کہتے تھے۔ میں نے اسے کوڑے سے برآمد ہونے والا لفافہ دکھایا اور تفصیلی گفتگو کی۔ جب میں اس کی دکان سے نکلا میرے ذہن سے مُنے کے قاتل نہ ہونے کا ہر شبہ دور ہو چکا تھا۔

تھانے آکر میں بے دم سا ہو کر کرسی پر گر گیا۔ میرا سب انسپکٹر میری ہدایات کے مطابق غفور سے کے تمام خطوط جمع کر چکا تھا۔ ان میں سے کچھ خطوط منظور کے پاس تھے اور کچھ اس کے اپنے سامان میں۔ میں خالی خالی نظروں سے یہ خطوط دیکھتا رہا۔ آخر میں ایک ایسا خط نظر سے گزرا جس سے یہ بات مزید یقینی ہو گئی کہ غفور نے خود کشی نہیں کی۔ یہ خط غفور نے اپنی موت کے روز صبح کے وقت لکھا تھا۔ یہ خط اس کی اپنی لکھائی میں تھا۔ غفور خود بھی لکھ سکتا تھا لیکن شکستہ ہینڈ رائٹنگ کے علاوہ اردو بھی واجبی سی آتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ فرزانہ کے خط اپنے دوست منظور سے لکھواتا تھا۔ مذکورہ خط اس نے اپنے جگری یار ”شاہ“ کو لکھا تھا۔ یہ وہی

دیانتداری کا بھوت سوار ہے۔ اس نے کچھ ایسے نکتے بیان کیے جن سے منابالکل بری الذمہ ہو جاتا تھا۔

اسی دوران اس گمنام لڑکی نے حسبِ تنبیہ ایک خط افسرانِ بالا تک پہنچا دیا۔ جیسا کہ میں بتا چکا ہوں گمنام ہونے کے باوجود وہ ایسا مدلل خط تھا کہ اگر کسی اور انسپکٹر کے خلاف ہوتا تو اسے صفائی کا موقع دیئے بغیر لائن حاضر کر دیا جاتا لیکن افسرانِ بالا میرے بارے میں بڑے اچھے خیالات رکھتے تھے۔ ایس پی صاحب نے مجھے ہیڈ کوارٹر بلایا اور بڑی نرمی سے بتایا کہ بھی تمہارے خلاف ایک چٹھی آئی ہے۔ میرا ہندو سب انسپکٹر بھی وہیں موجود تھا۔ میری آمد سے قبل اس سے بھی پوچھ گچھ کی گئی تھی۔ وہ ایک کینہ پرور شخص تھا۔ مجھے توقع تھی کہ اس نے میرا دفاع کرنے کی بجائے ایک آدھ بات زیادہ ہی لگائی ہوگی۔ وہاں جو گفتگو ہوئی وہ تکنیکی بحث کے زمرے میں آتی ہے۔ میں اس کی تفصیل بیان کر کے واقع کو طول نہیں دوں گا۔ مختصر یہ کہ ایس پی صاحب نے کہا۔

”انسپکٹر نواز! مجھے تم پر مکمل بھروسہ ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ملزم کے رشتے دار ہونے یا نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تم اپنا فرض پوری دیانتداری اور مہارت سے انجام دو گے۔ بہر حال میں تمہیں بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ اس معاملے کی بھٹک ”اوپر“ تک پہنچ چکی ہے۔“ میں ایس پی صاحب کی بات سمجھ رہا تھا۔ ہر پیشے اور شعبے میں خیر خواہ اور بد خواہ موجود ہوتے ہیں۔ میرے وہ ساتھی جو میری فرض شناسی کا ذکر تلخ الفاظ میں کیا کرتے ہیں۔ انوہ سازی کے اس سنہری موقع کو ہاتھ سے گنوا نا نہیں چاہتے تھے۔ ان کی عنایات سے یہ خبر افسرانِ بالا کے کانوں تک پہنچ چکی تھی اور اب..... ایس پی صاحب مجھے تنبیہ کر رہے تھے کہ ”نواز خان! ذرا سنبھل کے۔“

میں ایک طویل سانس لے کر اٹھا اور ایس پی صاحب سے کہا۔ ”سر! آپ کو یہ وردی کبھی دھوکا نہیں دے گی۔“ پھر سیلوٹ کر کے میں تیز قدموں سے باہر نکل آیا۔

☆=====☆=====☆

میری بیوی میرے سامنے بیٹھی تھی۔ رورو کر اس کی آنکھیں سُرخ ہو رہی تھیں۔ وہ جانتی تھی میں اس کے پاس کیوں آیا ہوں۔ میں اس سے شکیل عرف منے کا پتہ پوچھنے آیا تھا۔ مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ منے کو اس نے بھیجا ہے اور وہی اس کے ٹھکانے سے آگاہ ہے۔ ایک عورت کے لیے یہ ایک بہت بڑا امتحان تھا ایک طرف اس کا بھائی تھا جو مجرم تھا لیکن جسے وہ اپنے بچوں کی طرح چاہتی تھی، جس کے پسینے پر وہ خون بہانے کو تیار رہتی تھی اور دوسری طرف

شاہ ہے جس کے کمرے میں وہ مُردہ پایا گیا۔ خط کا مفہوم یہ تھا۔

”فرزانہ کا قصہ انجام کی طرف بڑھ رہا ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ منے سے ملی ہے۔ آج رات منا مجھ سے ملنے آ رہا ہے بہر حال کچھ بھی ہے میں ہار ماننے والا نہیں۔ شرط ہار بھی گیا تو فرزانہ کو نہیں ہاروں گا.....“

موت سے چند گھنٹے قبل لکھا گیا یہ خط صاف بتا رہا تھا کہ غفورے کا ارادہ خودکشی کا بالکل نہیں تھا۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ منا فرزانہ سے ملا ہے۔ لہذا اس کے دل برداشتہ ہونے کی بھی کوئی وجہ نہیں تھی۔ اس خط سے اس سوال کا جواب بھی مل جاتا تھا کہ فرزانہ کی محبت جیت کر بھی منے نے غفورے کو قتل کیوں کیا۔ درحقیقت وہ جان چکا تھا کہ غفوران دونوں کا پیچھا نہیں چھوڑے گا۔ شدید رقیبانہ جذبات کے تحت اس نے اسے قتل کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

اب انتظار فضول تھا۔ شواہد چلا چلا کر کہہ رہے تھے کہ منا مجرم ہے۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ جس لڑکی نے منے کا بھانڈا پھوڑا ہے وہ نہ صرف اس کی گہری راز داں تھی بلکہ دلی طور پر اس سے متفر بھی تھی۔ اس نے اپنے خط میں واضح طور پر اشارہ دیا تھا کہ اگر میں نے اپنی بیوی کے بھائی کے خلاف کارروائی سے دریغ کیا تو وہ اس خط کی ایک نقل میرے اعلیٰ افسران کو بھیجے گی۔ اگر اس کے خط میں یہ دھمکی نہ بھی ہوتی تو بھی میں مجرم کو چھوڑنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ یہ میرے کردار کی کڑی آزمائش تھی اور مجھے اس آزمائش سے گزرنا تھا۔

میں تھانے سے فوراً گھر کی طرف روانہ ہوا۔ گھر پہنچا تو پتہ چلا کہ منا غائب ہے۔ میری بیوی نے بتایا کہ وہ سہ پہر کا گیا واپس نہیں آیا، لیکن میں جانتا تھا کہ وہ واپس آیا ہوگا۔ دراصل میری بیوی بھانپ چکی تھی کہ میں اس کے بھائی کے خلاف کوئی کارروائی کرنے والا ہوں۔ اس نے اسے مطلع کر دیا تھا اور وہ بھاگ گیا تھا۔ میرے غصے کی کوئی انتہاء نہ رہی۔ نہ جانے میرے منہ سے کیا کیا نکلا۔ وہ سستی رہی اور آنسو بہاتی رہی۔ میں اس کی مجبوری سمجھ رہا تھا۔ وہ ایک اکلوتے بھائی کی بہن تھی لیکن وہ جذبات میں اپنا دوسرا رشتہ فراموش کر رہی تھی۔ اس کا یہ رشتہ ایک ذمے دار پولیس اہلکار سے تھا۔

یہ میرا خانگی جھگڑا تھا اور شاید قارئین کو اس سے دلچسپی بھی نہ ہو۔ لہذا میں تفصیل میں نہیں جاؤں گا۔ بہر حال میرے سسرال والے اس معاملے میں کود پڑے اور انہوں نے جھگڑے کو سنگین تر بنا دیا۔ ایک سرالی رشتہ دار جو خود پولیس میں تھا اور میرا ہم منصب بھی، اس معاملے کو بگاڑنے کا خاص سبب بنا۔ اس نے کہا کہ نواز خان جان بوجہ کر کیس خراب کر رہا ہے۔ وہ با آسانی منے کو مشکوک افراد کی فہرست سے خارج کر سکتا ہے..... اس پر صرف

اس کا شوہر تھا۔ جس کے چہرے پر ہمدردی اور رحم کا شائبہ تک نہیں تھا۔ جسے صرف اپنے فرض سے غرض تھی..... اور جو اس کے بھائی کو پھانسی کے تختے تک پہنچانا چاہتا تھا۔

ہم دونوں کے درمیان کافی دیر ایک بوجھل خاموشی حائل رہی۔ پھر میں نے سنبھل کر کہا۔ ”مے کا ملنا بہت ضروری ہے۔ میں تم سے صرف یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ تم میری مدد کرو گی یا مجھے اپنے طور پر اس کا پتہ چلانا ہوگا۔“

”کیا کوئی تیسرا راستہ نہیں؟“ میری بیوی نے پوچھا۔

”نہیں۔“ میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

میری بیوی نے اس وقت مے کے بارے میں کچھ نہایت جذباتی باتیں کیں لیکن میرے پایہ استقامت میں لغزش نہیں آئی۔ میں نے اسے کہا۔ ”یوں آنسو بہانے اور گریہ زاری سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ وہ ملزم ہے اور اگر مجرم ثابت ہوتا ہے تو اسے کیے کی سزا ملے گی۔“

”چاہے وہ پھانسی ہو۔“ میری بیوی نے پوچھا۔

”ہاں چاہے وہ پھانسی ہو۔“ میں نے کہا۔

اس نے عجیب نظروں سے مجھے دیکھا۔ ان نظروں میں دنیا جہاں کی عورتوں کا دکھ سمٹ آیا تھا۔ ان تمام عورتوں کا دکھ جو مردوں سے پیار کرتی ہیں۔ سخت گیر باپوں سے، خود غرض بھائیوں سے، پینے والے شوہروں سے اور..... رات دیر سے لوٹنے والے بیٹوں سے۔ وہ سب انہیں دکھ دیتے ہیں کوئی کسی طرح اور کوئی کسی طرح۔ ہاں ان تمام عورتوں کا دکھ اس کی آنکھوں میں تھا۔ پھر اس نے کہا۔

”میں آپ کو اس کا پتہ دیتی ہوں..... لیکن اس کے بعد میں کبھی آپ کو اپنی شکل نہیں دکھاؤں گی۔“

میں نے بیوی سے اس کے بھائی کا پتہ پوچھا اور ایک چھاپہ مار پارٹی کے ساتھ روانہ ہو گیا۔

☆=====☆

ملزم کو ایک گاؤں سے گرفتار کیا گیا۔ میری بیوی نے اسے اپنی ایک منہ بولی بہن کے پاس بھیج دیا تھا۔ گرفتاری کے دوران کوئی اہم واقعہ پیش نہیں آیا سوائے اس کے کہ جب ہم مے کو گرفتار کرنے گھر میں داخل ہوئے تو ایک پہلوان نما شخص نے پولیس پارٹی پر حملہ کر دیا۔ بہر حال تھوڑی سی کوشش سے اسے قابو کر لیا گیا۔ یہ شخص اس عورت کا خاوند تھا جس نے مے کو پناہ دے رکھی تھی۔

مے کو عدالت میں پیش کر کے میں نے ریمانڈ لے لیا۔ بعد ازاں تین چار روز میں چالان مکمل کر کے عدالت میں پیش کر دیا۔ اپنی طرف سے میں نے فرض نبھانے میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔ ملزم کے خلاف شہادتیں کافی مضبوط تھیں۔ سیشن سے اسے سزائے موت ہوئی۔ ان لوگوں نے ہائی کورٹ میں اپیل کر دی۔ مقتول پارٹی بھی پورا زور لگا رہی تھی۔ امید نہیں تھی کہ سزائیں تخفیف ہو سکے گی۔

میری بیوی اسی روز اپنے گھر واپس چلی گئی تھی جس روز میں نے ملزم کا چالان مکمل کیا تھا۔ سرالی عزیزوں کی طرف سے مجھے خطرناک نتائج کی دھمکیاں بھی دی گئیں لیکن میں اپنے کام میں جتا رہا۔ میں جانتا تھا کہ سچ پر ہوں اور سچ کو آنچ نہیں۔

اس واقعہ کو تقریباً ڈیڑھ برس گزر گیا۔ حالات جوں کے توں رہے۔ وہ گرمیوں کی ایک تاریک رات تھی۔ اداس اور جس زدہ۔ میں نو بجے کے قریب گھر آیا..... ہوٹل کے کچے ہوئے کھانے کو دوبارہ گرم کیا۔ چند لقمے لیے پھر خود ہی چار پائی بچھائی اور لینے کی تیاری کرنے لگا۔ اس وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے وہیں صحن سے آواز دے کر کہا۔ ”دروازہ کھلا ہے آ جاؤ۔“ آنے والا ایک درمیانی عمر کا سکھ تھا۔ کسی گھر کا نوکر دکھائی دیتا تھا۔ اس نے ست سری اکال کر کے کہا۔

”تھانیدار صاحب! آپ کو ڈاکٹر صاحب نے بلایا ہے..... ڈاکٹر مہتا نے۔ ان کی حالت بہت خراب ہے۔ وہ ہسپتال میں ہیں۔“

میں نے تفصیل پوچھی تو اس نے بتایا کہ آج شام سائیکل پر آتے ہوئے ان کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ انہیں سخت چوٹیں آئی ہیں۔ وہ آپ سے کوئی ضروری بات کرنا چاہتے ہیں اور تاکید کی ہے کہ آپ کو لے کر آؤں۔ میں تھکا ماندہ آیا تھا لیکن نہ جانے جی میں کیا آئی کہ اس کے ساتھ چل دیا۔

ہسپتال، مہتا کے پاس پہنچا تو وہ بیٹوں میں جکڑا پڑا تھا۔ لاری نے ٹکڑا ماری تھی۔ ٹانگوں اور چھاتی پر شدید چوٹیں آئی تھیں۔ خون اور گلہ کو زلگا ہوا تھا۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ ان کی حالت بار بار خراب ہو جاتی ہے۔ آپ جلد بات کر لیں۔ میں مہتا کے پاس پہنچا تو وہ پہچان کر پھیکے سے انداز میں مسکرایا۔ کہنے لگا۔

”انسپکٹر صاحب! کرچھن لوگ اعتراف گناہ کر کے دل کا بوجھ ہلکا کرتے ہیں۔ میں بھی آپ کے سامنے ایک اعتراف کرنا چاہتا ہوں۔“

اس کی آواز دھیمی تھی۔ میں اسٹول پر بیٹھ کر آگے کو جھک گیا۔ وہ دھیرے دھیرے

☆=====☆=====☆

بولنے لگا۔ میں اسی طرح جھکار ہا اور وہ بولتا رہا۔ قریباً نصف گھنٹہ گزر گیا۔ بیچ بیچ میں میں نے کچھ سوالات بھی کیے۔ اس گفتگو کا خلاصہ یہ ہے۔

آج سے ڈیڑھ برس پہلے مہتا سنگھ نے غفورے کے قتل میں جو گواہی دی تھی وہ جھوٹی تھی۔ ایسے معتبر شخص نے یہ جھوٹ کیوں بولا؟ اس کا جواب یہ تھا کہ اسے اس گواہی پر مجبور کیا گیا تھا۔ واقعہ کچھ یوں تھا کہ غفورے کے قتل سے کوئی دو ماہ پہلے ڈاکٹر مہتا ایک نوجوان لڑکی کے چکر میں پھنس گیا تھا۔ یہ برقعہ پوش لڑکی ایک گرم اور سنسان دوپہر کو اس سے دوائی لینے آئی۔ مہتا سنگھ اکیلا تھا۔ وہ لاکھ بھلا مانس اور ادھیڑ عمر سہی بہر حال ایک مرد تھا۔ لڑکی نے اسے ایسے ناز و نخرے دکھائے کہ وہ طبیعت پر قابو نہ رکھ سکا۔ اس نے لڑکی کے جسم کو ہاتھ لگایا تو وہ برا مان گئی اور اٹھ کر چل دی۔

ڈاکٹر مہتا کچھ دن اپنے کئے پر پشیمان رہا۔ پھر ایک روز اسے لڑکی کا خط ملا۔ اس حوصلہ افزاء خط نے ڈاکٹر مہتا کے شوق کو بھڑکایا۔ ان دونوں کے درمیان خط و کتابت شروع ہو گئی۔ تنہائی کے چند لمحے میسر ہوئے اور ڈاکٹر مہتا اس کے قریب پہنچا۔ اس لمحے اس پر انکشاف ہوا کہ برقعے میں عورت نہیں بلکہ مرد ہے۔ وہ بری طرح چونک کر چیخے ہٹا۔ ایک مردانہ قہقہہ سنائی دیا اور برقعہ پوش، ڈاکٹر مہتا کو حیران و پریشان چھوڑ کر دکان سے نکل گیا۔ اس کے بعد مہتا کو جو خط ملا وہ سراسر ایک بلیک میلر کا خط تھا۔ اس میں ڈاکٹر کا مذاق اڑایا گیا تھا اور بھانڈا پھونڈنے کی دھمکیاں دی گئی تھیں۔

ڈاکٹر نے اپنے طور پر بلیک میلر کا کھوج لگانے کی کوشش کی لیکن یہ جان کر اسے مایوسی ہوئی کہ جس پتے پر وہ خط لکھتا تھا وہاں کوئی بنگالی کرائے دار رہتے تھے جو مکان چھوڑ کر جا چکے تھے..... پھر ایک دن ڈاکٹر کو برقعہ پوش لڑکے کا طویل خط پہنچا۔ اس میں اسے مذکورہ گواہی پر مجبور کیا گیا تھا۔ ڈاکٹر بال بچے دار آدمی تھا۔ گلی محلے میں اس کی عزت تھی۔ وہ بدنامی کے خوف سے کانپ گیا۔ بلیک میلر نے وعدہ کیا تھا کہ اس کے بعد اسے تنگ نہیں کرے گا۔ بہت سوچ بچار کے بعد ڈاکٹر نے اس کی بات ماننے کا فیصلہ کیا۔

میں نے ڈاکٹر کا پورا بیان غور سے سنا۔ حالات ایک پراسرار رنگ اختیار کر گئے تھے۔ اس پورے واقعے میں ایک برقعہ پوش ملوث دکھائی دیتا تھا۔ اور پھر وہ لڑکی جس نے مجھے گناہ خط لکھا تھا۔ کہیں وہ بھی تو لڑکا نہیں تھا؟ میرا ذہن آہستہ آہستہ اس نتیجے پر پہنچ رہا تھا کہ منہ کو منظم طریقے سے پھنسانے کی کوشش کی گئی ہے۔ ایک بے قراری سی میرے رگ و پے میں اتر گئی۔ میں نے ڈاکٹر مہتا سے چند اور ضروری سوال پوچھے اور ہسپتال سے نکل آیا۔

میں نے ڈاکٹر مہتا کو موصول ہونے والے خطوں کی تحریر کا گناہ لڑکی کے خط سے موازنہ کیا اور انکشاف ہوا کہ دونوں تحریریں ایک ہیں۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ اس برقعہ پوش لڑکے کا سراغ کیونکر لگے۔ جس نے پہلے ڈاکٹر مہتا کو اپنے دام میں پھنسایا تھا اور پھر مجھے خط لکھ کر منہ کے خلاف شہادتیں فراہم کی تھیں۔ میں نے ایک بار پھر نئے سرے سے تفتیش شروع کی۔ غفورے کے تمام دوستوں سے فردا فردا پوچھ گچھ کی۔ (شاید میں بتانا بھول گیا کہ ڈاکٹر مہتا زخموں کی تاب نہ لا کر چل بسا تھا)

میں نے اپنے سب انسپکٹر کو ہدایت کی کہ وہ علاقے میں کسی ایسے نوجوان کا سراغ لگائے جسے عورتوں جیسا حلیہ بنانے کا شوق ہو اور خاص طور پر غفورے کے ملنے چلنے والوں میں ایسے لڑکے کو تلاش کرے۔ میں نے ان بنگالی کرائے داروں کا سراغ لگانے کی کوشش بھی کی جن کے پتے پر برقعہ پوش لڑکے کے خطوط آتے تھے۔ اس سلسلے میں چند بنگالیوں کو گرفتار بھی کیا گیا لیکن مطلوب لوگ ہاتھ نہیں آئے۔ آپ میری بے قراری کا اندازہ بخوبی لگا سکتے ہیں۔ میری تفتیش کی بنیاد پر بے ایک بے گناہ کو پھانسی ہونے کا خدشہ تھا اور وہ بے گناہ میرا نہایت قریبی عزیز تھا۔ ان دنوں مجھے کھانے پینے کا ہوش تھا نہ آرام کا۔ بس ایک ہی خواہش تھی کہ کسی طرح اس گتھی کا کوئی سراغ ہاتھ آجائے۔

تلاش بسیار اور سخت کوشش کے باوجود میری تفتیش کی کشتی کسی کنارے پر نہیں لگی۔ آہستہ آہستہ مجھ پر مایوسی غالب آنے لگی۔ پھر شاید میں ہمت ہار کے کوشش ترک کر ہی دیتا کہ ایک صبح میرے لیے کامیابی کی نوید لے آئی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے وہ ستمبر کی پہلی تاریخ تھی۔ رات کی موسلا دھار بارش کے بعد نرم دھوپ گلی کوچوں میں پھیلی ہوئی تھی۔ میں دو سپاہیوں کے ساتھ پیدل ہی تھانے کی طرف جا رہا تھا، دفعتاً ایک لڑکی کو دیکھ کر چونک گیا۔ اس نے سیاہ برقعہ پہن رکھا تھا اور تیزی سے سڑک کے کنارے جا رہی تھی۔ اس کی چال میں مجھے ضرورت سے کچھ زیادہ ہی نسوانیت اور لچک محسوس ہوئی۔ جیسی آپ نے بھی بیچروں میں دیکھی ہوگی۔ موہوم شک کے تحت میں نے لڑکی کا پیچھا شروع کر دیا۔

وہ اپنے تعاقب سے بے خبر چلتی رہی اور آخری لڑکیوں کے سکول کے سامنے پہنچ گئی۔ میں نے دیکھا کہ لڑکیاں اپنی مخصوص یونیفارم کی بجائے رنگ برنگے کپڑوں میں نظر آ رہی ہیں۔ دراصل اس دن اسکول کے اندر کوئی میلہ وغیرہ تھا۔ لڑکی تیزی سے چلتی ہوئی اندر داخل ہو گئی۔ میں گیٹ پر پہنچا۔ چوکیدار مجھے دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔ اسکول کے وسیع احاطے میں

خونفک بھی لگ رہا تھا اور کچھ مضحکہ خیز بھی۔ ایک ہاتھ سے اس نے نقاب الٹا اور اپنی ہراساں نگاہیں میرے چہرے پر جمادیں۔ میں اس چہرے کو اچھی طرح جانتا تھا، آپ بھی جانتے ہوں گے لیکن یقین کریں اس وقت میں بالکل نہ پہچان سکا۔ وہ ہو بہو ایک بنی سنوری دھنیزہ دکھائی دے رہا تھا۔ صرف بغور دیکھنے سے ہی اس کی ڈاڑھی کی نیلا ہٹ محسوس کی جاسکتی تھی۔ میں سوچنے لگا اس شخص نے شامیانے میں گھس کر غلطی کی تھی۔ اگر یہ لڑکیوں کے درمیان رہتا تو بھی شاید اسے مشکل سے ہی پہچانا جاتا۔

میں نے نہایت محتاط انداز میں برقعہ پوش کے چاقو پر نگاہیں جمادیں۔ دست بدست لڑائی کا ایک اصول ہوتا ہے کہ مد مقابل کے پاس تیز دھار آلہ ہو تو اس سے فاصلے پر رہنے کی کوشش کی جاتی ہے اگر وہ آتشیں اسلحہ رکھتا ہو تو پھر اس سے گھم گھما ہونے میں فائدہ ہوتا ہے۔ اس زمانے میں جوڈو کرانے اور اس قسم کی باتیں سننے میں نہیں آتی تھیں لیکن تجربہ انسان کو بہت کچھ سکھا دیتا ہے۔ مثلاً مجھے معلوم تھا کہ چاقو زن سے واسطہ پڑنے پر اس انداز سے کھرا ہونا چاہیے کہ اس کا چاقو والا ہاتھ آپ کے اسی ہاتھ کے سامنے ہو۔ مثلاً اگر اس کے دائیں ہاتھ میں چاقو ہے تو آپ کا دایاں ہاتھ اس کے دائیں ہاتھ کی سیدھ میں ہو۔ اس طرح ذرا سا پہلو بدل کر وار سے صاف بچا جاسکتا ہے..... میں بالکل اسی انداز میں کھڑا تھا۔

مد مقابل کے انداز سے صاف ظاہر تھا کہ وہ کوئی ماہر چاقو زن نہیں ہے۔ مجھے پورا یقین تھا کہ جس گھڑی اس نے مجھ پر وار کیا وہی گھڑی اس کی گرفتاری کی ہوگی لیکن وہ ایک چالاک دکھا گیا۔ مجھ پر حملہ آور ہونے کی بجائے اس نے اچانک دوڑ لگا دی۔ لڑکیوں نے اسے اپنی طرف آتے دیکھا تو چیخنی چلاتی چاروں طرف بھاگیں۔ میں پوری رفتار سے اس کے تعاقب میں تھا۔ میں اس کا ارادہ سمجھ گیا۔ وہ بیرونی دروازے سے نکل جانا چاہتا تھا۔ اس دوڑ کو آپ سو میٹر کی دوڑ بھی کہہ سکتے ہیں۔ بیرونی دروازے سے چند گز ادھر میں نے اس پر چھلانگ لگائی۔ میرے ہاتھ اس کی کمر پر پڑے اور وہ میرے بوجھ تلے دور تک گھسٹتا چلا گیا لیکن پھر بے حد پھرتی سے اس نے کروٹ بدلی اور چاقو کا وار میرے چہرے پر کیا۔ اضطرابی طور پر میری گردن پیچھے کی طرف جھکی اور ایک برقی سی آنکھوں کے سامنے لہرا گئی۔ چاقو میری آنکھوں سے ایک انچ کے فاصلے سے گزر گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ دوسرا وار کرتا میں نے اس کی کٹاہٹ تمام لی۔

اب صورت حال یہ تھی کہ وہ بنی سنوری برقعہ پوش ”جعلی“ حسینہ چاروں شانے چت زمین پر پڑی تھی۔ میں اس کے سینے پر سوار تھا اور اس کی دونوں کلاںیاں میری گرفت میں

شامیانے لگے تھے۔ لڑکیاں، عورتیں، بچے اور بچیاں کثیر تعداد میں دکھائی دے رہے تھے۔ میں نے مطلوبہ لڑکی کو دیکھنے کی کوشش کی لیکن وہ ہجوم میں گم ہو چکی تھی۔ میری جھنڈی حس مجھے خبردار کر رہی تھی۔ اتنے میں اسکول کی ہیڈ مسٹرئیں بھی دروازے پر آ گئی۔ میں نے اس پر اپنا شک ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ ان لڑکیوں میں کوئی برقعہ پوش مرد گھس گیا ہے۔ فربہ اندام ہیڈ مسٹرئیں کے چہرے پر ہراس دکھائی دینے لگا۔ وہ مجھے ساتھ لے کر احاطے میں آ گئی۔ اسکول کی لڑکیوں نے ایک باوردی پولیس والے کو اپنے قریب دیکھا تو شوخی پر اتر آئیں۔ بڑی عمر کی کچھ تیز طرار لڑکیوں نے آواز بے بھی کے۔

ایک آواز آئی۔ ”فلاں استانی کا شوہر ہے۔“

ایک نے کہا۔ ”یہ چوری کی گاؤں ڈھونڈنے آئے ہیں۔“

دوسری بولی۔ ”بہن راستہ بھول گئے ہیں۔“

ہیڈ مسٹرئیں نے لڑکیوں کو ڈانٹا۔ میں نے غور سے لڑکیوں کے چہرے دیکھے کچھ اندازہ نہ ہوا۔ ہیڈ مسٹرئیں نے تمام لڑکیوں کو حکم دیا کہ ایک جگہ اکٹھی ہو جائیں۔ لڑکیاں اکٹھی ہو گئیں۔ عورتیں اور بچے بھی ان میں موجود تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر میرا شک غلط نکلا اور ان میں کوئی برقعہ پوش مرد نہ نکلا تو یہ میرا مذاق اڑانے سے باز نہیں آئیں گی۔

دفعتاً میری نظر ایک شامیانے کی طرف اٹھ گئی۔ ایک اسٹال کے عقب میں سیاہ برقعے کی جھلک دکھائی دی تھی۔ میں نے انگلی سے اس طرف اشارہ کر کے ایک استانی کو اطلاع دی۔ میری انگلی اٹھنے کی دیر تھی کہ اسٹال کے عقب سے ایک برقعہ پوش برآمد ہوا۔ اس نے چھلانگ لگا کر کاؤنٹر پار کیا اور تیزی سے مخالف سمت میں بھاگا۔ لڑکیوں کی چیخیں کورس کی صورت میں بلند ہوئیں۔ میں ان کے درمیان سے راستہ بناتا ہوا تیزی سے مجرم کی طرف لپکا۔ وہ برقعے سمیت سر پٹ دوڑتا ہوا بیرونی دیوار کی طرف بڑھ رہا تھا۔ پھر اس نے کسی چگاڑی کی طرح چھلانگ لگائی اور منڈیر تھام لی لیکن اس سے پہلے کہ وہ زور لگا کر اوپر چڑھتا میں اس کے قریب پہنچ چکا تھا۔

اس نے جب دیکھا کہ میں اسے فرار نہیں ہونے دوں گا تو اس نے منڈیر چھوڑ کر نیچے چھلانگ لگا دی۔ زمین پر گرتے ہی وہ سیدھا کھڑا ہوا۔ پھر اس نے برقعے کے اندر ہاتھ ڈالا اور ایک گراری دار چاقو نکال لیا۔ اٹلے قدموں پیچھے ہٹتے ہوئے اس نے چاقو کھولا۔ چاقو کی آوازن کر میرے جسم میں سنسنی دوڑ گئی۔ لڑکیوں اور عورتوں کی دبی دبی چیخیں بھی سنائی دیں۔ اتفاقاً اس وقت میرے پاس ریوالور نہیں تھا۔ لمبے پھل کا چاقو ہاتھ میں لیے برقعہ پوش نہایت

زمین سے لگی تھیں۔ وہ اب بھی پیٹ کے زور سے مجھے اچھالنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن اسکول کا پٹھان چوکیدار ”خانہ خراب کا بچی“..... خانہ خراب کا بچی“ پکارتا ہوا اس کے سر پر گیا۔ اس نے لاشی کا بھرپور وار اس کے سر پر کیا۔ لڑکا کراہا۔ چاقو پر اس کی گرفت ڈھیلی ہوئی اور میں نے ایک جھٹکے سے اسے غیر مسلح کر دیا۔

☆=====☆

آپ یہ سننے کے لیے بے چین ہوں گے کہ اسکول میں گرفتار ہونے والا ملزم کون تھا؟ قارئین وہ ملزم تھا ابھرے ہوئے رخساروں والا منظور۔ وہی منظور جو غفورے کا راز داں تھا۔ جس سے غفور فرزانہ کو خط لکھواتا تھا۔ اپنی تفتیش کے دوران مجھے سب سے کم شک اسی لڑکے پر پڑا تھا لیکن آخر میں وہی اصل مجرم نکلا۔

اس وقت وہ میرے سامنے بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے پر چوٹوں کے نشان تھے۔ ابھی تک اس نے اقبال جرم نہیں کیا تھا۔ وہ اس بات پر مصر تھا کہ غفورے کو کسی نے قتل نہیں کیا۔ اس نے خود کشی کی ہے اور وہ اس حقیقت کا ایک ٹھوس ثبوت بھی فراہم کرنے پر آمادہ ہو گیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد غفورے کا درزی باپ وہ ثبوت لے کر تھانے پہنچ گیا۔ ایک دو معزز افراد بھی اس کے ساتھ تھے۔ یہ ثبوت ایک کاغذ کی صورت میں تھا اور ان لوگوں نے منظوری کی نشاندہی پر حاصل کیا تھا۔ اس کاغذ پر مقتول غفورے کی اپنی تحریر میں چند سطور لکھی تھیں۔ وہ کچھ یوں تھیں۔

”یہ رقعہ میں پورے ہوش کے ساتھ اپنی مرضی سے لکھ رہا ہوں۔ اپنی موت کا ذمہ دار میں خود ہوں۔ میرے بعد کسی پر یہ الزام نہ آئے۔ کسی کی محبت نے جینا مشکل کر دیا ہے۔ وفا کی کا دکھ اور برداشت نہیں ہوتا۔“ نیچے دو شعر لکھے ہوئے تھے۔ آخر میں لکھنے والے کا نام تھا۔ ”غفور احمد بقلم خود۔“ تاریخ بھی درج تھی جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ یہ رقعہ غفورے کی موت سے تھوڑی دیر پہلے لکھا تھا۔ تحریر ہو ہو غفورے کی دوسری تحریر سے ملتی تھی۔

اگر دیکھا جائے تو اس رقعے کی موجودگی میں غفورے کی خود کشی ثابت ہو جاتی تھی۔ واقعی منظور نے ایک اہم ثبوت مہیا کر دیا تھا لیکن میرے لیے اس ثبوت کی کوئی اہمیت نہیں تھی..... میں اس معاملے کی تہہ تک پہنچ چکا تھا۔ نہایت لا پرواہی سے میں نے کاغذ کا ٹکڑا پر پھینک دیا۔ منظور کے وارثوں کے چہرے تاریک ہو گئے۔ منظور بھی پریشانی سے میری طرف دیکھنے لگا۔ میں نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔

”منظور! تم ایک میٹرک پاس ذہین لڑکے ہو لیکن تم نے اپنی ذہانت کا استعمال نہایت غلط طریقے سے کیا..... مجھے اس وقت ایک شعر یاد آ رہا ہے جس میں شاعر کچھ اس قسم کی بات

کہتا ہے کہ ایک تو میرا انداز بیان اور اوپر سے اس پری چہرہ کا ذکر۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جو میرا راز داں تھا وہی رقیب بن گیا۔ منظور! تم دراصل فرزانہ کے تیسرے عاشق ہو۔ غفورے کے خط لکھتے لکھتے تم خود بھی فرزانہ کے عشق میں گرفتار ہو چکے تھے۔ تمہاری محبت دوسرے دونوں دوستوں کی نسبت خاموش لیکن شدید تھی۔ تم دل ہی دل میں فرزانہ کو حاصل کرنے کے منصوبے بنایا کرتے تھے۔ فرزانہ تمہیں بھائی جان کہتی تھی اور اپنے خطوں میں تمہاری خیر خیریت بھی دریافت کیا کرتی تھی۔ کبھی کبھی تمہیں شک ہوتا تھا کہ وہ تم سے محبت کرتی ہے لیکن تمہاری یہ محبت منے اور غفورے کی موجودگی میں پروان نہیں چڑھ سکتی تھی۔

آخر قدرت نے تمہیں ایک سنہری موقع دیا۔ غفورے اور منے کے درمیان فرزانہ سے ملاقات کی شرط لگی اور تمہیں پتہ چلا کہ منہ شرط جیت گیا ہے۔ تم نے ایک منصوبہ بنایا تمہیں معلوم تھا کہ آج یا کل منہ لڈو لے کر غفورے کے پاس آئے گا اور غفورے کو کامیابی کی خبر سنا کر دل گیر کرے گا۔ تم نے غفورے کا راز دار بن کر اسے مشورہ دیا کہ کیوں نہ وہ اپنی خود کشی کا ڈرامہ رچائے تم نے اسے کہا کہ میں تمہیں ایک ہلکا سا زہر لا دیتا ہوں۔ تم تھوڑی مقدار میں کھالینا۔ میں تمہارے گھر والوں کو اطلاع دوں گا۔ وہ تمہیں ڈاکٹر کے پاس لے جائیں گے۔ تمہاری خود کشی کا ڈرامہ بھی کامیاب رہے گا اور تمہیں نقصان بھی نہیں پہنچے گا۔ فرزانہ کو جب تمہاری محبت کی شدت کا علم ہو گا تو وہ تمہاری طرف مائل ہو جائے گی۔

غفور تمہاری باتوں میں آ گیا۔ تم نے اچھی طرح سوچی سمجھی سکیم کے تحت اپنی بہن کے سیاہ برقعے میں کچی بستی کا رخ کیا۔ دراصل تمہیں لڑکیوں کا بھیس بدلنے کی عادت ہے۔ ڈاکٹری زبان میں اسے ذہنی مرض بھی کہا جاسکتا ہے۔ کسی کو معلوم نہیں کہ تم جو اچھے بھلے مرد ہو، بند کمرے میں گھس کر عورتوں کی طرح بناؤ سنگھار بھی کرتے ہو۔ بہر حال یہ ایک علیحدہ کہانی ہے..... تم بہن کا برقعہ پہن کر کچی بستی پہنچے۔ وہاں سے زہر خریدا پھر حلوائی مختار سے لڈو خریدا اور ان میں زہر ملا دیا۔ اس کے بعد تم رات کا انتظار کرنے لگے۔

حسب توقع اس رات تمہارے جانے کے بعد منہ غفورے سے ملنے آیا۔ کچھ دیر غفورے کے پاس بیٹھ کر وہ چلا گیا۔ تم دوبارہ غفورے کے پاس پہنچے تاکہ خود کشی کے ڈرامے کو حقیقت کا رنگ دیا جائے۔ دراصل تم انتہائی مہلک زہر خریدا کر لائے تھے اور تمہارا منصوبہ غفورے کو قتل کرنے کا تھا۔ سب سے پہلے تم نے غفورے سے خود کشی کی تحریر لکھوائی جو تم اب میرے سامنے پیش کر رہے ہو۔ اگر منہ غفورے کے قتل کا ملزم نہ بھی ٹھہرتا تو بھی تم اس قتل میں نہیں بخش سکتے تھے۔ کیونکہ تحریر تمہارے پاس تھی اور تم کسی بھی مناسب وقت پر اسے پولیس

کی نظروں میں لا سکتے تھے۔ اس وقت بھی تمہارے پاس کوئی نہ کوئی بہانہ ہوگا کہ یہ تحریر اب تک کیوں چھپائی۔

بہر حال تحریر نکھوانے کے بعد نہایت سفاکی سے تم نے غفورے کو وہ زہریلے لڈو دیئے۔ غفورے پر غشی طاری ہونے لگی تو اس نے تمہاری منتیں کیں کہ کسی کو بلواؤ۔ تم بیٹھک نکل آئے اور باہر سے گنڈی چڑھا دی۔ غفورہ اندر ہی تڑپ تڑپ کر مر گیا۔ جب تمہیں خبر ہو گیا کہ جگری دوست، تم سے جسم کی بھیک مانگنے کے لیے زندہ نہیں رہا ہوگا تو تم دوبارہ داخل ہوئے۔ وہاں سے زہریلے لڈو اٹھائے اور اس کے ساتھ ساتھ منے کے لائے ہوئے بھی اٹھا لیے۔ منے کے لائے ہوئے لڈو تم اپنے گھر لے گئے جب کہ زہریلے لڈو تم میرے گھر کے پچھواڑے پھینک دیئے۔ اس سے اگلے روز تم نے ”لکھائی“ بدل کر دو خط لکھے ایک مجھے اور دوسرا ڈاکٹر مہتا کو۔ تم نے ڈاکٹر مہتا کو مجبور کیا کہ وہ منے کے خلاف گواہی دے۔ اس طرح تم نے ایک تیر سے دو شکار کیے..... مننا جیل پہنچ گیا اور غفورہ قبر میں..... منسوبہ بہت کامیاب تھا منظور۔ اگر تین ہفتے پہلے کچہری روڈ پر ایک حادثہ نہ ہوتا اور ڈاکٹر مہتا ہسپتال میں نزعی بیان نہ دیتا تو قانون کے ہاتھ کبھی تمہاری گردن تک نہ پہنچ سکتے۔“ میری تقریر ختم ہوئی تو منظور کے ابھرواں رخساروں پر موت کی زردی کھنڈی تھی اور ان کے لواحقین کے چہرے لٹک رہے تھے۔

میں اب اس کہانی کو مختصر کرتا ہوں۔ ہائی کورٹ نے میرے برادر نسبتی شکیل عرف بے باعزت بری کر دیا۔ منظور کے خلاف دوسرے الزامات کے علاوہ دفعہ 302 کے تحت کبہ درج ہوا۔ سیشن کورٹ سے اسے سزائے موت ہوئی، لیکن بعد ازاں ہائی کورٹ نے اس کی عمری کے پیش نظر سزائے موت کو عمر قید میں تبدیل کر دیا۔ حالانکہ اس نے جس سفاکی دوست کو موت کے گھاٹ اتارا تھا، میری خواہش تھی کہ اس کی سزا برقرار رہتی۔

اس کہانی کا ایک کردار فرزانہ تھی۔ وہ ایک نہایت حسین اور پُرکشش لڑکی تھی لیکن خراب کردار کی وجہ سے اسے اچھا رشتہ نہیں ملا۔ اپنے ہی خاندان کے ایک سانولے سے لڑکے اس کی شادی ہو گئی۔ مننا دوبارہ پڑھائی میں مصروف ہو گیا۔ اس کہانی کا ایک کردار میری بھتیجی تھی۔ اس نے عہد کیا تھا کہ کبھی مجھے اپنی شکل نہیں دکھائے گی لیکن اپنے زندہ سلامت بھائی صورت دیکھ کر جہاں اس کے آنسوؤں نے ضبط کے بند توڑے وہاں اس کا عہد بھی ٹوٹ گیا۔

☆=====☆

دوستی، فرض اور لاش

کہتے ہیں پولیس والوں کی نہ دوستی اچھی نہ دشمنی۔ ہو سکتا ہے یہ کہات درست ہو لیکن اس کہانی میں آپ کو ایک مجرم اور پولیس انسپکٹر کی دوستی کی ناقابل فراموش داستان ملے گی اور یہ بات ثابت ہو جائے گی کہ سارے پولیس والے ایک جیسے نہیں ہوتے۔

میں تھا۔ بڑے بڑے دروں پر پورے کے پردے لٹکائے گئے تھے۔ احاطے کی چار دیواری خاصی اونچی تھی۔ گاؤں بھر میں سب سے مضبوط چار دیواری شاید اس طویلے ہی کی تھی۔ دیوار پر شیشے وغیرہ لگے ہوئے تھے۔ دیوار پھاند کر اندر آنا آسان نہیں تھا۔ دینو نے بتایا کہ رسہ گیر چھت کی طرف سے آیا ہے۔ اس نے چھت کی منڈیر دکھائی۔ یہاں دو اینٹیں اکٹری ہوئی تھیں اور ایک دیسی جوتے کی ایڑھی کا مدھم نشان بھی تھا۔ یعنی رسہ گیر پہلے چھت پر پہنچا تھا۔ وہاں سے لٹک کر چار دیواری پر اترتا تھا اور پھر چھلانگ لگا کر صحن میں آ گیا تھا۔ اس نے بڑی ہوشیاری کے ساتھ دینو کے پاس سے گھوڑی کھولی تھی اور بیرونی دروازے کی کنڈی گرا کر نکل گیا تھا۔ میں نے اچھی طرح موقعہ واردات کا جائزہ لیا۔ دینو سے مختلف سوالات پوچھے اور ایک خاص نتیجے پر پہنچ گیا۔ مجھے تقریباً تقریباً یقین ہو گیا تھا کہ یہ واردات اچھو نے کی ہے۔

اچھو ایک سوا چھٹ لے کر ہرے بدن کے تیز طرار نو جوان کا نام تھا۔ شانے چوڑے، پیٹ چیتے کی طرح کسا ہوا، گردن لمبی اور آنکھیں روشن۔ اچھو کا پورا نام محمد اشرف عرف اچھو تھا۔ تین چار سال لاہور اور کراچی میں ٹیکسی وغیرہ چلاتا رہا تھا۔ شہر کی ہوانے اسے خاصا خزانہ کر دیا تھا۔ لڑائی بھڑائی کا شوق تو اسے شروع سے تھا۔ شہر کے بد معاشوں اور غنڈوں سے واسطہ پڑا تھا تو اس کے ہاتھ میں اور صفائی آ گئی تھی۔ ٹانگ تو ایسے زور کی مارتا تھا کہ بندہ پھڑک کر رہ جاتا تھا۔ شہر میں ٹیکسی چلانے کے علاوہ اس نے دو بار جیل کی ہوا بھی کھالی تھی۔ یوں اس کے گبڑے میں جو تھوڑی بہت کسر رہ گئی تھی وہ بھی پوری ہو گئی تھی..... میرے ساتھ اچھو کا یار رہتا تھا۔ آپ سن کر حیران ہوں گے کہ ایک پولیس انسپکٹر سے چور بد معاش کا کیسا یارانہ؟ دراصل یہ بھی ایک کہانی ہے۔ مختصر الفاظ میں یہ جان لیجئے کہ کوئی ایک سال پہلے اچھو نے ایک نازک موقع پر بڑی ہمت سے میری مدد کی تھی بلکہ اگر میں کہوں کہ میری جان بچائی تھی تو غلط نہ ہوگا۔ ان دنوں وہ نیانیا شہر سے واپس آیا تھا۔ برسات کے دن تھے۔ راپور کے قریب سے گزرنے والا ڈیک نالہ زبردست طغیانی پر تھا۔ میں نالے کے پاس سے گزر رہا تھا کہ ایک عورت کی چیخیں سنیں۔ وہ ایک ساتھ والے گاؤں سے بہتی ہوئی آئی تھی اور مدد کے لیے پکار رہی تھی۔ میں نے اسے بچانے کے لیے پانی میں چھلانگ لگائی لیکن جب اس عورت کے قریب پہنچا تو معلوم ہوا کہ وہ دو عورتیں ہیں۔ دونوں تیر تیر کر بے دم ہو چکی تھیں اور اب ڈوبنے کے قریب تھیں۔ وہ دونوں اس بری طرح مجھ سے لپٹیں کہ میرے لیے خود کو سنبھالنا بھی مشکل ہو گیا۔ پانی کا بہاؤ بہت تیز تھا وہ ایک منٹ کے بعد ہمیں گاؤں سے قریب ایک فرلانگ دور لے گیا۔ یہ نہایت مشکل وقت تھا۔ آج بھی یاد کرتا ہوں تو کپکپی آ جاتی ہے۔ اس

اس دلچسپ کہانی کا آغاز گھوڑی چوری کے ایک واقعے سے ہوا۔ گاؤں کے کاشت کار دینو کی گھوڑی طویلے سے غائب ہو گئی۔ یہ اعلیٰ نسل کی بڑی تیز گھوڑی تھی۔ دینو کے پاس کسی کی امانت تھی۔ گھوڑی کے اصل مالک کا نام گلزار احمد تھا۔ گلزار احمد گاؤں کے ایک کھانے پیتے زمیندار نذیر علی کا بیٹا تھا۔ شہر پڑھنے گیا ہوا تھا۔ مشہور تھی کہ ڈاکٹر بن کر آ رہا ہے۔ یہ گھوڑی شہر ہی میں اسے کسی انگریز کلکٹر سے ملی تھی۔ گلزار اسے اپنے پاس ہاسٹل میں نہیں رکھ سکتا تھا لہذا یہاں دینو کے پاس چھوڑ گیا تھا۔ دینو اس کے بچپن کا دوست تھا لہذا بڑی اچھی طرح گھوڑی کی دیکھ بھال کر رہا تھا۔ پچھلی عید پر جب گلزار چند روز کے لیے گاؤں آیا تھا تو دینو نے صاف ستھری لشکارے مارتی گھوڑی کو بڑے چاؤ کے ساتھ گلزار کے سامنے لا کھڑا کیا تھا اور گلزار دو تین دن بڑے ٹھٹ سے گھوڑی پر فرائے بھرتا رہا تھا۔ میں نے بھی یہ گھوڑی دیکھی تھی واقعی بڑے کمال کی چیز تھی۔ اس وقت میں نے گلزار کو مشورہ دیا تھا کہ وہ اسے دھیان سے رکھے۔ رسہ گیری کے کیسوں میں عام طور پر ایسے ہی جانور غائب ہوتے ہیں۔

اور آج اس بات کے ٹھیک چھ ماہ بعد گھوڑی غائب ہو گئی تھی۔ صبح قریب آٹھ بجے اس واقعے کی اطلاع تھانے پہنچی۔ ان دنوں میں سب انسپکٹر تھا۔ امرتسر کے مضافات میں یہ راپور نامی گاؤں کا تھا نہ تھا۔ گاؤں میں پچاس فیصد آبادی سکھوں کی اور باقی ہندوؤں مسلمانوں کی تھی۔ تھانہ گاؤں کی آبادی سے کچھ ہٹ کر تھا۔ دینو کا گھر تھانے سے بمشکل سو گز دور ہوگا۔ تھانے کے اس قدر قریب واردات ہو جائے تو پولیس کو شرمندگی محسوس ہوتی ہے۔ اس وقت ہوتی تھی آج کل کا پتہ نہیں۔ ویسے بھی چوہدری نذیر کے بیٹے کی گھوڑی تھی۔ چھوٹا موٹا معاملہ نہیں تھا۔

میں دو سپاہیوں کے ساتھ موقعہ واردات پر پہنچا۔ طویلے ایک چھوٹے سے برآمدہ

وقت میرے کان میں ایک لکارا کرتی ہوئی آواز پڑی تھی۔ ”حصولہ کر بھائی! میں بھی آ رہا ہوں۔“ پھر چند لمحوں بعد میں نے لمبے ترنگے اچھو کو اپنے قریب پایا تھا۔ اس نے میرے ساتھ مل کر دیوانہ وار لہروں کا مقابلہ کیا تھا۔ ایک عورت تو ہمارے ہاتھوں سے نکل گئی تھی لیکن دوسری کو ہم بچانے میں کامیاب رہے تھے۔

اس واقعے کے بعد اشرف عرف اچھو میرے بہت قریب آ گیا تھا۔ وہ واقعی ایسا نوجوان تھا کہ اس کی قدر کی جاتی۔ پھر تیل، مڈر، ذہین اور چھپتے کی طرح چوکنہ۔ بس خامی اس میں یہی تھی کہ شریف نہیں تھا اور یہ ایک خامی اس کی ساری خوبیوں پر بھاری تھی۔ میں اسے اکثر سمجھا تا رہتا تھا اور وہ کچھ کچھ بدل بھی گیا تھا لیکن وہ جو کہتے ہیں کہ چھپتی نہیں منہ سے یہ کافر لگی ہوئی بد معاشی کی لت بھی جاتے جاتے جاتی ہے اور کبھی ہزار کوشش کے باوجود نہیں جاتی۔ شراب پینا، جوا کھلنا، وارداتیں کرنا، عورتوں کو پھسلانا، یہ ساری ”خوبیاں“ اچھو شہر سے ہی لے کر آیا تھا۔ شراب، جوئے اور عورتوں سے چھپڑ چھاڑ کا چکا تو وہ گاؤں میں ہی پورا کر لیتا تھا لیکن واردات وہ میرے تھانے کے علاقے میں نہیں کرتا تھا۔

دینو کے طویلے کا بغور جائزہ لینے کے فوراً بعد مجھے اندازہ ہوا تھا کہ یہ واردات اچھو نے کی ہے۔ اس کی وجہ طریقہ واردات تھا۔ اچھو بانس کے ذریعے چھت پر چڑھا تھا۔ بانس کے ذریعے چھلاگ لگانے کا رواج ان دنوں عام تھا۔ راہور میں تین جوان ایسے تھے جو ابلی چھلاگ لگانے میں بڑی مہارت رکھتے تھے۔ ان میں دو سکھ تھے اور ایک مسلمان۔ مسلمان تو اچھو خود تھا اور سکھ زرنجن سنگھ اور گوپال سنگھ تھے۔ اتفاق کی بات ہے کہ جس رات واردات ہوئی زرنجن سنگھ اور گوپال سنگھ عرف کو پی ایک قریبی تھانے کے حوالات میں بند تھے۔ ان کی غیر موجودگی میں میرا دھیان فوراً اچھو کی طرف چلا گیا۔ اس شبے کو ”گھرے“ نے مضبوط کیا اور پھر گاؤں میں اچھو کی غیر موجودگی نے اس شبے کو یقین میں بدل دیا۔

انگریز کلکٹر کی دی ہوئی گھوڑی کو برآمد کرنا بہت ضروری تھا۔ چوری کی خبر پا کر گھوڑی کا موجودہ مالک یعنی گلزار احمد خود بھی گاؤں آدھکا تھا اور ہر وقت میرے سر پر سوار رہتا تھا۔ میں پوری تندہی سے کوشش کر رہا تھا کہ اچھو کا سراغ ملے۔ مجھے یہ الزام اپنے سر لینا منظور نہیں تھا کہ اچھو کا میرے پاس اٹھنا بیٹھنا ہے اس لیے میں اسے ڈھیل دے رہا ہوں۔ آٹھ دس روز گزر گئے لیکن اچھو کا کچھ پتہ نہیں چلا اچھو کا بڑا بھائی اکبر کھیتی باڑی کرتا تھا۔ وہ بھلا مانس آدمی تھا۔ اچھو کی بد عادتیں اسے ایک آنکھ نہیں بھاتی تھیں۔ دونوں بھائیوں میں اکثر گالی گلوچ ہو جاتا تھا۔ اگر ماں زندہ نہ ہوتی تو شاید اچھو اس گھر میں رہ ہی نہ سکتا۔ اس کے علاوہ

بھائی بھی دیور کی طرف داری کرتی تھی اور جب کبھی دونوں بھائیوں میں زیادہ ٹھن جاتی تو وہ خاندان کو سمجھا بھجا کر دیور کو گاؤں بدر ہونے سے بچا لیتی تھی۔ میں نے اچھو کے بھائی اکبر کو اعتماد میں لیا اور بڑے ڈھنگ کے ساتھ اس سے بات چیت کی۔ میرا خیال تھا کہ شاید وہ اچھو کے بارے میں کچھ جانتا ہوگا لیکن یہ اندازہ غلط نکلا۔ کافی کوشش کے باوجود میں اچھو کے بارے میں اس سے کچھ معلوم نہ کر سکا۔ واردات کے سلسلے میں میں نے دو اور افراد کو بھی مشتبہ بٹھا رکھا تھا۔ ان میں کرن سنگھ نام کا ایک بندہ خاصا بدنام تھا۔ وہ اس سے پہلے بھی گاؤں کے زمینداروں کی دو تین گھوڑیاں کھول چکا تھا لیکن یہ تازہ واردات اس نے نہیں کی تھی۔ اس بات کا مجھے پکا یقین تھا۔

کئی روز بعد بھی جب کامیابی کی کوئی صورت نہیں نکلی تو میں نے ایک چال چلی۔ میں نے کرن سنگھ کو گرفتار کر لیا۔ عدالت سے اس کا ریمانڈ لے لیا اور دو تین دن بعد یہ اعلان کر دیا گیا کہ کرن سنگھ نے اقبال کر لیا ہے۔ اُس نے تسلیم کیا ہے کہ دو ہفتے پہلے دینو کے طویلے سے گھوڑی اُسی نے چرائی تھی لیکن پھر یہ گھوڑی اس سے بھی چوری ہو گئی۔ وہ گھوڑی لے کر کپور تھلہ گیا تھا کہ رات کو کوئی گھوڑی کھول کر لے گیا۔

چوبیس گھنٹے کے اندر اندر اس بات کی خبر دور و نزدیک پھیل گئی کہ ڈاکٹر گلزار احمد کی گھوڑی دینو کے طویلے سے چرانے والا کرن سنگھ تھا اور اُس نے اقبال جرم کر لیا ہے۔ اس واقعے کے ایک ہفتے بعد اچھو گاؤں واپس آ گیا۔ میری اُس سے ملاقات ہوئی۔ میں نے پوچھا۔

”کہاں رہے ہوا تھے دن؟“

وہ اپنے لمبے چوڑے ہاتھ سے ٹھوڑی کھجا کر بولا۔ ”پسور گیا ہوا تھا۔ ایک پرانے یار کی شادی تھی۔ بڑا آلو کا کن ہے وہ آنے ہی نہیں دیتا تھا۔“ میں تیز نظروں سے اُسے گھور رہا تھا۔ وہ گڑبڑا کر نیچے دیکھنے لگا۔ پھر ذرا سنہبل کر بولا۔ ”یار تھانیدار! سنا ہے کوئی گھوڑی شوڑی چوری ہو گئی ہے گاؤں سے؟“

میں نے اُس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ”اچھو! تجھے کہا تھا ناں میرے سامنے نہ آنا۔ تو پھر بھی باز نہیں آیا۔“

”کیا مطلب؟“ وہ اطمینان سے بولا۔

”مطلب کا تجھے اچھی طرح پتہ ہے۔ دیکھ میں تجھ سے زیادہ بک بک کرنا نہیں چاہتا۔ نہ ہی چاہتا ہوں کہ ہماری دو قی امتحان میں پڑے اس لیے چپ چاپ گھوڑی واپس لا کر دینو

کے طویلے میں باندھ دے۔“

پہلے تو اچھو نے آئیں بائیں شائیں کی لیکن جب اُسے اندازہ ہوا کہ میں آسانی
اُس کا پیچھا چھوڑنے والا نہیں اور مجھے اس بات کا پورا پورا یقین ہے کہ گھوڑی کھولنے والا
ہے تو اس نے ہتھیار ڈال دیئے اور مان گیا کہ گھوڑی اُسی کے پاس ہے۔ اگلے روز
سویرے مسروقہ گھوڑی دینو کے طویلے کے سامنے پائی گئی۔

گاؤں بھر میں کسی کو معلوم نہیں ہوا کہ گھوڑی نکالنے اور واپس لانے والا اچھو تھا۔
نے بھی اچھو پر کوئی کارروائی نہیں ڈالی۔ اُس نے میری بات مان لی تھی لہذا ضروری تھا کہ
بھی اُسے کچھ رعایت دوں..... ہاں..... اگر وہ سیدھی طرح نہ مانتا تو پھر میں نے کوئی کر
نہیں چھوڑنی تھی۔ بے شک وہ میرا دوست تھا (اور اُس نے میری جان بچائی تھی) میں اُس
سے وہی سلوک کرتا جو چوروں، رسہ گیروں سے کیا جاتا ہے۔ میری بروقت کارروائی سے
ڈاکٹر گلزار کی نایاب گھوڑی بچ گئی ورنہ چند دن اور گزر جاتے تو اچھو اُسے ایک وڈیرے کے
پاس فروخت کرنے کا پکا ارادہ کر چکا تھا۔ وڈیرے نے اُسے گھوڑی کے بدلے آٹھ سو روپے
دینا تھا۔ یقینی بات تھی کہ وہ یہ رقم لے کر شہر چلا جاتا اور پھر کئی ماہ تک اُس کی شکل دیکھنا نصیب
نہ ہوتی۔

اس واقعے کے دو تین ماہ بعد ہی گلزار احمد شہر سے گاؤں واپس آ گیا۔ یعنی مستقل طور
آ گیا۔ وہ ڈاکٹری کی تعلیم مکمل کر چکا تھا اور اب امرتسر میں پریکٹس کا ارادہ رکھتا تھا۔ چونکہ
گاؤں سے امرتسر کا فاصلہ زیادہ نہیں تھا لہذا ڈاکٹر کو گاؤں میں ہی رہنا تھا۔ ڈاکٹر درمیانے نہ
کا بانکا جیلا نو جوان تھا۔ کھاتے پیتے گھرانے کا تھا اور سب سے بڑی بات یہ کہ ڈاکٹر تھا۔
سارے گاؤں میں اُس کا چرچا ہونے لگا۔ خاص طور پر گاؤں کی نو جوان لڑکیاں تو اُسے
کھڑکیاں کھول کر دیکھتیں اور آتے جاتے اُس کی راہ میں آنکھیں بچھاتیں۔ کئی گھرانوں کی
عورتیں اس چکر میں تھیں کہ چوہدری نذیر کے گھر والوں کے ساتھ زیادہ سے زیادہ میل جول
رکھا جائے۔ سب کو پتہ تھا کہ اب ڈاکٹر گلزار کی شادی ہونی ہے اور ڈاکٹر گلزار نے یہ بات
اُڑائی ہوئی تھی کہ وہ گاؤں کی لڑکی سے شادی کرے گا۔ یہ بات اُڑا کر ڈاکٹر گلزار نے بڑے
ہوشیاری دکھائی تھی۔ میں پہلی بار ڈاکٹر کی صورت دیکھ کر ہی سمجھ گیا کہ وہ رنگ رگیلا لڑکا ہے۔
شہر میں یار لانے کے بعد اب وہ گاؤں میں آنکھ منکھ کا مزہ لینا چاہتا تھا۔

ایک روز میں اور بلال شاہ تھانے کے صحن میں بیٹھے ”زمیندار اخبار“ پڑھ رہے تھے۔
اچھو وہاں آدھمکا۔ گو وہ بد معاشی میں پاؤں رکھتا تھا لیکن اپنی ظاہری ٹیپ ٹاپ رکھتا تھا۔

تہبند، بے داغ قیص جس میں اکثر چاندنی کے بٹن لگے ہوتے تھے۔ بالوں بھرے سینے پر
سونے کا چمکتا ہوا کینٹھا۔ گرم چادر کو گردن کے پیچھے سے گزار کر دونوں پلو دائیں بائیں آزاد
چھوڑ دیتا تھا۔ بالوں میں ہمیشہ مانگ نکال کر رکھتا تھا۔ اُس روز وہ تھانے میں آیا تو کافی برہم
دکھائی دیتا تھا۔ بلال شاہ نے ایک طرف کھسک کر اُس کے لیے جگہ چھوڑ دی۔ بلال شاہ کو وہ
”بہن کا ویر“ کہہ کر مخاطب کرتا تھا۔ ”بہن کا ویر“ گالی تو نہیں تھی لیکن بلال شاہ کو یہ خطاب
بہت بُر لگتا تھا کیونکہ گالی کی طرح تھا۔ کوئی اور ایسی حرکت کرتا تو بلال شاہ اُس کی جان لے
لیتا لیکن اچھو یہ بات اتنے پیار سے کرتا تھا کہ بلال شاہ بیچ و تاب کھانے کے سوا اور کچھ نہیں
کر پاتا تھا۔

اچھو نے پھکی سی مسکراہٹ ہونٹوں پر سجا کر بلال شاہ کی طرف دیکھا اور کہا ”اوئے
بہن کے ویر تو یہاں کیا کر رہا ہے۔ چل ذرا مجھے تھانیدار صاحب سے ایک بات کرنے
دے۔“

بلال شاہ سمجھ گیا کہ کوئی اہم بات ہے اس لیے وہ تکرار کیے بغیر وہاں سے نکل گیا۔ اچھو
عادت کے مطابق کچھ دیر اُلٹے ہاتھ سے اپنی ٹھوڑی کھجاتا رہا پھر کھوئی کھوئی آواز میں بولا۔
”یار تھانیدار! مجھے دال میں کچھ کالا نظر آ رہا ہے۔ یہ سور کا پتھر گلزار جو ہے کہیں اپنی
ڈاکٹری سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش نہ کرے۔“

”میں کچھ سمجھ نہیں۔“ میں نے ٹوپی سر سے اتارتے ہوئے کہا۔

وہ بولا۔ ”یار! یہ نوری بڑا جارہی ہے ڈاکٹر کی طرف۔ اس نے دو خانہ کھولا ہے ناں پل
کے پاس..... وہاں دو تین دفعہ جا چکی ہے۔ کہیں کوئی گڑبڑ نہ ہو جائے۔“

میں نے کہا۔ ”تیرا کام پکا ہے تو پھر گڑبڑ کی کیا فکر۔ ٹو نے بات کر لی ہوئی ہے ناں۔“
وہ بولا۔ ”بس کچی کچی سی بات ہے۔ پتہ نہیں کیا ہو جاتا ہے مجھے اس کے پاس جا کر
بڑی بڑی دجنگ گڑیاں دیکھی ہیں لیکن سچی بات ہے یار ایسے پسینے میرے کبھی نہیں چھوٹے۔
پچھلے سے پچھلے جمعے ایک شادی پر ملاقات ہوئی تھی..... بات کرنے کا موقع بھی ملا لیکن عین
وقت پر دو تین اور لڑکیاں ٹپک پڑیں۔ سارا ستیاناس ہو گیا۔“

اچھو اور نوری کی بھی عجب کہانی تھی۔ نوری اس کی سگی خالہ کی بیٹی تھی۔ بچپن میں اکٹھے
کھیلے تھے۔ اچھو کے دل میں شروع سے نوری کی محبت تھی لیکن اپنی محبت کا اظہار وہ کبھی نوری
سے نہ کر سکا۔ پھر وہ لاہور اور بعد میں کراچی چلا گیا۔ وہاں جا کر اُس کا رہن سہن اور طور اطوار
بالکل بدل گئے۔ اب وہ ایک خزانہ بد معاش تھا اور شہر میں کئی عورتوں کو جوانی کے جوہر دکھا

جب اچھو نے نوری کا ذکر کر کے اپنی فکر مندی بتائی تو مجھے اُس کی بات غور سے سنی پڑی۔ مجھے یقین تھا کہ اگر اچھو کو بدلنے میں میری کامیابی کا امکان بیس فیصد ہے تو نوری کا نوے فیصد ہے۔

میں نے اس سے پوچھا۔ ”بھئی اگر وہ ڈاکٹر کے پاس گئی ہے تو درجنوں دوسری عورتیں بھی جاتی ہیں۔ تمہیں اس میں کیا خطرہ ہے؟“

وہ بولا۔ ”یارتھاندار! نوری کی بات اور ہے۔ ذرا دماغ سے سوچو۔ نوری جیسی جوان خوبصورت لڑکی اکیلے کمرے میں ڈاکٹر کے سامنے ہو۔ وہ ٹوئیاں لگا لگا کر اُسے ٹوہ رہا ہو۔ اُس کا ہاتھ پکڑ کر نبض دیکھ رہا ہو، اسے الٹا سیدھا لٹا رہا ہو تو بتاؤ یا ردل میں کھد بد ہوتی ہے کہ نہیں۔ عورت مرد کا ساتھ تو تیل اور آگ کا ہوتا ہے۔ ڈاکٹر بھی آخر مرد ہی ہوتا ہے ناں۔ میری تو سمجھ میں نہیں آتا لوگ اپنی جوان لڑکیوں کو ڈاکٹروں کے پاس کیوں لے جاتے ہیں۔“

میں نے کہا۔ ”اچھو، یہ سارا تیرے ذہن کا گند ہے۔ ڈاکٹری بڑا مقدس پیشہ ہے۔ لاکھوں میں کوئی ایک برا ہو تو اور بات ہے۔ ورنہ یہ بڑی بھلی مانس مخلوق ہوتی ہے۔ تیری میری طرح سوچیں نہیں ہوتیں ان کی۔“

تھوڑی دیر اچھو اور مجھ میں اس بارے میں گفتگو ہوئی اور پھر بات آئی گئی ہوگئی۔ یہ سات آٹھ روز بعد کی بات ہے۔ ایک روز بلال شاہ تھانے میں مجھ سے ملنے آیا تو اس کے چہرے پر دبا دبا جوش تھا۔ تنہائی میں مجھ سے کہنے لگا۔ ”خان صاحب! کچھ ڈاکٹر کے بارے میں سنا ہے آپ نے؟“

”کیا بات ہے؟“ میرے کان کھڑے ہو گئے۔ وہ بولا۔ ”وہی بات ہوئی ہے جس کا اچھو کو ڈرتھا۔ اُس ڈاکٹر نے توجے جیج نوری کو پھنسا لیا ہے۔ سارے گاؤں میں باتیں ہو رہی ہیں۔ کل شام جنونت تیلی کی گھر والی نے ڈاکٹر اور نوری کو بیلے میں باتیں کرتے دیکھا ہے۔“

بلال شاہ کی اطلاع واقعی سنسنی خیز تھی۔ ظاہر ہے کوئی نہ کوئی بات تھی تو نکلی تھی۔ میں نے نوری کو کئی بار دیکھا تھا۔ وہ اچھے قد کا ٹھہ کی خوبصورت لڑکی تھی۔ پھڑکتے ہونٹ، بولتی ہوئی آنکھیں، اُس کے جسم کی سب سے خوبصورت چیز اُس کے بال تھے۔ بہت بوجھل اور لمبے بال۔ موٹی چوٹی اُس کے گھٹنوں تک پہنچتی تھی۔ رنگین پھندوں والا پراندہ ناگوں میں الجھتا رہتا تھا۔ ایسی لڑکیاں سر راہ کھلے ہوئے پھول کی طرح ہوتی ہیں۔ جلد یا بدیر کسی کا ہاتھ اُن

چکا تھا لیکن کچھ بھی تھا نوری کی محبت اب بھی اس کے دل میں قائم دائم تھی۔ جب ایک پہلے وہ گاؤں واپس آیا تھا تو نوری کی بھرپور جوانی دیکھ کر بالکل ہی لٹو ہو گیا تھا۔ اُس نے یہ کیا تھا کہ جس طرح بھی ہو سکے نوری کو حاصل کرے گا۔ اُس نے دل کی بات اپنے گھر والوں سے بھی کہہ دی تھی اور انہیں کہا تھا کہ وہ نوری کا رشتہ مانگیں۔ اچھو کی والدہ خود بھی چاہتی تھی کہ بیٹے کو بہن کی طرف بیاہیں لیکن بیٹے کے لچھن بھی نظر میں تھے۔ لہذا سب گھر والوں نے مل جل کر اچھو کو سمجھایا تھا کہ وہ اپنے طور اطور ٹھیک کرے اور پہلے خود کو نوری کے قابو بنائے۔ اچھو کے دل کو نوری کچھ ایسی لگی تھی کہ وہ اُس کے لیے سب کچھ کرنے پر تیار ہو گیا تھا۔ اُس نے بری صحبت میں اٹھنا بیٹھنا بہت کم کر دیا تھا۔ وارداتیں بھی تقریباً چھوڑ دی تھیں اور اگر کبھی کرتا بھی تھا تو کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوتی تھی۔ ویسے بھی علاقے کا ماحول ہر طرح تھا کہ جو ”گھرو“ تین چار بار پولیس کے چھتر نہ کھالے اسے گھر وہی نہیں سمجھا جاتا تھا۔ آج کے مسئلہ روزگار کا تھا۔ اچھو کو ٹیکسی چلانے کے سوا اور کوئی کام نہیں آتا تھا اور گاؤں میں ٹیکسی چلائی نہیں جاسکتی تھی۔ بھائی کے ساتھ مل کر ہل چلانا یا کھیت مزدوری کرنا وہ اپنی شان کے خلاف سمجھتا تھا۔ نت نئے کپڑے اور لشکارے مارتی جوتی پہن کر پھرنا اُس کا محبوب مشغلہ تھا اور چھوٹی موٹی استادیاں دکھانے سے جو پیسے ملتے تھے اُن سے گزارا چلتا رہتا تھا۔ ایک بات بڑے مزے کی تھی۔ بے حد خراٹ اور نڈر ہونے کے باوجود جب اچھو نوری کے سامنے جاتا تو اس کی بولتی بند ہو جاتی تھی۔ لڑکیوں اور میاروں کے سلسلے میں اُس کا سارا تجربہ دھڑکے کا دھڑکا رہتا تھا اور وہ کوشش کے باوجود اُس سے ایک لفظ نہیں کہہ پاتا تھا۔ پچھلے برس میں وہ کم از کم دس دفعہ اپنی خالہ زاد سے اظہارِ محبت کی کوشش کر چکا تھا لیکن ناکامی ہوتی تھی۔ یہ بات نہیں کہ اس کے دل میں کوئی چور تھا۔ جہاں تک میں سمجھ پایا ہوں وہ اپنے جذبے میں بالکل سچا تھا۔ وہ نہ صرف نوری کے ساتھ گھر بسانا چاہتا تھا بلکہ اُس کے لیے نوا بالکل بدل دینا چاہتا تھا۔ اور بدل بھی رہا تھا لیکن وہ نوری کے سامنے کبھی بھی یہ نہ کہہ سکا۔ اُسے چاہتا ہے۔

اچھو بڑی زبردست صلاحیتوں کا مالک تھا۔ اگر وہ نیک بھی ہوتا تو لاکھوں میں آباد ہوتا۔ یہی وجہ تھی کہ بدنام ہونے کے باوجود میں نے اُس سے دوستی لگا رکھی تھی اور اُسے راست پر لانے کی کوششیں کرتا رہتا تھا۔ کبھی کبھی میرا دل چاہتا تھا کہ وہ سدھر جائے تو کوشش کر کے اُسے پولیس میں ملازمت دلوا دوں لیکن اپنے اس ارادے کا ذکر میں نے اچھو سے کبھی نہیں کیا۔

تک پہنچ جاتا ہے۔ وہ کسی گھر کے گلدان میں جا بستی ہیں یا پتی پتی ہو کر کھر جاتی ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ میں اُس کے بارے میں اکثر اچھو کو سمجھا تا رہتا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ اگر وہ واقعی نوری کے بارے میں سنجیدہ ہے تو پھر اُسے اپنانے میں دیر نہ کرے۔ پہلے اپنے روزگار کا بندوبست کرے پھر والدین کے ذریعے نوری کا رشتہ مانگے اور اُسے بیوی بنا لے۔ اب جو باتیں سننے میں آرہی تھیں یہ بڑی خطرناک تھیں۔ میں اچھو کے مزاج کو بہت اچھی طرح سمجھتا تھا۔ وہ ہار ماننے والا یا پیچھے ہٹنے والا شخص نہیں تھا..... پھر نوری پر تو اس نے بہت دیر سے اُس لگا رکھی تھی۔ وہ کیسے برداشت کر سکتا تھا کہ وہ ڈاکٹر کی بانہوں میں جا کرے۔ مجھے خطرہ محسوس ہونے لگا کہ کہیں اچھو ڈاکٹر سے دنگا فساد نہ کرے۔ میں نے دوپہر کے وقت بلال شاہ کے ہاتھ اُسے تھامنے بلوایا۔ وہ پہنچا تو نشے میں ڈھت تھا۔ گریبان کھلا ہوا، آنکھیں سُرخ اور دم ڈانواں ڈول۔ آج اُس نے تین چار ماہ بعد پتی تھی اور غالباً اتنی پتی تھی کہ اگلی پچھلی کسر نکال دی تھی۔ مجھے افسوس ہوا کہ ایسی حالت میں میں نے اُسے کیوں تھامنے بلالیا۔ بہر حال اب کیا ہو سکتا تھا۔ میں اُسے اپنے کمرے میں لے گیا اور اندر سے کنڈی لگا دی۔ وہ نشے میں واہی تباہی بکنے لگا۔ پہلے اس نے ڈاکٹر گلزار کو بے تحاشا گالیاں دیں پھر نوری پر غصہ نکالنے لگا اور جب اس کام سے بھی تھک گیا تو اپنے آپ کو برا بھلا کہنے لگا۔

”اچھا ہوا ہے اچھو صاحب! اچھا ہوا ہے تم اسی لائق تھے۔ حرامی! نہ کوئی کام نہ کار، نہ گھر نہ بار اور چلے ہو عشق فرمانے۔ اچھا جوتا پڑا ہے تمہارے منہ پر۔ اب اگر رتی بھر بھی غیرت ہے تو ڈوب مرو کہیں.....“ کتنی ہی دیر وہ یونہی خود کو کوسنے دیتا رہا۔ میں نے اسے بڑی مشکل سے سنبھالا۔ سر پر ٹھنڈا پانی ڈال کر اور اچار وغیرہ کھلا کر اس کا نشہ کچھ کم کیا اور اُس رات اُسے اپنے ساتھ ہی کوارٹ میں لے گیا۔ میں نے بڑے ہمدردانہ لہجے میں اُسے سمجھا یا کہ وہ پریشانی کے عالم میں اپنے حواس سے نااط نہ توڑے۔ سنی سنائی باتوں پر اتنی جلدی یقین نہیں کر لینا چاہیے اور پھر نوری کوئی چھوٹی سی بچی تو نہیں۔ اپنا اچھا برا سمجھتی ہے۔ اُسے بھی معلوم ہوگا کہ لڑکیوں کو چکر دینا گلزار کا پرانا مشغلہ ہے۔ وہ اتنی آسانی سے اُس کی باتوں میں نہیں آئے گی۔ وہ ماسی جھننے کی بیٹی ہے کوئی مذاق نہیں۔

سمجھانے کو تو میں نے اچھو کو سمجھا دیا اور وقتی طور پر اس کا غصہ بھی کم ہو گیا لیکن اصل بات وہی نکلی جو گاؤں میں مشہور ہوئی تھی۔ ڈاکٹر اور نوری میں میل ملاپ ثابت ہو گیا۔ پتہ چلا کہ نوری کے والد ہیبت نے اُسے بری طرح مارا ہے اور اُس کا گھر سے ٹکنا بالکل بند کر دیا ہے۔ دوسری طرف ڈاکٹر بھی کئی روز تک گاؤں میں نظر نہیں آیا۔ معلوم ہوا کہ وہ شہر میں اپنا

کلینک بنوا رہا ہے۔ اس دوران اچھو بھی گاؤں میں کم کم ہی نظر آتا رہا۔ پتہ نہیں کیا کرتا پھرتا تھا۔ مجھے معلوم تھا اُسے بہت دکھ پہنچا ہے۔ میں نے کئی مرتبہ کوشش کی لیکن اچھو سے ملنے میں کامیابی نہیں ہوئی..... اور پھر ایک روز بہت ہی دھماکہ خیز خبر گاؤں میں گونجنے لگی۔ مجھے یہ خبر سب سے پہلے اپنے اے ایس آئی باجوہ کی زبانی ملی۔ میں شہر میں ایک تاریخ بھگت کرواپس آ رہا تھا۔ تانگے پر سوار ابھی میں گاؤں سے چند فرلانگ دور ہی تھا کہ اے ایس آئی باجوہ دو سپاہیوں کے ساتھ بڑے تیز قدموں سے پنچایت گاہ کی طرف جاتا دکھائی دیا۔ جس جگہ کو پنچایت گاہ کہا جاتا تھا یہ ایک پرانا کنواں تھا۔ یہاں برگد کے گھنے درخت تھے اور ایک طرف ٹانک چندی اینٹوں کا بڑا سا چبوترہ بنا ہوا تھا۔ بیچ یہاں چار پائیاں ڈال کر بیٹھ جاتے تھے اور گاؤں کے لوگ نیچے کھڑے ہو کر پنچایت کی کارروائی دیکھتے تھے۔

میں نے اے ایس آئی سے پوچھا وہ کدھر بھاگا جا رہا ہے۔ جواب میں اُس نے کہا۔ ”ہم نے لڑکی نوری ڈاکٹر کے ساتھ پکڑی گئی ہے۔ دونوں دواخانے میں گھسے ہوئے تھے۔ گاؤں کی ایک عورت نے پکڑ لیا۔ نوری تو گھر آگئی ہے۔ ڈاکٹر کو لوگ سیدھا پنچایت میں لے گئے ہیں۔“

میں فوراً تانگے سے اُتر اور اے ایس آئی کے ساتھ ہی پنچایت گاہ کی طرف چل دیا۔ پنچایت گاہ میں دور ہی سے ہجوم نظر آ رہا تھا۔ چبوترے کے ارد گرد دیہاتی مکلو یوں کی صورت میں کھڑے تھے۔ بار بار کسی کے بلند لہجے میں بولنے کی آواز بھی آتی تھی۔ میں نے غور کیا تو پتہ چلا کہ ڈاکٹر کے والد چوہدری نذیر کی آواز ہے۔ ہم موقع پر پہنچے تو لوگوں نے دائیں بائیں ہٹ کر راستہ دیا۔ چبوترے پر نوری کے والد ہیبت اور ڈاکٹر کے والد چوہدری نذیر کے علاوہ آٹھ دس معتبر افراد موجود تھے۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر گلزار خود بھی نظر آ رہا تھا۔ وہ حسب معمول پتلون قمیص میں تھا۔ گھونگھریا لے بال پیشانی پر جھول رہے تھے۔ وہ سخت غصے میں نظر آ رہا تھا۔ یعنی خود شرمندہ ہونے کی بجائے وہ دوسروں کو شرمندہ کرنے پر ٹٹلا ہوا تھا۔ اُس کا والد بھی خاصا برہم دکھائی دیتا تھا۔ اُن کے مقابلے میں نوری کا باپ اور چچا وغیرہ دبے دبے نظر آتے تھے۔ گاؤں اور قصبوں وغیرہ میں رواج تھا کہ پولیس پنچایت کی کارروائی میں دخل نہیں دیتی تھی۔ میں بھی ایک طرف خاموشی سے بیٹھ گیا اور کارروائی کا جائزہ لینے لگا۔ وہاں بوسنے والی بحث سے پتہ چلا کہ نوری چوری چھپے ڈاکٹر کے دواخانے پر پہنچی تھی۔ جیسا کہ میں نے بتایا ہے یہ دواخانہ گاؤں کی آبادی سے کچھ ہٹ کر تھا۔ ظہر سے پہلے دواخانہ بند ہو جاتا تھا پھر ڈاکٹر گلزار امرتسر چلا جاتا تھا یا گھر واپس آ جاتا تھا۔ ایک بوڑھے نوکر ہاشو کے علاوہ رات

تھا۔ رات گئے پنجائیت کسی فیصلے پر پہنچے بغیر ختم ہو گئی۔

جوان لڑکی کی آبرو کا کچھ کے نازک پھول کی طرح ہوتی ہے۔ گناہ کی دھوپ نہ بھی پڑے تو بدنامی کی ہلکی سی ٹھیس سے ٹوٹ جاتا ہے۔ نوری کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا۔ وہ بد چلن نہیں تھی لیکن ڈاکٹر کی لچھے دار باتوں کا شکار ہو کر بدنامی کی ٹھوکروں میں آ گئی۔ وہی لڑکی جو کل تک پورے گاؤں کی آنکھ کا تار تھی اور جس کا سُرخ پھندوں والا پراندہ ہر گلی میں لشکارے مارتا پھرتا تھا۔ ذلیل و خوار ہو کر رہ گئی تھی۔ اُس کی ماں نے اُسے باپ کے قبر سے بچانے کے لیے قریبی گاؤں سہارن پور بھیج دیا تھا۔ سہارن پور میں نوری کی خالہ رہتی تھی۔ چند روز بعد اس واقعے کا شور کچھ کم ہوا تو نوری کی شادی کی بات ہونے لگی۔ بلال شاہ کو ایسی باتوں کا بہت پتہ ہوتا تھا۔ کسی سے رشتہ جوڑنا تو بلال شاہ کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ آج کل اُس نے نوری کی ماں سے بھائی کا رشتہ جوڑا ہوا تھا۔ نوری کی ماں کو ایک عجیب عادت تھی۔ وہ مٹی کھاتی تھی۔ خالص اور چینی مٹی کی تلاش میں وہ بعض اوقات دور تک نکل جاتی۔ نہریا ڈیک نالے کی تہہ سے گاچی جیسی مٹی ڈھونڈ کر لاتی اُسے دھوپ میں سکھاتی اور بڑے اہتمام سے کھاتی۔ اس نے ”بہن“ کورازداری سے بتایا کہ وہ خود بھی مٹی کھانے کا شوقین ہے۔ ظاہر ہے اس بات کے ثبوت کے لیے اُس نے ”بہن“ کو مٹی کھا کر بھی دکھائی ہوگی۔ یوں وہ دونوں مٹی خور بہن بھائی بن چکے تھے۔ اس رشتے کے سبب بلال شاہ کو نوری کے گھر میں ہونے والی ہر بات کی خبر رہنے لگی۔ اس نے مجھے بتایا۔ ”خان صاحب! بڑا پریشان ہے مہتا۔ کل اُس نے اپنے ایک بڑے بھائی اور چاچے کو سرگودھا سے بلایا ہوا تھا۔ وہ جلد از جلد نوری کا بارسر سے اتار پھینکنا چاہتے ہیں۔ اُن کا خیال ہے کہ دور و نزدیک میں جو بھی رشتہ ملے فوراً قبول کر لیا جائے اور بدنامی کی اس گٹھڑی کو سُرخ جوڑے میں لپیٹ کر دفع کیا جائے۔ اس سلسلے میں اچھو کا نام بھی آیا ہے۔ مہتے کا خیال ہے کہ نوری کی شادی اچھو سے کر دی جائے اور وہ اُسے لے کر شہر چلا جائے لیکن نوری کی ماں اب اس بات پر راضی نہیں۔ وہ کہتی ہے کہ پہلے میری بہن نوری کا رشتہ مانگتی تھی لیکن کوئی اُسے منہ نہیں لگاتا تھا اب میں کس زبان سے اُسے یہ بات کہوں۔“

بلال شاہ کی باتیں قابلِ غور تھیں۔ میں نے ایک سال تک اچھو کو پرکھا تھا اور اُس کے بارے میں بہت کچھ جانتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ اب بھی نوری کو خوشی سے قبول کر لے گا۔ اگر نوری سے ایک غلطی ہو گئی تھی تو کیا خود اچھو سے بے شمار غلطیاں نہیں ہوئی تھیں؟ اور پھر اس غلطی میں اچھو کا اپنا ہاتھ بھی تھا۔ اگر وہ خواہ مخواہ اتنی دیر نہ کرتا اور نوری سے دل کا حال کہہ دیتا تو کوئی وجہ نہیں تھی کہ نوری کی منہ زور جوانی ڈمگاتی اور اگر اُن کا رشتہ بھی ملے ہو گیا ہوتا تو

بھر دوا خانے میں اور کوئی نہیں ہوتا تھا لیکن آج ڈاکٹر دوا خانے میں ہی تھا۔ شام سے تقریباً دیر پہلے نوری دوا خانے میں تھکی تو جسونت تیلی کی گھر والی تاباں نے اسے دیکھ لیا۔ (اب عورت نے پہلے بھی ڈاکٹر اور نوری کے چکر کی خبر پھیلانی تھی۔ یوں لگتا تھا وہ ہاتھ دھو کر نوری کے پیچھے پڑی ہوئی ہے) تاباں نے شور مچایا تو بہت سے لوگ وہاں اکٹھے ہو گئے۔ اتنے بڑے نوری کا والد مہتا بھی اُسے تلاش کرتا ہوا دوا خانے پہنچ گیا۔ تاباں اُسے دیکھ کر بڑی کراہ آواز میں بولی۔ ”اندر دوا خانے میں ہے تیری بیٹی، ڈاکٹر سے علاج کروا رہی ہے۔ ابھی پڑ نہیں کتنی دیر میں نکلے گی۔ پون گھنٹہ تو ہمیں بھی ہو گیا ہے یہاں کھڑے ہوئے۔“

اتنے میں گاؤں کی مسجد کے امام صاحب بھی وہاں پہنچ گئے۔ لوگوں نے دوا خانے کے دروازے زور زور سے کھٹکھٹائے اور آوازیں دیں تو ڈاکٹر اور نوری باہر نکل آئے۔ نوری؛ والد درانتی لے کر نوری پر جھپٹا لیکن کچھ لوگ آڑے آ گئے۔ چند عورتیں نوری کو اپنے سامنے گاؤں لے آئیں۔ ڈاکٹر کو لوگ پنجائیت گاہ میں لے آئے اور اب یہ معاملہ بچوں کے سامنے پیش تھا۔ ڈاکٹر کا کہنا تھا کہ اس سارے معاملے میں اُس کا کوئی قصور نہیں نوری خود اُس کے پاس آئی تھی۔ وہ دوا لینا چاہتی تھی۔ دوا خانے کا وقت ختم ہو چکا تھا۔ وہ پھر بھی اصرار کر کے اندر آ گئی۔

ڈاکٹر کی باتوں پر یقین کرنا کسی کے لیے بھی ممکن نہیں تھا۔ سب اندر کی بات سمجھ رہے تھے۔ بچوں میں سے دو تین کا خیال تھا کہ یہ صرف نوری کا نہیں گاؤں کی عزت کا معاملہ ہے۔ بہتر ہے کہ اب نوری کے ماتھے سے بدنامی کا داغ دھونے کے لیے ڈاکٹر اُسے شادی کر لے۔ دیکھا جاتا تو یہ کوئی ایسی نہ ہونے والی بات نہیں تھی۔ ڈاکٹر خود کہہ چکا تھا کہ گاؤں کی لڑکی سے شادی کرے گا۔ نوری گاؤں کی لڑکیوں میں سے نہ صرف خوبصورت تر بلکہ تھی بلکہ چند جماعتیں پڑھی ہوئی بھی تھی۔ ویسے بھی کھاتے پیتے گھرانے سے تھی۔ یہ رشتہ طرح سے جوڑا تھا لیکن ڈاکٹر گلزار اور اُس کے رشتے دار یہ بات سن کر آگ بگولہ ہو گئے۔ سب نے زیادہ چوہدری نذیر گرج رہا تھا۔

”یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ میرا بیٹا ایسا گرا پڑا نہیں کہ مہتے جیسے بندے کا داماد بنے۔ نوری جیسی لڑکی کو تو میں نوکر نہ رکھوں۔ بہو بنانا تو دور کی بات ہے۔“

اس تنازعے پر ڈیڑھ دو گھنٹے گرما گرم بحث ہوئی۔ بحث میں چوہدری نذیر کا پلہ ہر طرف سے بھاری تھا۔ مہتا ایک تو حیثیت میں کمزور تھا دوسرے صورت حال بھی اُس کے حق میں نہیں تھی۔ جوان بیٹی کے اٹھے ہوئے ایک غلط قدم نے اُسے ہر نگاہ کے سامنے شرمسار کر دیا۔

دوست کی ٹیکسی تھی۔ ہم اُسے نہروالے پل پر لے گئے۔ یہاں میں نے شمشان گھاٹ کے اندر ٹیکسی رکوائی اور باہر نکال کر سالے کو پھینٹی لگائی۔ پہلے تو ماں کے دیر نے بڑی چمک دکھائی۔ ایک دو کئی بھی مارے میرے منہ پر لیکن پھر چڑھ گیا میرے ٹیٹے۔ مار مار کر بھر کس نکال دیا کبتر کے ختم کا۔ اللہ نے چاہا تو دو مہینے اٹھ نہیں سکے گا چار پائی سے۔“

”لیکن اب کہاں ہے وہ؟“ میں نے پوچھا۔

”ہوگا اسپتال میں یا کسی دوا خانے میں۔“

”کوئی ہاتھ پاؤں تو نہیں توڑ دیا اُس کا؟“

”ٹوٹا ہوگا ضرور ٹوٹا ہوگا۔ اچھو کے ہاتھ لگے ہیں اُسے، کوئی ٹول نہیں ہے۔“ وہ نفرت سے فرش پر تھوک پر بولا۔

یہ دفعہ 320 کا کیس تھا۔ میں جلد جلد حساب لگانے لگا کہ پرچہ کٹایا گیا تو قانون کے دائرے میں رہ کر اچھو کے ساتھ زیادہ سے زیادہ رعایت کیا ہو سکتی ہے۔ یہ بات تو اچھو بھی جانتا تھا کہ میں نے اُس کی ناجائز حمایت کبھی کی ہے اور نہ کروں گا۔ بے شک ڈاکٹر گلزار کو میں بھی اچھا نہیں سمجھتا لیکن اپنی ذاتی رائے کو سامنے رکھ کر اُس کے خلاف کوئی قدم اٹھانا میرے لیے لفظی ناممکن تھا۔ میں نے جو کچھ کرنا تھا قانون کی ہدایت کے مطابق کرنا تھا۔

بارش کی وجہ سے گاؤں سنسان پڑا تھا۔ کسی بندے بشر نے اچھو کو میرے کوارٹر میں داخل ہوتے نہیں دیکھا تھا۔ میں نے مناسب سمجھا کہ وہ خاموشی کے ساتھ رات یہیں گزار لے۔ اس دوران میں اُسے سمجھا بجھا بھی سکتا تھا۔ میری طبیعت خراب تھی۔ اس لیے بلال شاہ شام کو میرے لیے جو کھانا لایا تھا وہ جوں کا توں پڑا تھا۔ میں نے انگیٹھی پر رکھ کر یہ کھانا دوبارہ گرم کر دیا۔ بکرے کے پائے کا سالن تھا۔ تندوری روٹی تھی اور تھوڑے سے میٹھے چاول تھے۔ اچھو نے سیر ہو کر کھانا کھایا۔ پھر تہبند کی ڈب سے سگریٹ نکال کر پینے لگا۔ وہ آٹھ دس دن بعد گاؤں آیا تھا۔ میں نے اُسے وہ باتیں بتائیں جو بلال شاہ کی زبانی مجھ تک پہنچتی رہتی تھیں۔ میں نے اُسے اطلاع دی کہ نوری کو ایک ڈیڑھ ماہ کے اندر بیانے کی بات ہو رہی ہے اور نوری کے رشتے کے لیے اُس کا نام بھی لیا جا رہا ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ اچھو کی بڑی بڑی خواہیدہ آنکھوں میں موہوم سی چمک پیدا ہو گئی ہے۔ وہ میری بات مزید غور سے سننے لگا۔

میں نے کہا۔ ”اچھو! جو کچھ ہوا وہ کچھ زیادہ اہم نہیں ہے۔ ڈاکٹر سے نوری کی میل ملاقات ایک وقتی سی بات تھی۔ اب پنچایت میں ڈاکٹر جو بکواس کر چکا ہے اس کے بعد نوری اُس کے منہ پر تھوکے گی بھی نہیں۔ اس وقت وہ ڈانوں ڈول ہے۔ تم نے اُسے سہارا دیا تو

سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ ڈاکٹر اُن کے درمیان کودتا۔ بہر حال پجانی کی کہات کے مطابق اب بھی گرے ہوئے بیروں کا کچھ نہیں بگڑا تھا۔ نوری اور ڈاکٹر کے تعلق کا پتہ ٹروڈ میں ہی چل گیا تھا۔ ابھی معاملہ اس حد تک نہیں بڑھا تھا کہ نوری کو بدچلن یا بدکار قرار دیا جاسکتا۔ نوری ڈاکٹر کے دوا خانے میں آدھ پون گھنٹہ موجود رہی تھی لیکن اُس وقت بوڑھا ملازم ہاشو بھی اندر موجود تھا اور اُس نے مسجد میں جا کر قسم کھائی تھی کہ نوری اور ڈاکٹر صرف ”باتیں“ کرتے رہے تھے۔

یہ دور وز بعد کی بات ہے۔ سردی اپنے زوروں پر تھی۔ شام سے بوند باندی بھی ہو رہی تھی۔ میرے سرد میں درد تھا۔ اس لیے تھانے سے جلد ہی فارغ ہو کر اپنے رہائشی کوارٹر میں لیٹا ہوا تھا کہ دروازے سے باہر اچھو کے کھانسنے کی آواز آئی۔ اس کے ساتھ ہی کسی نے اپنے بھاری بھر کم ہاتھ سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ شبے کی کوئی گنجائش نہیں تھی کہ اچھو ملنے آیا ہے۔ میں پچھلے چند روز سے بڑی شدت کے ساتھ اُس کا انتظار کر رہا تھا۔ ایک دو دفعہ اُس کے گھر بلال شاہ کو بھی بھیج چکا تھا لیکن ہر دفعہ یہی پتہ چلتا تھا کہ وہ شہر گیا ہوا ہے۔ جلدی سے اٹھ کر میں نے دروازہ کھولا۔ اس کی صورت دیکھتے ہی مجھے چوکننا ہونا پڑا۔ وہ کسی سے لڑ کر آیا تھا۔ چہرے پر ایک دو جگہ چوٹوں کے نشان تھے۔ بال بکھرے ہوئے تھے اور گریبان ادھڑا ہوا تھا۔ گرم چادر سمیت اُس کا سارا لباس بری طرح بھیگا ہوا تھا اور بارش میں مزید بھیگ رہا تھا۔ وہ میرے ساتھ اندر آ گیا۔

”کیا کارنامہ کر کے آئے ہو؟“ میں نے کمرے میں پہنچ کر پوچھا۔

”کارنامہ تو نہیں کیا ایک جھوٹا سافرض پورا کیا ہے۔“ وہ بولا۔

”مثلاً؟“ میں نے وضاحت طلب کی۔

”اُس کتی کے پتر کو عشق بازی کا مزہ چکھایا ہے۔“

میں بری طرح چونک گیا۔ اچھو کا اشارہ یقیناً گلزار کی طرف ہی تھا۔ ”پوری بات بتاؤ۔“ میں نے تیزی سے پوچھا۔

”کوئی لمبی چوڑی بات نہیں۔“ وہ اپنی چادر اتار کر انگیٹھی کے قریب ہوتے ہوئے بولا۔ ”میں آج اُس کے دوا خانے گیا تھا۔۔۔۔۔ امرتسروالے دوا خانے میں۔ میں نے اُس سے کہا، تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے آؤ میرے ساتھ۔ وہ بولا میں تیرے حرامی باپ کا نوکر نہیں ہوں، دفع ہو جاؤ یہاں سے۔۔۔۔۔ بس پھر میں نے ایسا ہاتھ ڈالا مینٹو سے پرکے آواز نہیں نکل سکی سالے کی۔ گردن دبوچ کر جو اٹھایا تو سیدھا ٹیکسی میں لا پھینکا۔ یہ میرے ایک

ساری زندگی تمہاری ہو کر رہے گی۔“

میں نے محسوس کیا کہ میری باتیں اچھو کے دل پر اثر کر رہی ہیں۔ ممکن تھا کہ یہ باتیں پہلے ہی اُس کے دل میں موجود ہوں۔ بظاہر وہ سامنے دیوار کو دیکھ رہا تھا لیکن اُس کی آنکھوں میں وہ حسین پُر شباب جسم بھرا ہوا تھا جسے وہ بچپن سے چاہتا آیا تھا۔ وہ بے انتہاء بوجھل اور لمبے بال جنہوں نے ایک جال کی طرح اُس کی سوچوں کو جکڑے رکھا تھا..... وہ اپنی گمراہ زندگی کو راستے پر لانے کے لیے اب بھی نوری کا ضرورت مند تھا۔ اُسے اپنا نا چاہتا تھا۔

اُس وقت رات کے دو بجے تھے جب بیرونی دروازے پر زور کی دستک سنائی دی۔ میرا دھیان فوراً چوہدری نذیر کی طرف چلا گیا۔ وہ بیٹے کی مار پیٹ کی اطلاع دینے آیا ہو۔ کمرے کا دروازہ بند کر کے میں صحن میں آیا۔ ”کون ہے؟“ میں نے پوچھا۔ جواب میں بلال شاہ کی آواز سنائی دی۔ میں نے دروازہ کھولا۔ بارش بدستور جاری تھی۔ بلال شاہ کے بال بھیگ کر پیشانی سے چپکے ہوئے تھے۔ اُس کے چہرے پر بیچانی کیفیت تھی۔

”کیا بات ہے؟“ میں نے پوچھا۔

وہ بولا۔ ”اچھو نے ڈاکٹر گلزار کو قتل کر دیا ہے۔“ بلال شاہ کے الفاظ دھماکے کی طرح میرے کانوں میں گونجنے لگے۔ حیرت سے اُس کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ بولا۔ ”تھوڑی دیر پہلے امرتسر سے دو تین بندے آئے ہیں۔ انہوں نے چوہدری نذیر کو یہ بات بتائی ہے۔ ڈاکٹر گلزار کی لاش سول ہسپتال میں پڑی ہے۔ چوہدری اپنے کچھ رشتے داروں کو لے کر امرتسر گیا ہے۔ گلزار کی ماں کو غشی کے دورے پڑ رہے ہیں۔“

مجھے بلال شاہ کی باتوں پر یقین نہیں آ رہا تھا لیکن یقین کیے بغیر چارہ بھی نہیں تھا۔ ایک دم مجھے خطرہ محسوس ہوا۔ بلال شاہ بہت دھیمی آواز میں بولا تھا مگر رات کے سناتے میں یہ آواز اچھو کے کانوں تک پہنچ سکتی تھی۔ میں نے کمرے کے بند دروازے کی طرف دیکھا۔ عین اُس وقت دروازے میں حرکت پیدا ہوئی۔ پٹ کھلے اور اچھو کمرے سے نکل کر پوری رفتار سے بیرونی دیوار کی طرف بھاگا۔ یہ دیوار زیادہ اونچی نہیں تھی اور اچھو جیسا جنگلی گھوڑا ایک ہی جست میں یہ دیوار پھلانگ سکتا تھا۔ ایک لمحہ پہلے میرے ذہن میں پیدا ہونے والا اندیشہ فیصد درست ثابت ہوا تھا۔ اچھو نے بلال شاہ کی زبان سے نکلنے والے الفاظ سن لیے تھے اور اب گرفتاری سے بچنے کے لیے راہ فرار اختیار کر رہا تھا۔ یہ سوچنے کا نہیں کچھ کرنے کا وقت تھا۔ پلک جھپکتے میں اچھو میری نظروں سے اوجھل ہو سکتا تھا۔ میں نے چند قدم بھاگ کر اس پر جست کی اور صحن کے عین درمیان اُسے جالیا۔ ہم اوپر نیچے کچھ آلود صحن میں گرے اور

ہٹ ہو گئے۔ اچھو میرا محسن تھا اور دوست بھی، لیکن اس وقت وہ صرف ایک قاتل تھا اور مجھے اُس کو گرفتار کرنا تھا۔ میں نے ایک بھر پور مکہ اس کی ٹھوڑی پر جھپایا۔ جواب میں اُس نے میری پسلیوں میں زوردار گھٹنا مارا اور دوسرے پاؤں سے مجھے اچھال کر دور پھینک دیا۔ اس کے لمبے بڑے جسم میں کسی وحشی گھوڑے کا سازور تھا۔ میں اُس کے ذیل ڈول کو بڑی پسندیدگی کی نظر سے دیکھا کرتا تھا اور آج یہی ڈیل ڈول میرے مقابلے میں تھا۔ میں بیرونی دروازے کی طرف گرا تھا۔ یعنی اچھو بھاگنا چاہتا تو اس کے لیے ضروری تھا کہ مجھے راستے سے ہٹائے۔

اس نے بالکل کبڈی کے انداز میں مجھے جھپکی دینے کی کوشش کی۔ میں نے اُس کا یہ وار خالی کر دیا اور بھاگ کر اُسے جھپے میں لے لیا۔ اس بار ہم دونوں برآمدے کے اندر کمرے کے بالکل سامنے گرے۔ گرتے گرتے اچھو میرے ہاتھوں سے چکنی مچھلی کی طرح پھسل گیا اور سنبھل کر کمرے کی طرف بھاگا۔ پہلے تو مجھے اس کی یہ حرکت سمجھ میں نہیں آئی۔ پھر اندازہ ہوا کہ وہ میرے سرکاری ریوالور کی طرف گیا ہے جو دیوار سے لٹکا ہوا ہے۔ یہ بڑی خطرناک صورت حال تھی۔ میں نے ایک بار پھر اُس پر چھلانگ لگائی۔ میرا دھکا کھا کر وہ منہ کے بل دیوار سے ٹکرایا۔ پھر تیزی سے گھوما۔ مجھے نیچے جھکنے میں ایک ساعت کی تاخیر ہوتی تو اس کا تھوڑے جیسا مکا میرے جڑے کو ہلا دیتا۔ اُس کا وار خالی گیا تو میں نے رانوں میں ہاتھ دے کر اُسے اٹھایا اور پوری قوت کے ساتھ دیوار سے دے مارا۔ اُس کے حلق سے دردناک آواز نکلنے لگی۔ کوئی اور ہوتا تو اس چوٹ سے سنبھل نہ سکتا لیکن وہ لاہور اور کراچی کے بد معاشوں میں رہ کر اور رات دن مارا ماری کر کے بہت سخت جان ہو چکا تھا۔ شدید چوٹ کھا کر بھی وہ نہ صرف پاؤں پر کھڑا رہا بلکہ میرے پیٹ میں گھٹنا سید کرنے کی ایک ناکام کوشش بھی کر ڈالی۔ میں نے بچوں پر کھڑے ہو کر ایک زوردار دوہڑا اُس کی گردن پر مارا۔ وہ انگلیٹھی پر اوندھے منہ گرتے گرتے بچا۔ قریب ہی کھانے کے خالی برتن پڑے تھے۔ اچانک اُس نے نہ جانے کیا کیا۔ وہ تیزی سے گھوما اور میری آنکھوں میں مرچیں ہی مرچیں بھر گئیں۔ میں نے بڑی کوشش سے آنکھیں کھولنے کی کوشش کی لیکن ناکامی ہوئی۔

”بلال شاہ پکڑو اسے۔“ میں آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر چلایا۔

بلال شاہ ایک جھوٹی سی بڑھک مار کر اُس سے لپٹ گیا۔ ”چھوڑ دے مجھے بہن کے دیر نہیں تو بیٹ پھاڑ دوں گا۔“ اچھو کی خوفناک آواز میرے کانوں میں پڑی۔ پھر مجھے اندازہ ہوا کہ اچھو نے بلال شاہ کو اٹھا کر دروازے سے دے مارا ہے۔ یہ بڑی زبردست ٹکڑ تھی۔ دروازہ باہر سے کھلتا تھا۔ لہذا بلال شاہ کے نکلنے سے ایک پٹ چکن پُور ہو گیا۔ میں اندھوں کی طرح

بڑی تنہا نوری کو حاصل کرنا تھی اور یہ تنہا پوری ہوتی نظر آرہی تھی..... مگر اب وہ ایک قاتل تھا اُس کا نصیب نوری کی ہانہوں کا ہار نہیں چھانی کا پھندا تھا۔

اچھو مفور تھا اور اُسے گرفتار کر کے عدالت کے کٹھرے میں لانے کی پوری ذمہ داری مجھ پر تھی۔ میں نے پوری دیانتداری سے تفتیش شروع کی لیکن اُس کا کوئی کھوج نہیں ملا۔ مقتول کے لواحقین کی طرف سے زبردست دباؤ تھا۔ وہ تفتیش تبدیل کرنا چاہتے تھے تاہم اعلیٰ افسروں کو مجھ پر مکمل بھروسہ تھا۔ میں نے اپنا کام جاری رکھا۔ گلزار کی موت کے بعد اچھو کی والدہ، بڑا بھائی اور اُس کی بیوی بچے گاؤں سے رو پکھر ہو چکے تھے۔ اُن بے چاروں کو خدشہ تھا کہ اچھو کی کرنی اُن کے سامنے آئے گی اور گلزار کے وارث انہیں نقصان پہنچانے کی کوشش کریں گے۔

تقریباً دو مہینے اسی طرح گزر گئے۔ اچھو کا پتہ چلا اور نہ اُس ٹیکسی ڈرائیور کا جس نے واردات میں اچھو کی مدد کی تھی۔ بلال شاہ کی زبانی مجھے نوری کے گھر کی خبریں ملتی رہتی تھیں۔ وہ لوگ نوری کا رشتہ ڈھونڈ چکے تھے اور اب جلد از جلد اُسے گاؤں سے چلتا کرنا چاہتے تھے۔ اونچی لمبی پونے گئے جیسی نرم ملائم نوری کا نصیب امین نورین جیسے کھر درے مرد سے جوڑا جا رہا تھا۔ امین نورین یوں تو اسی گاؤں کا تھا لیکن اب اُس نے امرتسر میں مکان بنالیا تھا اور اب گاؤں میں اُس کا آنا کبھی کبھار ہی ہوتا تھا۔ دیکھنے میں بھلا مانس اور ذمے دار شخص نظر آتا تھا۔ اس کی عمر پینتیس کے قریب تھی۔ رنگ گندمی اور پیشانی سے بال اڑے ہوئے تھے۔ امین نورین کی ایک بیوی پہلے بھی تھی۔ شادی کے ایک ہی سال بعد ایک حادثے میں اُس کا نچلا دھڑ مفلوج ہو گیا تھا اور وہ بے کار چیز کی طرح گھر میں پڑی رہتی تھی۔ نہ کام کاج کے قابل تھی نہ بچے پیدا کر سکتی تھی۔ امین ایک سرکاری ورکشاپ میں ملازم تھا۔ یہاں سے اُسے معقول تنخواہ ملتی تھی۔ اس کے علاوہ اُس نے گاڑیوں کے سپئر پارٹس کی ایک دکان بھی کھول رکھی تھی۔ اچھی بھلی آمدن تھی۔ وہ ایک عرصے سے دوسری شادی کا خواہش مند تھا۔ نوری کے والدین سے اُس کی رشتہ داری بھی تھی۔ نوری کی دو بڑی بہنیں اور بھی تھیں۔ اُن کی شادی سے پہلے امین نوری کے والد سے اصرار کیا کرتا تھا کہ وہ اپنی ایک بیٹی دے کر اُس کا گھر بسا دے لیکن بہتے نے کبھی اُس کی بات پر کان نہیں دھرا۔ اب قدرت نے انوکھا کھیل دکھایا تھا۔ مجھے کو اپنی سب سے چھوٹی اور خوبصورت بیٹی کا ہاتھ امین کے ہاتھ میں تھما پڑ رہا تھا اور وہ بھی بڑی عاجزی کے ساتھ۔ نوری کی قسمت پر افسوس ہی کیا جاسکتا تھا۔ ایک چاہنے والے نے اسے دھوکا دیا، دوسرے نے غضب میں آکر چھانی گھاٹ کے راستے پر قدم رکھ دیا۔ اب وہ

مٹوٹا ہوا گھرے تک آپہنچا۔ آنکھوں میں ٹھنڈے پانی کے چھینٹے دیئے۔ اتنے میں ہی بیرونی دیوار سے فرار ہو چکا تھا۔ جیسا کہ بعد میں پتہ چلا اُس خبیث نے میرے چہرے سالن کا بچا ہوا شور بہ پھینکا تھا۔

ڈاکٹر گلزار کا قتل ہونا کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا۔ سارے علاقے میں دہائی جھج گئی۔ مگر لاش امرتسر نہر کے کنارے کالے شمشان گھاٹ میں پڑی پائی گئی تھی۔ رات گئے پر چونکدار نے لاش دیکھی تھی۔ اُس نے دوسرے لوگوں کو بتایا۔ قریبی تھانے میں اطلاع دی اور پولیس موقعہ پر پہنچ گئی۔ متوفی کے جسم پر کئی ضربات تھیں۔ ایک کلائی کی ہڈی بھی ٹوٹی ہوئی تھی۔ تاہم سب سے شدید ضربات اُس کے سر پر آئی تھیں۔ کپٹی اور پیشانی کے قریب دروازے تھے اور اُن میں سے خون رِس رِس کر پورے چہرے کو رنگین کر رہا تھا۔ رات تین بجے امرتسر جا کر میں نے خود موقعہ ملاحظہ کیا۔ اُس وقت تک لاش اٹھائی جا چکی تھی اور جہاں جہاں خبر کے دھبے تھے وہاں اینٹوں کی کیاریاں سی بنا دی گئی تھیں۔ موقع پر گاڑی کے پہیوں کے نشانات موجود تھے اور گیلی زمین پر دھینکا مشت کی آثار بھی صاف نظر آتے تھے۔ ڈاکٹر شہر والے دواخانے میں کم از کم تین گواہ ایسے موجود تھے جن کے سامنے اچھو دواخانے پر گھسا تھا اور اُس نے ڈاکٹر کو اٹھا کر ٹیکسی میں بٹھا دیا تھا۔ ٹیکسی پر کوئی نمبر پلیٹ نہیں تھی اور اُن ایک دبلا پتلا سکھ چلا رہا تھا۔ ٹیکسی ڈاکٹر کو لے کر روانہ ہو گئی تو محلے میں شور مچ گیا تھا۔ اُسکوٹر پر تین آدمی بیٹھ کر ٹیکسی کے پیچھے روانہ ہوئے تھے لیکن دس پندرہ منٹ بعد ناکام واپس آئے تھے۔

سب گواہیاں اچھو کے خلاف جاتی تھیں۔ اس بات میں اس شبے کی کوئی گنجائش نہ تھی کہ اچھو نے ڈاکٹر گلزار سے نوری کی بے عزتی اور بدنامی کا بدلہ لیا ہے۔ وہ پہلے دن گلزار کو اپنا رقیب سمجھتا تھا۔ اُس کے اندر دشمنی کے جذبات مسلسل پرورش پا رہے تھے۔ ڈاکٹر گلزار نے اُس کی خالہ زاد کو پورے گاؤں میں بدنام کر دیا تو وہ خود پر قابو نہ رکھ سکا۔ گلزار کو اتنا مارا کہ وہ جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔

یہ بات بالکل سامنے کی تھی کہ اچھو ڈاکٹر گلزار کو قتل کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اُس نے اُسے مار لگائی تھی جان سے نہیں مارا تھا۔ اگر اُس نے اُسے جان سے نہیں مارا ہوتا تو میرے پاس نہ آتا۔ اُس نے غلطی یہ کی تھی کہ اُسے نیم بے ہوش کر کے وہاں پھینک آئے۔ وہ زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے جاں بحق ہو گیا تھا..... تقدیر ایک بار پھر اچھو کو دغا دے رہی تھی۔ اگر وہ یہ سب کچھ نہ کرتا تو حالات خود بخود اُس کے حق میں ہو رہے تھے۔ اُس کی

ایک پکی عمر کے بیاہتا مرد کے پلے باندھی جا رہی تھی۔

دو ہفتے کے اندر اندر نوری کی شادی ہو گئی اور وہ امین فورمین کی دلہن بن کر امرتسر چلی گئی۔ یہ سراسر ایک بے جوڑ شادی تھی اور کسی کو بھی نوری کے اس انجام پر خوشی نہیں ہوئی۔ (رخصتی کے موقع پر نوری کی ایک سیمپلی تو رو رو کر بے ہوش ہو گئی اور بعد میں اُسے ہسپتال پہنچانا پڑا)

وقت اپنی دھیمی رفتار سے آگے کو سرکتا رہا۔ ہر نیا دن گزرنے والے دن کے واقعات پر گرد کی تہہ چڑھاتا رہا۔ راپور کی گلیوں میں ننگی ٹانگوں والے شریر بچے کھیلے رہے، کنوؤں پر لڑکیاں گھڑے بھرتی رہیں۔ بیلے میں نوجوان ماہیے کی تانیں بکھیرتے رہتے اور پنچایت گاہ کے گھنے برگدوں کے نیچے بڑے بوڑھوں کی محفلیں جمتی رہیں۔ اگر کہیں دوبارہ رونق نظر نہیں آئی تو وہ دو جگہیں تھیں۔ ایک ڈاکٹر گلزار کا دیہاتی دواخانہ جو کھلنے کے دو ماہ بعد ہی بند ہو گیا تھا اور دوسرا اچھو کا گھر۔ جس کے مکین زندگی کے خوف سے اپنا لیسرا اچھوڑ چکے تھے اور اب پنختہ لکڑی کے دروازے پر لگا ہوا بڑا سا آہنی تالہ دن بدن زنگ آلود ہوتا جا رہا تھا۔

اچھو ابھی تک مفرو تھا اور مجھے شک تھا کہ وہ جلد یا بدیر نوری تک پہنچنے کی کوشش کرے گا۔ یہی وجہ تھی کہ نوری کے شوہر امین فورمین کو میں نے مسلسل نظر میں رکھا ہوا تھا۔ راپور سے امرتسر کا فاصلہ آٹھ دس میل سے زیادہ نہیں تھا۔ ہفتے میں ایک آدھ بار میرا امرتسر جانا ہوتا جاتا تھا۔ میں جب بھی امرتسر جاتا کسی نہ کسی بہانے امین سے ملاقات ضرور کرتا۔ امرتسر کی اصل آبادی سے کچھ فاصلے پر وہ ایک بہت بڑی ورکشاپ میں کام کرتا تھا۔ یہ ورکشاپ کئی ایکڑ رقبے پر پھیلی ہوئی تھی۔ ورکشاپ کی حد بندی کرنے کے لیے خاردار تاریں لگائی گئی تھیں۔ ان تاروں کے اندر مختلف محکموں کی بے شمار نئی اور پرانی گاڑیاں کھڑی رہتی تھیں۔ امین کے نیچے پندرہ بیس مکینک کام کرتے تھے۔ وہ خود مین گیٹ کے پاس لکڑی کے ایک چھوٹے سے کیمپن میں بیٹھا رہتا تھا۔ کوئی کام الگھ جاتا تو مکینک آکر اُسے بتا دیتے تھے..... میں نے امین کو صاف لفظوں میں سمجھا دیا تھا کہ وہ اشرف عرف اچھو کی طرف سے چوکس رہے۔ وہ مفرو رہے اور کسی بھی وقت سامنے آسکتا ہے۔ امین میری بات سمجھ گیا تھا۔ ویسے بھی یہ سارا قصہ الف سے لے کر یہ تک اُسے معلوم تھا۔ اُس سے نوری کے بارے میں کوئی بھی بات چھپانا فضول تھا۔

ایک روز کچہری سے واپس آتے ہوئے میں امین سے ملنے رک گیا۔ ورکشاپ میں پہنچا تو وہ اپنے کیمپن میں موجود نہیں تھا۔ کیمپن سے باہر لوہے کی کرسیوں پر اُس کے تین چار

ملنے والے بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ نوجوان تھے اور دو ٹیکسیوں پر یہاں پہنچے تھے۔ شکل و صورت اور لباس سے وہ سب ٹیکسی ڈرائیور ہی لگتے تھے۔ میں سادہ لباس میں تھا اس لیے نوجوانوں نے میری موجودگی کی کوئی پروا نہیں کی اور اپنی روانی میں بات چیت کرتے رہے۔ وہ ایک دوسرے کو لائے پلٹے ناموں سے پکار رہے تھے، فحش گالیوں سے نواز رہے تھے اور بار بار کسی دوڑ کا ذکر کر رہے تھے۔ میں نے اُن کی باتوں پر کان لگائے تو پتہ چلا کہ وہ کسی ٹیکسی دوڑ کا ذکر کر رہے ہیں اور اس دوڑ پر شرطیں وغیرہ لگانے کی بات ہو رہی تھی۔ اُن دنوں امرتسر میں ٹیکسی دوڑ اور تانگہ دوڑ کا بڑا رواج چلا ہوا تھا۔ یہ دوڑیں چوری چھپے لگتی تھیں اور ان پر بڑی بڑی شرطیں لگائی جاتی تھیں۔ اشرف عرف اچھو بھی ایسی دوڑ کا بہت شوقین تھا۔ وہ اس بارے میں بڑے بڑے دعوے کیا کرتا تھا اور یہ دعوے حقیقت سے کچھ ایسے خالی بھی نہیں تھے۔ بڑا تیز ڈرائیور تھا وہ۔ گاڑی ایسے چلاتا تھا جیسے ڈاکہ مار کر آیا ہو یا ڈاکو کا پیچھا کر رہا ہو اور یہ کسی ایک وقت کی بات نہیں تھی۔ گاڑی میں بیٹھے ہی وہ ہوا کے گھوڑے پر سوار ہو جاتا تھا۔ ایک دفعہ ایک ٹیکسی دوڑ میں حصہ لینے کے لیے اُس نے اپنے پیر استاد کی ٹیکسی چرائی تھی اور راتوں رات امرتسر سے دہلی پہنچ گیا تھا۔ بڑی کشش تھی اُس کے لیے ایسے کاموں میں۔ ڈرائیوروں میں جو گفتگو ہو رہی تھی اُس سے مجھے چند اور باتوں کا پتہ بھی چلا۔ وہ امین فورمین کو استاد ملتانے کے نام سے یاد کر رہے تھے اور اُس کے متعلق بڑی دلچسپ باتوں میں مصروف تھے۔ ایک نے کہا۔ ”یار سنا ہے نئی استادنی استاد کو قریب نہیں پھٹکنے دیتی۔“ دوسرا بولا۔ ”بات تو ٹھیک لگتی ہے استاد ساری رات اکیلا چار پائی توڑتا رہتا ہے اسی لیے تو ورکشاپ آکر جمائیاں لینے لگتا ہے۔“ تیسرا بولا۔ ”اس سے تو دوسرا مطلب بھی لیا جاسکتا ہے۔ ہو سکتا ہے وہ رات کو استادنی کے ساتھ مل کر جاگتا ہو۔ دونوں نوکا پہاڑہ یاد کرتے رہتے ہیں۔“ سب سے پہلے والے فریبہ اندام ڈرائیور نے تہقہہ لگایا۔ ”نہیں یار! رات کو نوکا پہاڑہ پڑھا جاتا تو ورکشاپ آکر استاد کا موڈ اس طرح خراب نہ ہوتا۔ دیکھتے نہیں ہر ایک کو کاٹنے دوڑتا ہے۔“ بھورے رنگ کا ایک پھر تیل سانو نوجوان ڈرائیور بولا۔ ”ہم سب کھوتے کے پڑ ہیں۔ ایک ایسے شخص کے بارے میں پریشان ہو رہے ہیں جو ہے ہی استاد۔ اڑیل سے اڑیل گاڑی اس کے ہاتھ میں آکر روال ہو جاتی ہے۔ استادنی کو اشارت ہوتے بھی زیادہ دیر نہیں لگے گی۔ دیکھ لینا تم.....“

لیکا ایک اُن سب کو چپ ہونا پڑا۔ امین فورمین ایک میلے کپڑے سے ہاتھ پونچھتا واپس چلا آ رہا تھا۔ اُس کے ساتھ ایک نو عمر مکینک بھی تھا۔ مجھے دیکھ کر امین سیدھا میری طرف چلا آیا۔ نو عمر مکینک نے باہر بیٹھے ڈرائیوروں کے ساتھ سرگوشیاں کیں اور وہ خاموش ہو گئے۔

نہیں ہوتی تھی۔ بلال شاہ نے یہ صرف بیس روپے میں خریدا اور اُسے اخبار کے کاغذ میں لپیٹ کر سیدھا میرے پاس راپور لے آیا۔ پُرزوں کی تھوڑی بہت پہچان مجھے بھی تھی۔ میں نے اچھی طرح گوڈے کا معائنہ کیا۔ وہ بالکل برانڈ نیو اصل پُرزہ تھا۔

میں نے اس معاملے میں تھوڑی سی تفتیش اور کرائی تو سعد اللہ خان نامی ایک پٹھان بڑے ڈرائیور سلطانی گواہ بن گیا۔ اُس نے بتایا کہ شروع شروع میں اُس نے بھی بھگتو سے کچھ پُرزے خریدے تھے۔ وہ ایک عرصے سے یہ کام کر رہا ہے اور ہزاروں کمپچا ہے۔

تھانے میں سنسنی خیز انکشاف کرتے ہوئے سعد اللہ خان نے کہا۔ ”انپکٹر صیب! اس حرام خور بھگتو کے گھر میں ہزاروں کا مال پڑا رہتا ہے۔ وہ یہ پُرزے گورنمنٹ کے ورکشاپ سے ”چوری کرتی“ ہے۔ اصل بات تو خدا ”جاتی“ ہے لیکن جہاں تک ہمیں معلوم ہے ملی بھگت کے بغیر یہ کام نہیں ہو سکتا۔ وہ کاپھر کاپچی امین پھورمین بھی اس کا پورا پورا مدد کرتی ہے۔“

میں نے پوچھا۔ ”امین فورمین کیا مدد کرتا ہے؟“

وہ بولا۔ ”وہ اپنی آنکھیں بند رکھتی ہے۔ بس یہی اُس کا بہت بڑا مدد ہے۔ بھگتو اور اُس کے ساتھی رات کو جاتے ہیں۔ تارکات کروڈ ورکشاپ میں گھسے ہیں اور گاڑیوں کا انجنر پنجر ڈھیلا کر کے لے آتے ہیں۔ سب کچھ امین پھورمین کی ناک کے نیچے ہوتا ہے لیکن وہ خدائی خوار چپ رہتی ہے۔ اُس کو چپ رہنے کا قیمت ملتی ہے۔ رشوت کھاتی ہے وہ۔“

میں نے پوچھا۔ ”یہ کام کب سے ہو رہا ہے؟“

سعد اللہ خان نے جواب دیا۔ ”ام کو نہیں مالوم..... لیکن چار پانچ مہینے سے یہ کام بڑے زور پر ہے۔ ام نے سنا ہے کہ پہلے پہلے امین پھورمین اُس حرامی بھگتو کی بات نہیں مانتی تھی۔ راضی ہی نہیں ہوتی تھی۔ اُسے اپنی نوکری کا خطرہ تھا پھر مالوم نہیں کیا بات ہوادہ راضی ہو گیا۔ اب وہ بھگتو کے سامنے چوں نہیں کرتی۔ کھلی چھٹی دے دی ہے اُس بے ایمان کو..... اور وہ دیمک کا مافق رات دن چاٹ رہی ہے ورکشاپ کی گاڑیوں کو.....“

سعد اللہ خان نے اس معاملے پر بہت کھل اور تفصیل سے بات کی۔ اُس کی گفتگو سے میں نے یہ نتیجہ نکالا کہ امین فورمین پُرزوں کی اس چوری میں ملوث تو ہے لیکن اس کام کے لیے اُسے مجبور کیا گیا ہے۔ شروع شروع میں اُس نے بھگتو سنگھ کی بات نہیں مانی بلکہ اُسے پکڑوانے کی دھمکیاں بھی دیں لیکن کچھ عرصہ بعد اچانک نہ جانے کیا ہوا کہ سب اندیشے بالائے طاق رکھ کر وہ بھگتو سنگھ کی لائن پر آ گیا۔ دوسرے لفظوں میں بھگتو سنگھ نے اُسے مجبور

نوعمر ملکینک نے غالباً انہیں بتا دیا تھا کہ اندر تھانیدار بیٹھا ہے وہ ذرا ہوش سے گل بات کریں۔ امین فورمین میرے ساتھ باتوں میں مصروف ہو گیا۔ گفتگو کے دوران اس کی کلائی پر سے قمیص کا بازو اوپر ہوا تو میری نگاہ اُس گھڑی پر پڑی۔ میں چونک گیا۔ سنہری ڈائل والی یہ خاصی قیمتی گھڑی تھی۔ کم از کم پانچ سو قیمت تھی اس کی۔ اس سے پہلے بھی میں امین کے پاس کئی مہنگی اشیاء دیکھ چکا تھا۔ ابھی حال ہی میں اس نے تین چار ہزار روپے کی ایک سینکڑ ہنڈ موٹر سائیکل بھی خریدی تھی۔ جرمنی کی بنی ہوئی یہ دیوبیکل موٹر سائیکل وہ گاؤں بھی لے کر گیا تھا۔ دور دور سے لوگ یہ عجیب و غریب شے دیکھنے کے لیے جمع ہو گئے تھے۔ ہر طرف مشہوری ہو گئی تھی کہ مہتے کا داماد ”دس گھوڑوں کی طاقت“ والی موٹر سائیکل چلاتا ہے۔ مجھے صاف طور پر اندازہ ہو رہا تھا کہ امین فورمین کے پاس اُس کی آمدن سے زیادہ پیسے ہیں۔ میں نے اس کی دکان دیکھی ہوئی تھی اور تنخواہ کا بھی پتہ تھا۔ وہ جتنا ”خوشحال“ نظر آ رہا تھا اتنا ہونہیں سکتا تھا۔ نہ جانے کیوں میرے ذہن میں اُس کے خلاف شبہات سر اٹھانے لگے۔

میں نے اپنے ایک ہوشیار منبر کو مستقل طور پر امین فورمین کی نگرانی پر لگا دیا۔ یہ منبر اسی علاقے کا رہائشی تھا جہاں امین فورمین اپنی دونوں بیویوں کے ساتھ رہائش پذیر تھا۔ اس منبر نے آٹھ دس روز کے اندر مجھے کئی کارآمد اطلاعات دیں۔ ان اطلاعات سے اس بات کی تصدیق بھی ہوئی کہ اپنی نئی نوپلی دہن سے امین کی ناچاقی ہے۔ وہ اسے ڈانٹتا ڈپٹتا ہے اور وہ بھی کمرہ بند کئے پڑی رہتی ہے۔ منبر نے ایک اور خاص خبر بھی دی۔ اُس نے بتایا کہ امین فورمین کے ایک بھگتو نامی نوجوان سے تعلقات ہیں اور یہ نوجوان چوری چھپے گاڑیوں کے پُرزے فروخت کرتا ہے۔ منبر نے بتایا کہ بھگتو یہ کام اپنے گھر پر کرتا ہے۔ جن لوگوں کو اُس کے کاروبار کا پتہ ہے وہ بڑی رازداری سے اُس کے گھر واقع ”ٹھنڈی کھوئی“ پر پہنچتے ہیں اور نہایت قیمتی پُرزے کوڑیوں کے بھاد خرید لاتے ہیں۔

یہ اطلاع میرے لیے خاصی اہم اور دلچسپ تھی۔ بعض اوقات ”تفتیش“ اپنا راستہ خود چن لیتی ہے۔ میں نے امین فورمین سے رابطہ اس لیے رکھا ہوا تھا کہ اگر اچھو اُس تک پہنچنے کا کوشش کرے تو گرفتار کیا جائے لیکن اس رابطے کی وجہ سے امین کا ایک راز کھل کر سامنے آ گیا تھا۔ میں نے اس اطلاع کی تصدیق کرنے کی ذمہ داری بلال شاہ کو سونپی۔ وہ ایک فرضی گاہک کے طور پر امرتسر پہنچا اور کچھ ڈرائیور ٹائپ لوگوں سے مل ملا کر بھگتو تک جا پہنچا۔ بلال شاہ نے بھگتو سے ایک مورس کار کا ایکسل خریدا۔ عرف عام میں اسے گوڈا بھی کہتے ہیں۔ گوڈا اُن دنوں مارکیٹ میں بہت مشکل سے ملتا تھا اور اگر ملتا بھی تھا تو سو روپے سے کم قیمت

سب سے پہلے امین فورمین کے کیمبن میں گھسے۔ وہ سرے سے اپنی ڈیوٹی پر موجود ہی نہیں تھا۔ اس کی جگہ ایک کالا کلونا رنگ ساز کرسی پر ناگیں پیارے سوراہا تھا۔ رگبیر کی رہنمائی میں ہم ورکشاپ کے وسیع و عریض احاطے میں پہنچے۔ وہ ہمیں ایک بس میں لے گیا۔ اب بس کی بازوی تیار ہو چکی تھی۔ صرف رنگ وغیرہ ہونے والا تھا۔ ہم دروازے کھول کر اندر داخل ہوئے تو دونوں چوکیداروں سے ملاقات ہو گئی۔ وہ اپنی رائفلیں ایک طرف رکھے بڑی تسلی سے تاش کھیل رہے تھے۔ ایک سیٹ پر شراب کی خالی بوتل لٹکی ہوئی تھی۔ فرش پر ہڈیوں، مونگ پھلی اور چٹنوزوں کے چھلکوں کی بہار تھی۔ بس کی اندرونی روشنی میں چوکیداروں کے چہرے سروس کی طرح زرد نظر آنے لگے۔ انہیں فوری طور پر حراست میں لے لیا گیا..... اب رگبیر ہمیں ورکشاپ کے شمالی حصے کی طرف لے گیا۔ یہاں ایک جگہ سفید رنگ کی بے شمار چھوٹی جیسے کھڑی تھیں۔ یہ بالکل نئی گاڑیاں تھیں لیکن کھلے آسمان تلے ہونے کے سبب گرد و غبار سے اٹی ہوئی تھیں۔ اُن کی حالت دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ وہ طویل عرصے سے یہاں پارک ہیں اور موسم کی سختی سہہ رہی ہیں۔ ان گاڑیوں کا تعلق محکمہ جنگلات سے تھا۔ معلوم نہیں کس وجہ سے یہ ابھی تک بے کار پڑی تھیں۔ رگبیر ہمیں گاڑیوں کی طویل قطاروں میں سے گزار کر عقبی سمت میں لے آیا۔ وہ اس سارے چکر سے بخوبی آگاہ تھا۔ اُس نے ہمیں پانچ ایسی گاڑیاں دکھائیں جن کے بونٹ کھلے ہوئے تھے۔ یہ گاڑیاں آج رات کے ”پوسٹ مارٹم“ کے لیے تیار تھیں۔

میں نے فالتو آدمیوں کو ورکشاپ کے آفس میں واپس بھیج دیا اور خود اے ایس آئی باجوہ اور دو سپاہیوں کے ساتھ محکمہ زراعت کی ایک اسٹیشن وگن میں گھس کر بیٹھ گیا۔

اُس وقت رات کا ایک بجنا تھا جب خاردار تاروں کی طرف کچھ پہل محسوس ہوئی۔ ہم چونکے ہو کر بیٹھ گئے۔ چند سائے تاروں کے قریب متحرک نظر آ رہے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے انہوں نے تار کاٹے اور احاطے میں گھس آئے۔ وہ تعداد میں چار تھے۔ اُن میں سے دو کے ہاتھ میں تھیلے تھے۔ یقیناً ان میں اوزار تھے۔ اس مقام پر قریباً تاریکی تھی۔ وہ بڑے اطمینان سے دبے پاؤں چلتے ”کھلے بونٹ“ والی جیپوں کی طرف گئے اور اپنی کارروائی میں مصروف ہو گئے۔ ایک فوٹو گرافر ہمارے ساتھ تھا۔ تیز روشنی والی ٹارچیں بھی تھیں۔ ہم ایک ساتھ اسٹیشن وگن سے باہر نکلے اور ٹارچیں روشن کر دیں۔ چاروں اچکے روشنی میں نہا گئے۔ اُن میں سے ایک لمبے نوجوان کو دیکھ کر میں چونک گیا۔ بھورے بالوں اور بھوری آنکھوں والا یہ پھریتلا شخص ان ڈرائیوروں میں موجود تھا جو چند روز پہلے امین فورمین کے کیمبن سے باہر بیٹھے

کر دیا کہ وہ ورکشاپ میں ہونے والی چوری سے آنکھیں بند رکھے۔ اس چشم پوشی کے بدلے میں بھگت سنگھ اپنی کالی کمانی میں سے کچھ رقم امین فورمین کو بھی دے دیتا تھا۔ یہ رقم صرف امین فورمین کی نہیں ہوتی تھی بلکہ کئی اور افراد بھی اس میں شریک تھے۔ جن میں ورکشاپ کے چوکیدار بھی شامل تھے۔ امین کے حصے میں مشکل سے ڈیڑھ سو روپیہ آتا تھا۔ یعنی ایک معمولی رقم کے عوض امین فورمین ایک بڑا خطرہ مول لینے پر مجبور تھا اور اس وجہ سے بھگت سنگھ سے اکثر اس کی لڑائی بھی رہتی تھی..... درحقیقت وہ اس دلدل سے نکلنا چاہتا تھا لیکن بھگت سنگھ کے ہاتھ میں معلوم نہیں کون سی ایسی کل تھی کہ وہ دباؤ تھا تو امین اُس کے سامنے بے بس ہو جاتا تھا۔

بھگت سنگھ کے بارے میں میں نے دوسرے ذریعوں سے بھی معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی۔ معلوم ہوا کہ وہ ایک خطرناک شخص ہے۔ اُس کا کوئی قریبی رشتہ دار کسی بہت بڑے سرکاری عہدیدار کا ڈرائیور ہے۔ اس تعلق کی وجہ سے وہ چھوٹے بڑے کئی کیسوں میں بری ہو چکا ہے۔ بہت تھ چھٹ شخص ہے۔ چند ماہ پہلے وہ بھیک مانگنے والی ایک نوجوان لڑکی کو اٹھا کر اپنے مکان میں لے گیا تھا۔ لڑکی کا شوہرا سے چھڑانے کے لیے پہنچا تو بھگت سنگھ نے اُس سے ہاتھ پائی کی اور ایسا زوردار مکا اُس کے سر پر مارا کہ وہ وہیں تڑپ کر مر گیا۔ بعد میں وہ اس قتل سے صاف بری ہو گیا۔ متعلقہ انسپکٹر نے اپنی رپورٹ میں لکھ دیا کہ موتی نئے کا عادی تھا اور دماغ کی شریان پھٹنے سے مرا ہے۔ پتہ نہیں کیسے لڑکی نے بھی عدالت میں بیان دے دیا کہ مرنے والے سے بھگت سنگھ کی کوئی ہاتھ پائی نہیں ہوئی تھی۔ اس طرح کے اور کئی قصے بھگت سنگھ کے متعلق مشہور تھے۔ پٹیشے کے لحاظ سے وہ ٹیکسی ڈرائیور تھا اور غیر شادی شدہ تھا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ بھگت سنگھ کو رنگے ہاتھوں پکڑا جائے تاکہ بہت بڑے افسر کا ڈرائیور کوئی چاچا ماما اُسے چھڑا نہ سکے۔ اپنے خنجر کے ذریعے اور سلطانی گواہ کی مدد سے میں نے امین فورمین کا کچا چٹھا جان لیا۔ ورکشاپ میں چوری کی واردات عموماً جمعرات اور جمعے کی درمیانی شب کو ہوتی تھی۔ اس روز امین فورمین کی ڈیوٹی رات کو ہوتی تھی۔ وہ مخصوص گاڑیوں کے بونٹ شام کو ہی کھلوا دیتا تھا۔ چوکیدار اُس سے ملے ہوئے تھے وہ دائیں بائیں ہو جاتے تھے۔ بھگت سنگھ اپنے ایک یا دو ساتھیوں کے ساتھ ورکشاپ میں گھستا تھا اور گاڑیوں کا پوسٹ مارٹم شروع کر دیتا تھا۔

وہ جمعرات کی کٹھنری ہوئی شب تھی۔ بارہ ساڑھے بارہ بجے کا عمل تھا۔ اپنے اے ایس آئی اور عملے کے چار افراد کے ساتھ میں نے خاموشی سے ورکشاپ میں چھاپہ مارا۔ سلطانی گواہ سعد اللہ خان کے علاوہ ورکشاپ کا ایک نوجوان مکینک رگبیر بھی ہمارے ساتھ تھا۔

”ٹیکسی دور“ کی اور دنیا جہان کی باتیں کر رہے تھے۔ میرے ذہن نے پکار کر کہا کہ یہ سب سنگھ ہے۔ اگلے لمحے میں میرا یہ خیال درست ثابت ہوا۔ میں نے جب سرکاری ریوایلوں پر کیا اور پکار کر ”ہینڈ زاپ“ کا حکم دیا تو سب سے پہلے بھورے نو جوان نے حرکت کی۔ ریوایلوں دسواں حصہ ضائع کیے بغیر وہ تیزی سے میری طرف آیا اور دھکا دیتا ہوا خاردار تاروں کی طرز بھاگا۔ اس کا دھکا مجھے ٹھیک طرح نہیں لگا۔ میں لڑکھڑا کر سنبھل گیا۔ ”خبردار“ میں نے جانا کہا۔ اُس نے سنی ان سنی کی اور دوڑتا چلا گیا۔ میرا اے ایس آئی باجہ اُس کے پیچھے لپک تھا۔ وہ اُسے یقیناً پکڑ لیتا لیکن میں نے کوئی خطرہ مول لینا مناسب نہیں سمجھا۔ اگر یہی مجھ کو تو اُس سے ہاتھ پائی نقصان دہ ثابت ہو سکتی تھی۔ جو شخص مکارا کر ایک شخص کی جان لے رہا ہے۔ وہ اپنی جان خطرے میں دیکھ کر کچھ بھی کر سکتا تھا۔ میں نے ٹریننگ کے مطابق داہنا گوشہ زمین پر ٹیکا۔ اطمینان سے ریوایلوں کو دونوں ہاتھوں میں سیدھا کیا اور رفتار سے بھاگنے والے کی ٹانگوں کا نشانہ لے کر یکے بعد دیگرے دو فائر کیے۔ دھماکوں سے رات کا سناٹا لرز اڑا۔ پوری رفتار سے بھاگتے بھاگتے نو جوان اوندھے منہ گرا اور پختہ زمین پر دور تک لڑھکایا گیا۔ اُس کے باقی ساتھیوں میں سے بھی ایک نے بھاگنے کی کوشش کی لیکن سپاہیوں نے لپک کر اُسے دبوچ لیا اور تلاشی لے کر اُس کے لباس سے ایک دیسی پستول برآمد ہوا۔

گرفتار ہونے والوں میں بھوری آنکھوں والا نو جوان بھگتو سنگھ ہی تھا۔ اُس کے ساتھ امین فورمین اور دونوں چوکیدار بھی حوالات میں پہنچ گئے۔ ورکشاپ میں کھڑی ٹکر جنگلات کی گاڑیوں کا معائنہ کیا گیا تو سب کی آنکھیں کھل گئیں۔ ان میں سے بیشتر گاڑیوں کے قیمتی پُرزے غائب ہو چکے تھے۔ ان کے علاوہ بھی کئی گاڑیوں اور جیسر کے پُرزے جات ہاتھ صاف کیا گیا تھا۔ حوالات میں ملزمان سے تفتیش کا آغاز ہوا۔ بھگتو سنگھ خاصا سخت جان نہ لیکن جب تھرد ڈگری سے واسطہ پڑا تو اُس نے سب کچھ قبول کر لیا۔ اُس نے تسلیم کیا کہ استاد ملتانئی یعنی امین فورمین کو اس غیر قانونی کام پر مجبور کرتا رہا ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوا کہ امین فورمین مجبور کیوں ہوا؟ سیدھا سادا جواب یہ تھا کہ بھگتو سنگھ کے پاس امین فورمین کی کوئی کمزوری تھی۔ اس ”کمزوری“ کی شہ پر بھگتو سنگھ نے اسے بلیک میل کیا اور وہ بلیک میل ہو گیا۔ معمولی رقم کے بدلے میں اُس نے اپنی ملازمت، نیک نامی، عزت، آزادی سب کا داؤ پر لگا دیا۔ میں جانتا چاہتا تھا کہ وہ کمزوری کیا تھی۔ بھگتو سنگھ نے پہلے تو اس سلسلے میں زبان بالکل بند رکھی لیکن جب اسے تھرد ڈگری سے چھٹکارے کی کوئی صورت نظر نہ آئی تو روز اس خبیث نے سب کچھ بک دیا۔ اس نے جو کچھ بتایا وہ اتنا سنسنی خیز تھا کہ مجھے

کانوں پر یقین نہیں آیا۔ اُس نے انکشاف کیا کہ راپور کا ڈاکٹر گلزار اچھو کے ہاتھوں نہیں امین فورمین کے ہاتھوں قتل ہوا تھا۔ تفصیل بتاتے ہوئے اُس نے کہا کہ اشرف عرف اچھو ڈاکٹر کو شیشاں گھاٹ میں مار پیٹ کر چھوڑ گیا تھا۔ بعد میں امین فورمین وہاں پہنچا اور اُس نے ایک بانی راڈ کی پے در پے ضربوں سے نیم بے ہوش ڈاکٹر کا سر توڑ دیا۔

میں نے بھگتو سنگھ سے پوچھا۔ ”تمہیں اس واقعے کا کیسے علم ہے؟“

جواب میں اُس نے اپنے گنوار لہجے میں کہا۔ ”میں ہی وہ ٹیکسی ڈرائیور ہوں جس نے اچھو کے ساتھ مل کر ڈاکٹر گلزار کو دواخانے سے اٹھایا تھا اور شیشاں گھاٹ میں اُس کی ٹھکانی کی تھی۔ بعد میں میں نے امین فورمین کو جا کر بتا دیا کہ ڈاکٹر گلزار شیشاں گھاٹ میں پڑا ہے۔ امین فورمین اپنی موٹر سائیکل پر بیٹھ کر شیشاں گھاٹ پہنچا اور ڈاکٹر کے سانس پورے کر دیئے۔“

”لیکن امین کو ایسا کرنے کی کیا ضرورت تھی؟“ میں نے پوچھا۔

”وہ..... نوری سے شادی کرنا چاہتا تھا۔“ بھگتو نے ایک اور انکشاف کیا میں چکر کر رہ گیا۔ ڈاکٹر گلزار کے قتل کے ڈانڈے کہاں سے کہاں جا ملے تھے۔ میں نے بھگتو سنگھ سے چار گھنٹے تک مغز کھپائی کی۔ راپور تھانے کے اس مخ بستہ حوالات میں ”پرائی“ پر آئے سانسے بیٹھ کر میں نے بھگتو سنگھ سے جو کچھ معلوم کیا اس کا خلاصہ اس طرح ہے۔

بھگتو سنگھ اچھو کے علاوہ امین فورمین کا بھی یار نبلی تھا۔ اچھو کے ساتھ مل کر بھگتو سنگھ نے ڈاکٹر گلزار کو کلینک سے اٹھایا۔ پھر اچھو نے اُسے مار پیٹ کر شیشاں گھاٹ میں چھوڑ دیا۔ اچھو اور بھگتو سنگھ نے نیم بے ہوش ڈاکٹر گلزار پر تھوکا اور ٹیکسی پر بیٹھ کر شہر روانہ ہو گئے۔ یہاں ایک بس اڈے پر اچھو ٹیکسی سے اتر گیا۔ اچھو کے ٹیکسی سے اترتے ہی بھگتو سنگھ نے سیدھا امین فورمین کے گھر کا رخ کیا۔ اُس نے امین فورمین کو بتایا کہ ڈاکٹر گلزار..... اچھو کے ہاتھوں مار کھا کر کالے شیشاں گھاٹ میں بے ہوش پڑا ہے۔ یہ اطلاع سن کر امین فورمین کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ یہ اس کے لیے بڑا سنہری موقع تھا۔ امین نے ایک عرصے سے نوری پر آنکھ رکھی ہوئی تھی..... دوسرے لفظوں میں نوری کو حاصل کرنے کی کشش صرف اچھو اور ڈاکٹر گلزار میں ہی نہیں تھی، امین فورمین بھی اُس کے امیدواروں میں شامل تھا۔ یہ اور بات ہے کہ اس کی ”امید داری“ ڈھکی چھپی تھی اور گاؤں میں کسی کو معلوم نہیں تھا کہ امین نوری پر کتنی لمبی لمبی رائیں پکاتا ہے۔ وہ نوری کے جو بن کا شیدائی تھا اور اُسے دیکھ کر چپکے چپکے دانت کچکا پکاتا تھا۔ تاہم اُسے معلوم تھا کہ ڈاکٹر گلزار اور اچھو جیسے نو جوانوں کے ہوتے ہوئے وہ کسی گنتی میں نہیں

آتا لہذا خاموش رہنا ہی وہ اپنے لیے بہتر سمجھتا تھا۔ اُس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ حالات پلٹا کھائیں گے اور ”قدرت“ یوں اس پر مہربان ہو جائے گی۔ بھگتو سنگھ کی زبانی ڈاکٹر گلزار کے زخمی ہونے کی خبر سن کر امین فورمین نے فوراً شیطانی منصوبہ بنا لیا اور بھگتو سنگھ کو اپنے ساتھ شمشان گھاٹ چلنے کو کہا۔ معمولی پس و پیش کے بعد بھگتو سنگھ تیار ہو گیا۔ برستی بارش میں دونوں موٹر سائیکل پر سوار کالے شمشان گھاٹ پہنچے۔ امین کے پاس ٹائی راڈ کا ایک ٹکڑا تھا۔ موٹر سائیکل گھاٹ سے باہر ہی روک دی گئی۔ بھگتو سنگھ موٹر سائیکل کے پاس کھڑا ہوا تھا جب کہ امین اندر گیا اور اس نے زخمی گلزار کا کام تمام کر ڈالا۔

واقعات کی ترتیب ایسی تھی کہ اس قتل کا الزام فوراً اچھو پر آ گیا۔ وہ جان بچا کر فرار ہو گیا اور ڈاکٹر گلزار جوانی کی موت مرکز قبر میں اتر گیا۔ امین فورمین کی تو جیسے لائبریری نکل آئی تھی۔ نوری کے باغ جوانی تک اس کا راستہ صاف تھا۔ کسی کے خواب و خیال میں بھی نہیں تھا کہ یہ راستہ صاف ”کیا گیا“ ہے۔ نوری کے والدین جلد از جلد بیٹی کے بوجھ سے چھوٹا چاہتے تھے۔ انہیں نوری رشتہ درکار تھا چاہے کیسا بھی ہو۔ امین فورمین نے اپنی بات نوری کے والد مہتا تک پہنچائی اور یوں..... وہ بچی عمر کا کھر در اس شخص نرم و نازک نوری کا مالک بن گیا۔

دوسری طرف ”مکافات“ کا قانون بھی حرکت میں آچکا تھا۔ نوری کے حسن سے سیراب ہونے کی قیمت امین کو یہ چکانا پڑی کہ وہ بھگتو سنگھ کے ہاتھوں میں کھلو بن گیا۔ بھگتو سنگھ اتنا سیدھا سادا نہیں تھا جتنا نظر آتا تھا۔ اُس خاموش طبع ڈرائیور کے اندر ایک گھاگ بد معاش چھپا ہوا تھا۔ اُس نے حالات کی کروٹ سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کر لیا۔ امین کا راز اُس کی مٹھی میں تھا۔ اُس نے امین کو بلیک میل کرنا شروع کر دیا۔ ایک عرصے سے اُس کی نگاہ ورکشاپ میں کھڑی سرکاری گاڑیوں پر تھی۔ وہ ایک مرتبہ پہلے بھی اپنا منصوبہ امین فورمین کے سامنے پیش کر چکا تھا لیکن اُس وقت امین نے اُسے سختی سے جھڑک دیا تھا۔ وہ جانتا تھا یہ اُس کے لیے سراسر گھائے کا سودا ہے۔ بدنامی اور مصیبت کے سوا اُسے اس کام میں اور کچھ نہیں ملے گا لیکن اب اُس کے لیے انکار ممکن نہیں تھا۔ بھگتو سنگھ اگر اپنی زبان کھول دیتا تو وہ ڈاکٹر کے قتل کے الزام میں پھانسی کے تختے پر پہنچ سکتا تھا۔ لہذا اُسے ایک ایسی راہ پر چلنا پڑا جس پر وہ ہرگز چلنا نہیں چاہتا تھا۔

امین فورمین بظاہر سیدھا سادا سا شہری نظر آتا تھا لیکن حوالات میں وہ بھگتو سنگھ سے بھی زیادہ ڈھیٹ اور سخت جان ثابت ہوا۔ اُس نے اقبال جرم نہیں کیا۔ مگر اس سے کوئی فرق

پڑنے والا نہیں تھا۔ اُس کے خلاف زیر دفعہ 302 چالان مکمل کرنے کے لیے مجھے کافی ثبوت مل چکے تھے۔ ریمانڈ ختم ہوتے ہی میں نے بھگتو اور امین فورمین کو جوڈیشل ریمانڈ پر جیل بھیج دیا۔

خاندان کی گرفتاری کے بعد نوری امرتسر سے واپس ”راپور“ آچکی تھی۔ اسے جیسے کسی بچرے سے رہائی ملی تھی۔ بلال شاہ بدستور اُن کے گھر آتا جاتا تھا۔ اپنی ”منہ بولی بہن“ سے اُسے تمام حالات کا پتہ چلتا رہتا تھا۔ ایک روز بلال شاہ تھانے آیا تو اُس کی گول منول آنکھوں میں کسی اہم اطلاع کی چمک تھی۔ میں نے اُس کا موڈ دیکھتے ہوئے فوراً لمائی والی چائے اور برنی منگوائی۔ نہ بھی منگواتا تو آخر منگوانی تھی اور خروں میں جو وقت ضائع ہوتا وہ علیحدہ تھا۔

برنی اور چائے کو اپنے منہ میں کس کرتے ہوئے بلال شاہ نے دبی آواز میں کہا۔

”خان صاحب کل گاؤں میں ایک بڑا اہم واقعہ ہو گیا ہے۔ آپ کو پتہ ہی نہیں۔“

”کیسا واقعہ؟“ میں نے پوچھا۔

”کل گاؤں میں ایک لڑکی نے خودکشی کی کوشش کی ہے۔ اور پتہ ہے کون ہے وہ لڑکی؟ نوری.....“ اُس نے اپنے سوال کا خود ہی جواب دیا۔ میں حیرت کے عالم میں اُس کی طرف دیکھنے لگا۔ اُس نے میری حیرت دیکھ کر برنی کی دوڑ لیاں اکٹھی منہ میں رکھ لیں اور چائے کی چھوٹی سی سُری لے کر بولا۔ ”گھر والوں کے علاوہ کسی کو اس بات کی کانوں کان خبر نہیں۔ کل شام نوری نے نیلا تھوٹا کھالیا تھا۔ وہ تو اس کی ماں کو بروقت پتہ چل گیا۔ اس نے مہبتے کے ہاتھ فوراً مجھے بلایا۔ ہم نے نمک کھلا کھلا کر پہلے نوری کو الٹیاں کروائیں پھر میں سائیکل پکڑ کر ماچھی پور چلا گیا۔ وہاں ”رکھا“ نام کا بڑا سیانا حکیم ہے۔ اس سے دوا لے کر میں رات بارہ بجے واپس آیا۔ صبح تک دوا کھاتے رہے۔ اب جا کر اُس کی طبیعت بحال ہوئی ہے.....“

بلال شاہ کی اطلاع حیران کن تھی۔ میں نے پوچھا۔ ”تمہارے علاوہ اور کس کس کو خبر ہے؟“

وہ بولا۔ ”مہبتے کو، اُس کی بیوی کو، نوری کی ایک بڑی بہن کو اور نوری کی سہیلی گلابو کو۔ یہ گلابو ہی ہے جو نوری کی رخصتی پر بے ہوش ہو گئی تھی اور اُسے ہسپتال لے جانا پڑا تھا۔ بڑا پیار ہے اُسے نوری سے۔ دو جسم ایک جان کی طرح ہیں دونوں..... گلابو۔ رات میری بات سن گئی ہے۔ اُس نے مجھے کافی کچھ بتایا ہے نوری کے بارے میں.....“

”مثلاً؟“ میں نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

ہو چکے تھے۔ اس دوران میں نے اچھو کا کھوج لگانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی۔ اچھو کے اب تک واپس نہ آنے کی ایک وجہ اور بھی ہو سکتی تھی۔ اُن دنوں جرائم کی خبریں اخباروں میں ایسے زور و شور کے ساتھ نہیں چھپتی تھیں اور وہ تو پھر ایک دیہی علاقہ تھا۔ ڈاکٹر گلزار کا اصل حال گرفتار ہو چکا تھا لیکن اس کی اطلاع نہ تو اخباروں میں آئی تھی اور نہ امرتسر میں اس کا چرچا ہوا تھا۔ صرف چند قریبی دیہات میں لوگوں کو معلوم ہوا تھا کہ گلزار کا قاتل پکڑا گیا ہے۔ عین ممکن تھا کہ اچھو بھی اس اطلاع سے بے خبر ہو۔ کسی طرح اُس تک یہ خبر پہنچ سکتی تو وہ خود کو گرفتاری کے لیے پیش کر سکتا تھا۔ اب اُس پر صرف ضرب پہنچانے کا الزام تھا اور زیر دفعہ 320 یا 323 تعزیرات ہند اُس کو بمشکل ڈیڑھ دو سال قید کی سزا ہوتی۔

میں نے سوچا کہ امین فورمین کی گرفتاری کی زیادہ سے زیادہ مشہوری ہونی چاہئے تاکہ یہ اطلاع اچھو کے کانوں تک بھی پہنچ سکے۔ اس مقصد سے کسی اخبار کو بھی خبر دی جا سکتی تھی۔ ”زمیندار“ اخبار کا مقامی نمائندہ میرا واقف کار تھا۔ میں اُس سے رابطے کا سوچ ہی رہا تھا کہ ایک نئی بات میرے دماغ میں آئی۔ میں ایک دفعہ پہلے بھی اچھو سے ایسی ہی چال چل چکا تھا۔ گلزار کی گھوڑی چرا کر اچھو غائب ہو گیا تھا اور میں نے اُسے واپس لانے کے لیے فرضی ملزم کو حالات میں بند کر دیا تھا۔ یقینی بات تھی کہ اچھو وہ واقعہ بھولا نہیں ہوگا۔ اس طرح اُس نے اب بھی یہی سمجھنا تھا کہ میں اُسے چکر دے رہا ہوں۔ بڑی مشکل سی سیویشن تھی۔ اچھو کو غائب ہوئے اب نو مہینے ہونے کو آئے تھے۔ معلوم ہوتا تھا وہ پکا ہی غائب ہو گیا ہے۔ اُس کے حالات افسوس ناک تھے یعنی قاتل نہ ہوتے ہوئے بھی وہ خود کو قاتل سمجھنے پر مجبور تھا اور در کے دھکے کھا رہا تھا۔ دوسری طرف نوری کا معاملہ تھا۔ نہ جانے کیوں میری چھٹی حس دعویٰ کر رہی تھی کہ اگر اچھو راپور واپس نہ آیا اور اُس نے نوری کو سنبھالنے کی کوشش نہ کی تو وہ اپنے دکھوں کی آگ میں جل کر رہا ہو جائے گی۔

ایک روز میں اپنی سوچوں میں گم دفتر میں بیٹھا ہوا تھا۔ سامنے اخبار کھلا پڑا تھا۔ ایک منٹ پر سنے ماڈل کی ایک دیسی کار کی تصویر تھی۔ تصویر دیکھتے ہی اچانک میرا دھیان کسی اور طرف چلا گیا۔ سوچ کے آسمان پر جیسے بجلی کی لپک گئی۔ میں جلدی سے سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ جسم میں سنسنی پھیل رہی تھی۔ میں اٹھا اور تیز تیز قدموں سے باہر نکل آیا۔ میرے کانوں میں ڈرامائی گونج رہی تھی جو چند ہفتے پہلے میں نے امین فورمین کے کیمین میں بیٹھ کر سنی تھی۔ ٹیکسی میں بجاتو گنگہ ہی تھا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ ٹیکسی دوڑ کا انتظام کرنے والوں میں وہ بھی شریک

چائے کا آخری گھونٹ لے کر بلال شاہ نے منہ سے چپ چپ کی آواز نکالی اور زاری صورت بنا کر بولا۔ ”منہ میں میٹھا ہی میٹھا ہو گیا ہے۔ چائے بھی گڑ کی طرح میٹھا برنی بھی میٹھی شہد۔“

میں نے اُس کی بات سمجھتے ہوئے سنتری سے کہا کہ وہ خیر دین حلوائی سے ایک گرم پکڑے اور کچھ نمک پارے لے آئے۔ میری بات سن کر بلال شاہ کے چہرے پر رونق سی آگئی۔ اس نے سنتری کو پکار کر کہا۔ ”پکڑے لانے ہیں تو ساتھ تھوڑی سی لال لے آنا۔“ چٹنی کا ذکر کرتے ہوئے اس نے بمشکل اپنی رال کو گرنے سے روکا۔

میں نے کہا۔ ”ہاں۔۔۔۔۔ تو تم گلابو کا ذکر کر رہے تھے۔“ اُس نے آنکھیں گھما کر خود کو پھر گلابو کے ”ذکر“ پر پہنچایا اور بولا۔ ”جی ہاں۔۔۔۔۔ جو ہے ناں سب کچھ جانتی ہے نوری کے بارے میں۔ میں نے رات اُس سے پوچھا کہ نے یہ کام کیوں کیا ہے۔ وہ کہنے لگی کہ بڑی دکھی ہے وہ۔۔۔۔۔ جینا اُس کے لیے عذاب ہے۔ نہ گھر میں سکھ ہے نہ باہر۔ اٹھتے بیٹھتے موت کی دعائیں مانگتی ہے۔ کبھی ہے میں ہوں بدنصیب جس پر میرا سایہ پڑے گا اپنی قسمت کو روئے گا۔“

منہ میں انگلی گھما کر بلال شاہ نے برنی کے ریزے گالوں کے اندر سے نکالے اور چپاتے ہوئے بولا۔ ”گلابو سے مجھے یہ خاص بات بھی معلوم ہوئی ہے کہ نوری بہت پہلے اچھو کو پسند کرتی ہے۔ وہ یہ بھی جانتی ہے کہ اچھو بھی اُسے چاہتا تھا لیکن اُن دونوں کے ایک دوسرے کے سامنے یہ بات نہیں کہی۔۔۔۔۔ اور پھر ڈاکٹر گلزار اُن کے درمیان کود پڑا۔ اپنی غلطی پر بے حد پچھتاتی ہے۔ وہ سمجھتی ہے کہ اُس نے اچھو کے ساتھ بے حد زیادتی کی۔ اور اس زیادتی کی سزا میں اُسے عمر بھر روپناڑے گا۔“

میں دھیان سے بلال شاہ کی باتیں سنتا رہا۔ ان باتوں سے مجھے اندازہ ہوا کہ نوری طرف سے خودکشی کی یہ کوشش آخری نہیں ہے۔ وہ زندگی سے بے زار ہے اور کئی طرح پچھتاوے اُسے گھیرے ہوئے ہیں۔ وہ جلد یا بدیر پھر موت کو گلے لگانے کی کوشش کرے اور ضروری نہیں کہ اس دفعہ بھی ناکام ہو۔ میں سمجھتا ہوں کہ کسی خودکشی کرنے والے کی لینا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اصل کام اُن حالات کو بدلنا ہوتا ہے جن میں وہ شخص اس حوالہ پر مجبور ہوا۔ میرے دل نے گواہی دی کہ ان نازک حالات میں اگر کہیں سے اچھو آجائے تو نوری کی ڈانواں ڈول زندگی کو سہارا مل سکتا ہے۔۔۔۔۔ بلکہ خود اچھو بھی جاہ بے بچ سکتا ہے، لیکن مسئلہ یہ تھا کہ اچھو کو کہاں ڈھونڈا جائے۔ ڈاکٹر گلزار کو قتل ہوئے آٹھ

ہے۔ بھگتو سنگھ اُس وقت تھانے میں ہی تھا۔ کچھ پوچھ گچھ کرنے کے لیے میں نے اُسے جبر سے بلایا ہوا تھا۔ میں لاک آپ میں پہنچا تو وہ پرانی پر بیٹھا اپنی بھوری ڈاڑھی کھج رہا تھا۔ میں نے لاک آپ کا دروازہ کھلوا دیا اور اس کے سامنے پہنچ گیا۔ وہ حیرت سے میری طرف دیکھ لگا۔ میں نے کہا۔

”بھگتو! ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں۔ دیکھ سچ بتانا۔“ بھگتو کی اکڑنوں تقریباً تو ہو چکی تھیں۔ وہ بھلے مانسوں کی طرح اقرار میں سر ہلانے لگا۔ میں نے کہا ”میری اطلاع کے مطابق امرتسر کے گرد و نواح میں کہیں ٹیکسی دوڑ ہونے والی تھی۔ اُس دوڑ کا انتظام کرنے والوں میں تم بھی شامل تھے۔ کیا یہ بات سچ ہے؟“ بھگتو سنگھ نے پہلے تو انکار کیا لیکن جب میں نے زور دیا تو مان گیا۔ اس نے تسلیم کیا کہ ایک ایسی دوڑ ہونے والی ہے لیکن کہاں اور کب ہونے والی ہے یہ اُسے معلوم نہیں۔ میں جانتا تھا اُسے یہ بھی معلوم ہے۔ تھوڑی سی مزہ کوشش کر کے میں نے اُس سے سب کچھ اگلا لیا۔ یہ ٹیکسی دوڑ ٹھیک ایک ہفتے بعد ہونے والی تھی۔ امرتسر سے کوئی بیس میل شمال کی طرف ڈیک نالے کے ساتھ ساتھ میلوں تک غیر آباد زمین پڑی تھی۔ کہیں کہیں چٹیل میدان سے بنے ہوئے تھے۔ اس قسم کی دوڑیں ایسے ہی غیر آباد و زوہ میدانوں میں ہوتی تھیں۔ بھگتو سنگھ نے ایک ”اُچاٹا“ نامی جگہ کا نام لیا اور بتایا کہ یہ دوڑ ہفتے یا اتوار کی صبح اُس میدان میں ہوگی۔ بھگتو سنگھ نے یہ انکشاف بھی کیا کہ پچھلے تین سال سے یہ دوڑ ہر سال یہاں ہوتی ہے۔ دوڑ میں حصہ لینے والی ٹیکسیاں بڑی خاموشی سے یہاں پہنچتی ہیں۔ انہیں درختوں کے درمیان پارک کر دیا جاتا ہے۔ ڈرائیور شراب پیتے ہیں، فساد کرتے ہیں اور رات بھر شرطیں لگتی رہتی ہیں۔ صبح آٹھ بجے دوڑ شروع ہوتی ہے اور دو گیارہ بجے تک متناختم ہو جاتا ہے۔

نہ جانے کیوں مجھے یقین سا تھا کہ اشرف عرف اچھو اس دوڑ میں حصہ ضرور لے گا۔ زبردست ٹھکر کی تھا ٹیکسی دوڑ کا۔ میں نے شدت سے ہفتے کے دن کا انتظار کیا۔ آخر خدا نے کر کے وہ دن پہنچا۔ میں نے ایک ٹیکسی کا انتظام پہلے ہی کر رکھا تھا۔ میں اور اے ایس اے باوجوہ ڈرائیوروں کے بھیس میں دوڑ کے مقام پر پہنچ گئے۔ یہاں کا نقشہ بعین و سیاہی تھا۔ بھگتو سنگھ نے بتایا تھا۔ ڈیک نالے کے کنارے درختوں کے گھنے جھنڈ میں کم و بیش ان ٹیکسیاں موجود تھیں۔ ان میں کئی ٹیکسیوں پر لاہور اور جالندھر وغیرہ کے نمبر تھے۔ کچھ ٹیکسی کا بلی پٹھانوں کی تھیں اور خوب سچی ہوئی تھیں۔ بیشتر ڈرائیور نشے میں ڈھت تھے اور

کر باتیں کر رہے تھے۔ دن چڑھ چکا تھا اور اب جوں جوں ریس کا وقت قریب آ رہا تھا حصہ لینے والوں میں جوش و خروش بڑھتا جا رہا تھا۔ میں بلال شاہ اور باجوہ ہر چہرے میں اچھو کا چہرہ تلاش کر رہے تھے۔۔۔۔۔ اسی چکر میں آٹھ بج گئے۔ ریس کا آغاز ہو گیا۔ آٹھ آٹھ کی ٹکڑیوں میں قریب دس ریسیں ہونی تھیں۔ تمام ریسوں میں پہلے نمبر پر آنے والوں کی فائل ریس آخر میں ہونا تھی۔ ریس جہاں سے شروع ہوتی تھی ایک طویل چکر کاٹ کر وہیں پر ختم ہوتی تھی۔ یہ انداز اچار میل کا چکر تھا۔

تیسری ریس کی ٹیکسیاں واپس آئیں تو پہلے کی طرح گرد و غبار کے بادل آسمان کو چھونے لگے۔ سب سے آگے ایک ہلن گاڑی تھی۔ وہ جیسے ہوا میں اڑتی چلی آ رہی تھی۔ وہ بڑے فاصلے سے جیت رہی تھی۔ اُس سے قریب ترین ٹیکسی بھی قریباً ایک فرلانگ پیچھے تھی۔ جب یہ گاڑی میرے پاس سے گزری تو میں اُس میں بیٹھے اچھو کو پہچان گیا۔ اُس نے سکھوں کی طرح چہرے اور سر کے بال بڑھا رکھے تھے۔ حلیہ بھی سکھوں والا تھا لیکن یہ حلیہ میری آنکھوں کو دھوکا نہیں دے سکا۔ میرے چہرے پر جوش کی لہر دیکھ کر بلال شاہ اور باجوہ چونک سے گئے۔ میں نے اشارے سے انہیں بتایا کہ اچھو اُس ٹیکسی میں ہے۔ چند ہی لمحے بعد ٹیکسی اپنے مقررہ مقام پر رک گئی۔ دروازہ کھلا اور اچھو خوشی سے متمتایا ہوا باہر نکل آیا۔ دیہاتیوں کے مخصوص انداز میں اُس نے ایک ٹانگ پر ناک پر بندھتی رکھی اور ہونٹوں سے ”بب“ کی فاتحانہ آواز نکالی۔ عین اُس وقت اُس کی نظر میرے اور بلال شاہ پر پڑ گئی۔ ایک دم اُس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ اُس نے آنکھیں سیڑ کر غور سے ہمیں دیکھا۔ اُس کے حمایتی شور کرتے ہوئے اُس کی طرف بڑھ رہے تھے۔ وہ اسے شاباش دینا چاہتے تھے لیکن اُن کی شاباش وصول کرنے سے پہلے ہی اُس نے دوڑ لگا دی۔ یہ بڑا مضحکہ خیز منظر تھا۔ اُس کے حمایتیوں کو کچھ نہیں آ رہی تھی کہ ایک دم اچھو کو کیا ہوا ہے۔ بڑھکیں مارتا مارتا وہ اچانک بھاگ کیوں کھڑا ہے۔ اور وہ بھاگ بھی ایسے رہا تھا جیسے موت کو دیکھ لیا ہو۔ اسیل گھوڑے کی طرح لمبی ٹانگیں تھیں اُس کی، جسم بھی بھوکے بھیڑیے جیسا تھا۔ لحوں میں وہ کہیں سے کہیں پہنچ گیا۔ اس دوران باجوہ ٹیکسی سٹارٹ کر کے پہلا گیر لگا چکا تھا۔ ہم پھرتی سے ٹیکسی میں سوار ہوئے اور وہ مکان سے نکلے تیر کی طرح اچھو کے پیچھے گئی۔ دور تک چٹیل میدان تھا۔ چھپنے کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی۔ مجھے امید تھی کہ ہم ایک منٹ کے اندر اندر اُسے جالیں گے لیکن پھر اچھو بھاگتے بھاگتے اچانک ڈیک نالے کی طرف مڑ گیا اور کنارے کے گھنے درختوں میں گھس گیا۔ ان درختوں کے بیچ و بیچ ایک برجی سی بنی ہوئی تھی۔ اُس کے ساتھ ہی ایک بارہ دری

ٹائپ چیز تھی۔ کوئی بہت پرانا مقبرہ تھا۔ قبر کا نام و نشان مٹ چکا تھا۔ اندر کثرت سے چر
جھنکار اُگا ہوا تھا۔ اچھو تیر کی طرح اس پناہ گاہ میں گھس گیا۔ میں نے ٹیکسی میں تیس گز
رکوائی اور نیچے اتر آیا۔ بلال شاہ اور باجوہ بھی ساتھ اترے۔ دفعتاً اچھو کی لٹاکرتی ہوئی آ
آئی۔

”نواز خان! میرے ہاتھ میں پستول ہے۔ آگے آیا تو مولا قسم لحاظ نہیں کروں گا۔
اُس کے ساتھ ہی اُس نے ایک ہوائی فائر کر کے اپنے دعوے کا ثبوت پیش کیا۔

ہم نے درختوں کی آڑ لے لی۔ میں نے پکار کر کہا۔ ”اچھو! خواہ مخواہ خود کو مصیبت م
نہ ڈال۔ گلزار کا قاتل پکڑا جا چکا ہے..... دیکھ میری بات سن۔ میرا یار ہے تو باہر آ جا۔ میں تجو
سے وعدہ کرتا ہوں، کوئی آنچ نہیں آئے گی تجھ پر۔“

وہ گرج کر بولا۔ ”لغت ہے تجھ پر اور تیری یاری پر۔ تو یار نہیں یار مار ہے۔ یاری کو
میں نہ لا۔ اگر ہمت ہے تو پکڑ لے مجھے آ کر..... اور دیکھ..... اس بہن کے ویر کو پیچھے ہٹا
ورنہ میں پیٹ پھاڑ دوں گا اس کا۔“ اس کا اشارہ بلال کی طرف تھا۔

بلال شاہ برجی میں جھانکنے کے لیے تھوڑا سا آگے چلا گیا تھا۔ میں نے اسے ڈانٹ کر
پیچھے بلایا تھا۔ اس دوران ٹیکسی دوڑ کے تماشاویوں میں سے بیشتر لوگ بھاگتے ہوئے موٹو
پہنچ چکے تھے اور یہاں وہاں درختوں کی آڑ میں کھڑے خوفزدہ نظروں سے یہ منظر دیکھ رہے
تھے۔

میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”اچھو! میں تجھ سے جھوٹ نہیں بول رہا۔ ڈاکٹر کا قاتل
پکڑا گیا ہے۔ میں اُس کا چالان بھی مکمل کر چکا ہوں۔ تو خود کو خواہ مخواہ مصیبت میں نہ ڈال۔“
وہ تلخ لہجے میں بولا۔ ”میں تیری چالبازی جانتا ہوں نواز خان..... اب دھوکا نہیں
کھاؤں گا۔ اگر ہمت ہے تو آگے آ اور پکڑ مجھے۔“

اُس کا لہجہ بڑا تادولانے والا تھا۔ وہ گفتگو کے دوران مجھے گالیاں بھی دے رہا تھا۔
میں یہاں تحریر نہیں کر رہا لیکن میں یہ بھی جانتا تھا کہ اس میں تصور میرا ہی ہے۔ میں نے ایک
دفعہ اُس سے جو چال چلی تھی وہ اب میرے سامنے آ رہی تھی۔ باجوہ بہت غصے میں تھا۔
بورکار یو اور اُس کے ہاتھ میں چل نچل جا رہا تھا لیکن میں نے اشارے سے اُسے سمجھا دیا
وہ کوئی کارروائی نہیں کرے گا۔ میں نے فیص اٹھا کر کمر سے ریو اور والی پیٹی کھولی اور
شاہ کو تھما دی۔ یقیناً یہ منظر اچھو بھی دیکھ رہا تھا۔ اس کے بعد میں بڑے اعتماد سے خالی
برجی کی طرف بڑھا۔ مجھے یقیناً تھا کہ اب وہ گولی نہیں چلائے گا..... لیکن وہ بھی ایک خرد

نکلا۔ ابھی میں برجی سے آٹھ دس قدم دور تھا کہ دھماکہ ہوا اور گولی میرے دائیں کندھے کو
چھوئی ہوئی گزر گئی۔ مجھے صاف اندازہ ہوا کہ بازو کے گوشت سے ایک بوٹی کٹ کر علیحدہ
ہو گئی ہے۔ طیش سے میرا دماغ بھناٹھا۔ آخری چند قدم کا فاصلہ میں نے بھاگ کر طے کیا اور
برجی کے اندر گھس گیا۔ اس دوران ایک اور فائر بھی ہوا تھا لیکن یہ گولی میرے پاؤں کے
درمیان کچی زمین میں گھس گئی تھی۔ برجی میں گھستے ہی میں دیوانہ وار اچھو سے لپٹ گیا۔ اُسے
اپنی جسمانی طاقت اور لڑائی میں مہارت پر بہت مان تھا۔ دوسری طرف میں بھی سخت جھنجھلایا
ہوا تھا۔ پہلے ہی پہلے میں میں نے ریو اور اچھو کے ہاتھ سے نکال دیا۔ اگلے ایک منٹ کے
دوران برجی کی مختصر سی جگہ میں میرے اور اچھو کے درمیان سخت مارا ماری ہوئی۔ کئی بار میں
نے اُسے اٹھا کر پٹنا، کئی بار اُس نے مجھے رگیدا۔ میرے کندھے کی طرح اُس کا لمبا چوڑا تھوڑا
بھی خون سے رنگین ہو گیا۔ وہ ایک زبردست ”لڑاکا“ تھا لیکن میں نے کسی موقع پر اُسے خود
پر حاوی نہیں ہونے دیا۔ یہاں تک کہ باجوہ نے تین چار تماشاویوں کے ساتھ مل کر اُسے
دبوج لیا..... ہم اُسے گھسیٹ کر برجی سے باہر لے آئے۔

دو روز بعد بہت مشکل سے اچھو کو اس بات کا یقین آ سکا کہ وہ واقعی قتل کے الزام سے
بری ہو چکا ہے اور یقین جب آ گیا تو اُس کی آنکھوں میں آنسو چمک گئے۔ وہ مجھ سے لپٹ
گیا اور اپنے رویے پر شرمندگی کا اظہار کرنے لگا۔ میرے دل میں بھی کوئی میل نہیں تھا۔ وہ
سب کچھ تو وقتی غصے کا نتیجہ تھا۔ یہ بات میں کسی وقت ایک لمحے کے لیے نہیں بھولا تھا کہ اچھو
نے میری جان بچائی تھی۔ ”گلے سے مل گئے تو سارا گلہ جاتا رہا“ کے مصداق تمام تلخی ختم
ہو گئی۔ یہ دفعہ 320 کا کیس تھا لیکن معمولی رعایت کے ساتھ دفعہ 323 یا 334 کے تحت
پرچہ کاٹا جاسکتا تھا۔ میں نے بھی کاٹنا تو پوچھنے والا کوئی نہیں تھا لیکن میں نے قانونی کارروائی
پوری کی۔ اچھو کو چھ ماہ قید اور پانچ سو روپے جرمانے کی سزا سنائی گئی۔ وہ قید بھگتے جیل چلا گیا
اسی دوران نوری نے امین فورمین سے طلاق حاصل کر لی..... کچھ عرصہ بعد نوری اور اچھو کی
شادی ہو گئی۔ یہ ایک طویل کہانی کا خوشگوار انجام تھا۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ جوڑے آسمانوں پر
بننے ہیں۔ نوری اور اچھو کا جوڑا ابھی جب بنا تو ایسا بنا کہ لوگ دیکھتے رہ گئے۔ لمبے گھنے بالوں
والی دلکش نوری اور لمبا ترنگا چوڑے شانوں والا شاندار مرد اچھو۔ انہیں دیکھ کر یوں لگتا تھا کہ
وہ دونوں بنے ہی ایک دوسرے کے لیے ہیں۔ اب تک وہ جس جس کے ساتھ تھے غلط تھے،
انہیں صحیح ساتھ اب ملا ہے اور یہی ان کی منزل ہے جہاں وہ کھڑے ہیں۔ میرے اندازوں
کے عین مطابق اچھو دیکھتے ہی دیکھتے بد معاشی اور دادا گیری کی دلدل سے نکل آیا اور شریفانہ

طور پر رزقِ حلال کے لیے تنگ و دو کرنے لگا۔ شادی کے تین چار ماہ بعد اُسے کراچی کی ایک ٹرانسپورٹ کمپنی میں اچھی نوکری مل گئی اور وہ بیوی کو لے کر وہاں چلا گیا۔ (یہ نوکری پولیس نوکری سے کہیں بہتر تھی لہذا میں سے اُسے بھرتی کروانے کا ارادہ بدل دیا) میں نہیں سمجھتا کہ میں نے اشرف عرف اچھو پر کوئی احسان کیا تھا۔ ہاں اتنا اطمینان ضرور ہے کہ جس شخص نے ایک کڑے موقع پر میری زندگی بچائی اُس کی اپنی زندگی بربادی کے اندھے کنویں میں گرنا سے بچ گئی۔

☆=====☆=====☆

اور وہ بدل گئی

ایک عجیب و غریب میمِ زادی کی کہانی۔ وہ جو بھی کام کرتی، عجیب ہی کرتی۔ اس کی زندگی کا مقصد ہی دوسروں کو حیران و ششدر کرنا تھا۔ وہ انوکھی تھی اور اس کا ہر کام انوکھا تھا..... اور پھر ایک روز وہ اپنی زندگی کا سب سے انوکھا کام کر گئی۔

کے قابل نہیں تھا۔ اس طرح آٹھ افراد پر مشتمل کنبے کا سارا بوجھ گلزار کے کندھوں پر تھا۔ اس کے اہل خانہ ست دھارا سے آگے ”جاہو“ نامی ایک چھوٹے سے گاؤں میں رہتے تھے۔

ایک سیزن میں میری والدہ مجھ سے ملنے ڈلہوزی آئیں تو ڈھائی تین ماہ میرے پاس کوارٹر میں رہیں۔ مجھے اپنے ہاتھ کی پکی ہوئی روٹی کھلا کر انہیں بڑی تسلی ہوا کرتی تھی۔ کچھ بھی حال میرا بھی تھا۔ رات کو سوتے وقت اُن کے پاؤں دبا کر جو خوشی ملتی تھی وہ ہر خوشی سے بے نیاز کر دیتی تھی۔ پڑوسی ہونے کے ناطے گلزار بھی اکثر ہمارے گھر آ جایا کرتا تھا۔ میری غیر موجودگی میں وہ ماں جی کو تنہائی کا احساس نہیں ہونے دیتا تھا۔ ماں جی بھی اُس کو بہت پیار کرنے لگی تھیں اور بیٹا کہہ کر بلاتی تھیں۔ ماں جی کے آنے سے پہلے میں گلزار کو پڑوسی سے زیادہ اہمیت نہیں دیا کرتا تھا لیکن وہ ماں جی کو اچھا لگنے لگا تو مجھے بھی لگنے لگا۔ ڈھائی تین ماہ بعد ماں جی تو واپس چلی گئیں لیکن میرے اور گلزار کے درمیان قریبی تعلق قائم کر گئیں۔ گلزار اب اکثر میرے کوارٹر میں آ جاتا تھا اور ہم بے تکلفی سے ادھر ادھر کی باتیں کرتے تھے۔ گلزار کی سب سے بڑی خوبی اس کی سادگی تھی۔ کوئی لالچ دھوکا فریب اس میں نہیں تھا۔ نہ اُس نے کبھی مجھ سے کسی کی سفارش کی۔ نہ کسی پرد باؤ ڈلوا یا اور نہ کوئی اور فائدہ اٹھایا۔ وہ بس کام سے کام رکھنے والا اور اپنے حال پر خوش رہنے والا بندہ تھا۔

مجھے یاد ہے وہ ستمبر اکتوبر کے دن تھے۔ سردی نے اپنے پر پُر زے نکالنے شروع کر دیئے تھے اور خزاں دبے پاؤں سرسبز وادیوں کی طرف بڑھ رہی تھی۔ مجھے محسوس ہوا کہ گلزار چند دنوں سے کچھ اُداس اور اُکھڑا اُکھڑا ہے۔ میں نے اُسے کریدنے کی کوشش کی لیکن وہ حسب معمول ہنس کر ٹال گیا۔ میں نے سوچا شاید یہ سیزن ختم ہونے کی اداسی ہے۔ یا حوں کی میزبانی کرنے والے ایسی اُداسی کا اکثر شکار ہو جاتے ہیں لیکن پھر جلد ہی یہ اُداسی ختم بھی ہو جاتی ہے۔ برف باری کا نظارہ کرنے والے اکاڈکا سیاح ہل سٹیشن پر آنے لگتے ہیں اور سنسان گلیوں میں زیادہ نہیں تو تھوڑی بہت رونق کا سامان ہو جاتا ہے۔ میں نے بھی گلزار سے زیادہ پوچھنا چھ مناسب نہیں سمجھی اور اُسے اُس کے حال پر چھوڑ دیا۔

پھر ایسا ہوا کہ دو تین ہفتے گلزار سے ملاقات ہی نہ ہو سکی۔ میں تو مصروف تھا مگر گلزار کو ایسی کیا مصروفیت آن پڑی تھی؟ اُس شریف آدمی نے اپنی صورت تک نہیں دکھائی تھی۔ مجھے دوسرے ہونے لگا کہ شاید میری کوئی بات اُسے بُری لگ گئی ہے جس کی وجہ سے وہ ناراض ہے۔ ایک روز مقامی چھٹی تھی۔ میں نے ایک سنتری کو گلزار کی طرف بھیجا..... سنتری گلزار کو تو نہیں لایا تاہم گلزار کا ایک قریبی دوست جماعت علی خان اس کے ساتھ چلا آیا۔ جماعت علی

اس دلچسپ کیس کا تعلق ڈلہوزی سے ہے۔ ڈلہوزی میں میری رہائش بڑی پُر فضا جگہ پر تھی۔ سڑک سے صرف دس بارہ فٹ نیچے ڈھلوان پر بڑے صاف ستھرے کوارٹر تھے۔ عقب میں وسیع و عریض وادی تھی اور وادی میں بکھرے ہوئے خوبصورت مناظر تھے۔ دائیں طرف گھنے درخت تھے جہاں ایک انگریزی سکول تھا اور سکول کے بچوں کے لیے خوبصورت پارک بنا ہوا تھا۔ بائیں طرف چشے کا پانی ایک آبشار کی صورت میں نشیب میں گرتا تھا۔ اس آبشار کے گرد لوہے کے سُرخ جنگلے لگے ہوئے تھے۔ سیاح ان جنگلوں کے سہارے جھک کر گھنٹوں آبشار کا نظارہ کرتے تھے۔ کوارٹر کے سامنے سڑک تھی اور اس پر صرف پیدل لوگ ہی آ جاسکتے تھے۔ کوارٹروں کے پچھواڑے وادی کے رخ پر چھوٹے چھوٹے خوبصورت کانچ بنے ہوئے تھے۔ اکثر کانچ دو یا تین کمروں پر مشتمل تھے۔ جون جولائی میں ان کا کرایہ 300 روپے بنتا تھا۔ تک پہنچ جاتا تھا۔ اُس وقت کا 300 آج کل سات آٹھ ہزار سے کم نہیں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ان کانچز میں کھاتے پیتے لوگ ہی قیام کرتے تھے۔

ان کانچز میں ایک کانچ گلزار نامی ایک نوجوان کا تھا۔ گلزار چوڑے چپکے جسم کا مالک ایک ہنس مکھ اور سادہ لڑکا تھا۔ اُس کی کل جائیداد اور پونجی یہی ایک کانچ تھا جو اُسے اپنے باپ سے تر کے میں ملا تھا۔ سال میں چھ مہینے تو یہ کانچ دوسرے کانچز کی طرح ویران ہی گزارتا تھا۔ اصل سیزن جون جولائی ہی ہوتا تھا جب میدانی علاقوں کی گرمی سے گھبرائے ہوئے عوام و خواص پہاڑی مقامات پر بلے بولتے تھے اور ہر اچھی بری جگہ کرائے پر چڑھ جاتی تھی۔ ان دنوں گلزار کو بھی معقول آمدنی ہو جاتی تھی اور وہ اپنے اور اہل خانہ کے لیے سال بھر کا راشن اکٹھا کر لیتا تھا۔

گلزار کی دو چھوٹی بہنیں تھیں اور ایک بڑا بھائی۔ یہ بھائی بیمار رہتا تھا اور کسی کام کا نہ

ایک کانچ کا گنجان تھا اور گلزار سے اُس کی خاصی بے تکلفی تھی۔ گلزار کے ساتھ وہ ایک دودھو میرے کوارٹر میں بھی آچکا تھا۔ اس نے مجھے سلام کیا اور جھکتا ہوا ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ کوارٹر کا صحن تھا اور یہاں بڑی مزیدار دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے سنتری سے کہا کہ وہ گرم گرم قبوہ پلائے۔ سنتری چلا گیا تو میں نے جماعت علی سے پوچھا۔ ”ہاں بھئی..... کدھر ہے وہ تمہارا لنگوٹیا۔ مجھے تو اُس کی شکل بھی بھول گئی ہے۔ کہیں ڈھبوزی تو نہیں چھوڑ گیا۔“

جماعت علی کے چہرے پر بھیکی سی مسکراہٹ ابھری۔ پشتو کے لہجے میں بولا۔ ”خو..... وہ ہے تو ڈھبوزی میں لیکن اُس کا دماغ ڈھبوزی میں نہیں ہے۔ ام کئی دن سے سوچ رہا تھا کہ آپ سے بات کرے لیکن موقع ہی نہیں مل رہا تھا۔ اب آپ کا سنتری گلزار کو ڈھونڈتا ہوا ادھر چننے پر آیا تو ام نے بولا چلو آؤ ام تمہارے ساتھ چلتا ہے۔“

”لیکن اُس کو بیماری کیا ہے بھائی..... کچھ پتہ بھی چلے۔“

جماعت خان کے چہرے پر ایک دم سنجیدگی کے سائے گہرے ہو گئے۔ کچھ دیر سر کھجاتا رہا۔ پھر دائیں بائیں دیکھ کر ذرا رازداری سے بولا۔ ”کم بخت خود کو روگ لگا بیٹھا ہے خواہ خواہ..... ادھر ایک میم صاحبہ ٹھہرا تھا ناں اُس کے کانچ میں۔ بس اُسی کا نام لے لے کر آئیں بھرتا ہے۔ کہتا ہے وہ ام کو نہ ملا تو ام مر جائے گا۔“

حیرت سے میری آنکھیں کھل گئیں۔ جماعت خان جس میم صاحبہ کا ذکر کر رہا تھا اُس کا نام جینی تھا اور وہ سچ گچ کی میم تھی۔ بے حد تیز طرار اور چلبلی لڑکی تھی۔ اُسے دیکھ کر ہالی وڈ کی کسی حسین دلکش ساحرہ کا تصور ذہن میں آتا تھا۔ مجھے معلوم ہوا تھا کہ اُس کا والد صنعت کار ہے اور لاہور کے نواح میں پُر زے ڈھالنے کی اُس کی بہت بڑی فیکٹری ہے۔ جینی کے ساتھ اُس کی سہیلی بھی تھی۔ اس کے علاوہ ایک شو فر اور خانساں بھی تھا۔ جینی اور اُس کی سہیلی کے لیے ایک کانچ بھی ضرورت سے زیادہ تھا لیکن انہوں نے ایک ساتھ تین کانچ کرائے پر لیے تھے۔ ایک میں جینی اور اُس کی سہیلی نے قیام کیا تھا۔ دوسرے میں شو فر اور خانساں قیام فرما ہوتے تھے۔ تیسرا کانچ اس لیے خالی پڑا تھا کہ کہیں کوئی مہمان نہ آجائے۔ جینی کی سہیلی پر بنا گو مقامی تھی لیکن انگریزی لباس پہنتی تھی۔ انگریزی بولتی تھی اور انگریزوں سے بڑھ کر ماڈرن تھی۔ وہ کسی اعلیٰ افسر کی بیٹی تھی۔ یہ دونوں لڑکیاں تقریباً دو مہینے ڈھبوزی میں رہی تھیں اور جینی دیر رہی تھیں اور ہم چائے رکھا تھا۔ لگتا تھا جیسے انہوں نے قسم کھا رکھی ہے کہ کوئی کام سیدھا کرنا ہی نہیں۔ اُن کے پاس نئے ماڈل کی شاندار گاڑی تھی مگر اس گاڑی پر انہوں نے چھ طرح کے رنگ کر رکھے تھے۔ میں نے اس گاڑی کو ڈھبوزی میں جب بھی دیکھا ایسی جگہ کھڑے دیکھا

جہاں ”نو پارکنگ“ کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ جینی اور پریم کا لباس بھی اپنی مثال آپ ہوتا تھا۔ کبھی دس سال پیچھے کا فیشن کبھی دس سال آگے کا فیشن۔ ایک روز میں نے جینی کو ایسے لباس میں شاپنگ کرتے دیکھا کہ سکتے میں رہ گیا۔ میں ہی کیا جس نے بھی دیکھا ہوگا سانس لینا بھول گیا ہوگا۔ لباس کے نام پر اس نے مشکل سے ڈیڑھ دو گز کپڑا استعمال کیا ہوگا۔ اسکرٹ جسم سے چپکا ہوا تھا اور کولہوں سے نیچے اترتے ہی ختم ہو جاتا تھا۔ یہی حال بازوؤں اور گریبان وغیرہ کا تھا۔ لوگ رُک رُک کر اسے دیکھ رہے تھے۔

میں نے جماعت خان کی زبانی گلزار کے بارے میں سنا تو حیران رہ گیا۔ کہاں وہ اونچی سوسائٹی کی نخرے باز لڑکی کہاں یہ نچلے سے نچلے طبقے کا معمولی سا لڑکا۔ گلزار سے زیادہ آن بان والے تو جینی کے ملازم تھے۔ فوراً میرے ذہن میں آیا کہ گلزار کے ساتھ ضرور کوئی شرارت ہوئی ہے یا پھر وہ بیوقوف خود ہی کسی غلط فہمی کا شکار ہو گیا ہے۔ شکل و صورت سے وہ بڑا درویمان پسند نظر آتا تھا۔ خاص طور پر اُس کی سوئی سوئی آنکھیں تو جیسے ہر وقت خواب دیکھتی رہتی تھیں۔ میں نے جماعت خان سے پوچھا۔ ”کیا اُسے پاگل کتے نے کاٹا ہے کہ آپں بھرتا پھرتا ہے۔ جس لڑکی کا وہ نام لے رہا ہے اُس کے تو ملازم بھی اُس سے کہیں زیادہ حیثیت والے ہیں۔ میرے خیال میں تو وہ میرے تمہارے جیسے بندوں سے بات کرنا بھی گوارا نہ کرتی ہوگی۔“

جماعت خان نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ ”آپ ٹھیک کہتا ہے نواز صاحب۔ وہ مارے تمہارے جیسے بندوں سے بات کرنا بھی گوارا نہیں کرتی..... لیکن..... یہ حرامی گلزار تو اُس کے ساتھ سوچکا ہے۔“

میں سکتے میں رہ گیا۔ جماعت خان کے ہونٹوں سے نکلے ہوئے الفاظ دھماکوں کی طرح میرے کانوں میں گونجنے لگے۔ جماعت خان نے اپنی بات جاری رکھی۔ ”ام جھوٹ نکس بولتا نواز صاحب۔ ام کو جھوٹ بولنے کی ضرورت بھی کیا ہے۔ ام نے اب تک کسی کو نہیں بتایا۔ آپ کو بھی صرف اس لیے بتا رہا ہوں کہ آپ اس کا سچا دوست ہے۔ اُس پاگل کو اس مصیبت سے نکالنے کا کوئی چارہ کرے گا۔ ام سولہ آنے سچ کہہ رہا ہے جناب..... آپ کا یہ بات بالکل ٹھیک ہے کہ میم صاحبہ جیسا اعلیٰ لوگ اور ام جیسا گھٹیا لوگ کے درمیان ہزاروں میل کا پاصلہ ہوتا ہے۔ پر یہ پاصلہ مٹ گیا جناب..... اور مٹانے والا خود وہ میم صاحبہ ہے۔ ام کو خبر نہیں اُس نے ایسا کیوں کیا پر اُس نے کیا اور گلزار کو نیم پاگل بنا کر چلا گیا۔“

میں نے اٹھ کر بیرونی دروازہ بند کر دیا اور جماعت خان سے کہا کہ وہ مجھے اس واقعے

کی پوری تفصیل بتائے۔ جماعت خان نے اپنے مخصوص لمبے میں بولنا شروع کیا اور دھیرے دھیرے اس واقعے کے اسرار و رموز سے پردہ ہٹانے لگا۔ اُس نے بتایا کہ یہ ڈیڑھ ماہ پہلے واقعہ ہے میم صاحبہ کو ڈلہوزی میں آئے چار ہفتے ہو چکے تھے۔ وہ ہر دوسرے تیسرے دن اسپتال پر میا کے ساتھ گھڑسواری کے لیے نکلتی تھی۔ جیسی اُس گھوڑے پر سوار ہوتی تھی جو گھڑا کے پاس ہے۔ (گھڑا کے پاس دو تین گھوڑے بھی تھے۔ اُن میں سے ایک گھوڑا بڑا شاندار تھا۔ کانچ میں ٹھہرنے والے لوگ اکثر اُس سے یہ گھوڑا کرائے پر لے لیتے تھے) جیسی نے پورے دو ماہ کے لیے اس گھوڑے کا ایڈوانس کرایہ گھڑا کو دے رکھا تھا اور اُسے حکم تھا کہ ان دو مہینوں کے دوران گھوڑا ہر وقت تیار رہے گا۔ جیسی کے علاوہ کوئی اس پر سوار نہیں ہوگا، خود گھڑا بھی نہیں۔ گھڑا اس حکم کی پوری پابندی کرتا تھا۔ ہر روز نو بجے کے قریب گھوڑے کو بانسوار لگام سے تھامتا تھا اور کانچ میں لے آتا تھا۔ اگر میم صاحبہ نے گھڑسواری کے لیے جانا ہوتا تو شو فر گھڑا کو بتا دیتا تھا۔ دوسری صورت میں گھڑا اُسے واپس لے جاتا تھا۔ ایک روز گھڑا گھوڑا لے کر کانچ پہنچا تو شو فر اور خانساں کہیں گئے ہوئے تھے۔ کانچ میں صرف پریم اور میم صاحبہ تھیں۔ پریم نے گھڑا سے کہا کہ وہ لان میں بیٹھ جائے۔ میم صاحبہ ابھی باتھ روم میں ہیں۔ تھوڑی دیر میں نکلیں گی تو بتائیں گی کہ گھوڑا چاہیے یا نہیں۔

گھڑا وہیں لان کے ایک گوشے میں گھاس پر بیٹھ گیا۔ گھوڑا اُس نے کانچ کے گین سے باندھ دیا تھا۔ وہ قریباً ایک گھنٹہ وہاں بیٹھا انتظار کرتا رہا۔ نہ میم صاحبہ کی صورت دکھائی دی نہ اس کی سیٹلی کی۔ دوسرے گھوڑے والا بھی کہیں دکھائی نہیں دیا۔ ساڑھے دس پونے گیارہ بجے کے قریب پریم باہر نکلی اور اس نے گھڑا سے کہا کہ میم صاحبہ تمہیں اندر بلا رہی ہیں۔ گھڑا کا اوپر کا سانس اوپر رہ گیا۔ اُسے اندیشہ ہوا کہ ضرور اُس سے کوئی غلطی ہو گئی ہے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ اس طرح میم صاحبہ کی موجودگی میں وہ کانچ کے اندر قدم رکھ رہا تھا۔ دھڑکتے دل اور کانپتی ٹانگوں سے وہ اندر پہنچا اور اس کے ساتھ ہی اس پر حیرتوں کے ہزار ٹوٹے شروع ہو گئے۔ وہ جیسے ایک حسین اور عجیب و غریب خواب میں کھو گیا۔ اُس نے کبھی تصور بھی نہ کیا تھا کہ میم صاحبہ اُس سے اس طرح پیش آئیں گی۔ کہاں وہ آسمان کا ستارہ کہاں وہ زمین کا کنکر..... لیکن آسمان کا ستارہ کنکر سے کھیلنے زمین پر آ گیا تھا۔ وہ کھیلنا خواب تھا یا فریب تھا۔ گھڑا کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ خواب گاہ کی نیم تاریک فضا میں وہ اور میم صاحبہ کی مہربان مسکراہٹیں تھیں۔ ایک حسین جسم ریشمی تھان کی طرح گھڑا کے سامنے کھلتا چلا گیا۔ یہ خود پردگی اُسے ہوش و حواس سے بیگانہ نہ کرتی تو کیا اور ہوتا..... اور وہ بیگانہ

ہوتا چلا گیا..... اُس کی کون سی خواہش تھی جو اُس روز پوری نہ ہوئی۔ اُس سے خدمت کرانے والی اُس کی خدمت گار بنی ہوئی تھی۔ دل و جان سے اُس کی میزبانی کر رہی تھی۔ اُس روز گھڑا نے اپنی زندگی کا بہترین کھانا کھایا۔ بہترین سگریٹ پیئے۔ بہترین بستر پر لیٹا اور بہترین عورت کی قربت حاصل کی۔ یہاں تک کہ شام کے سات بج گئے۔ میم صاحبہ نے خواب گاہ کی گہری تاریکی میں گھڑا کو مخاطب کیا۔ ”آج جو کچھ ہوا اُسے بھول جاؤ..... ہمیشہ کے لیے۔“ اگلے روز جب گھڑا پھر نو بجے گھوڑا لے کر آیا تو میم صاحبہ بالکل اجنبی نظر آ رہی تھی۔ نہ وہ مسکراہٹ نہ وہ نرم لہجہ نہ وہ ناز و داد۔ کچھ بھی کل والا نہیں تھا۔ یوں لگتا تھا کل کا دن میم صاحبہ کی زندگی میں آیا ہی نہیں لیکن یہ دن گھڑا کی زندگی میں تو آیا تھا اور ایسے آیا تھا کہ وہ مرکز ہی اُسے بھول نہیں سکتا تھا۔ اس واقعے کے بعد میم صاحبہ تین چار ہفتے مزید ڈلہوزی میں رہیں لیکن پھر کبھی انہوں نے گھڑا سے آنکھ ملائی اور نہ مطلب کے علاوہ بات کی۔ یہاں تک کہ اگست کے آخر میں وہ واپس چلی گئیں۔ اب گھڑا تھا اور اُس کی بے قراریاں تھیں۔ وہ میم صاحبہ کے عشق میں گرفتار ہو چکا تھا اور رات دن آہیں بھرتا تھا۔

یہ ایک عجیب کہانی تھی جو جماعت خان کی زبانی مجھ تک پہنچی۔ ایسے واقعات عموماً جنوں پریوں کی کہانیوں میں ملتے ہیں اور کسی ہوش مند آدمی کے لیے اُن پر یقین کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ شاید میں بھی اس کہانی کو سنتے ہی جھوٹ اور خرافات قرار دے دیتا لیکن چند ہفتے پہلے ایک بات ایسی ہو چکی تھی جس کے سبب میں ایسا نہیں کر سکا اور جماعت خان کی بات میں نہ کر میری رگوں میں سنسنی مچا دی۔ مجھے لگا جیسے یہ واقعہ حقیقت سے زیادہ دور نہیں ہے۔

اب میں آپ کو چند ہفتے پہلے کا وہ واقعہ بتاتا ہوں جو اسی تھانے میں اسی سیزن میں میرے سامنے پیش آیا تھا اور وقت گزرنے کے باوجود میرے ذہن میں پہلے روز کی طرح تازہ تھا۔ قریب آبادی سے میرا عملہ سیوک سنگھ نامی ایک شخص کو پکڑ کر لایا۔ یہ شخص راج مزدور تھا اور آبادی میں تعمیر ہونے والی ایک عمارت میں مزدوری کر رہا تھا۔ ٹھیکیدار نے سیوک پر الزام لگایا تھا کہ اُس نے اُس کے کوٹ سے سو روپے چوری کیے ہیں۔ یہ کوٹ ٹھیکیدار نے اتار کر کرسی کی پشت پر ڈالا ہوا تھا۔ میرا اے ایس آئی سیوک کو پکڑ کر تھانے لے آیا۔ سیوک جکس و صورت سے ہی آوارہ سا نظر آتا تھا۔ اُس کی عمر بائیس سال کے لگ بھگ تھی۔ ہاتھ پاؤں مضبوط اور شانے چوڑے تھے۔ اُس کے ساتھیوں نے بتایا کہ یہ ٹھرا پیتا ہے اور جو پیسے بٹتی پتی ہیں اُن سے ٹاکی (فلیم) دیکھ لیتا ہے۔ میرے اے ایس آئی نے تھانے میں سیوک کو مار لگوا کر اُس نے سو روپے کے علاوہ چھوٹی موٹی چند اور چوریاں بھی قبول کر لیں۔ جب

جوانے پال کالونی سے دو فرلانگ دور چھوڑ کر آئے۔

سیوک سنگھ کا وہ بیان آج دو تین مہینے بعد حرف بحرف میرے کانوں میں گونج رہا تھا۔ اب اس بیان پر یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ یہ بات اب ثابت ہو رہی تھی کہ ایک مہینہ پہلے گلزار کے خوبصورت کانٹ میں کچھ ”بد صورت“ کام ہوتے رہے ہیں۔ مزدور سیوک سنگھ ان دنوں جو ڈیشل ریمائنڈر پرنٹل میں تھا اور مجھے تسلی تھی کہ ضرورت پڑی تو میں اُس سے تفصیلی بیان لے سکوں گا۔

☆=====☆=====☆

بڑے لوگوں کی بڑی غلطیاں ہوتی ہیں اور وہ چھپ جاتی ہیں۔ چھوٹے لوگ اگر چھوٹی سی غلطی کرتے ہیں تو وہ بھی چھپ نہیں سکتی۔ میم صاحبہ نے گلزار کے کانٹ میں جو ”کارنامے“ دکھائے وہ معمولی نہیں تھے لیکن نہ تو اس پر پکڑ ہوئی اور نہ کسی نے اس بات کو اچھالا۔ کسی اور کی بات تو ہر ایک طرف خود میں نے اس معاملے کو دبانے کی کوشش کی۔ سب سے پہلے جب سیوک سنگھ نے میم کے بارے میں بیان دیا تو میں نے اُسے سختی سے ڈانٹ دیا تھا کہ وہ اپنی اس بکواس کو اپنے تنک رکھے اور کسی کے سامنے زبان نہ کھولے۔ جیسی کوئی معمولی لڑکی نہیں تھی۔ اُس نے جو کچھ کیا تھا بغیر کوئی ثبوت چھوڑے کیا تھا۔ اب اگر کوئی اُس پر الزام لگاتا تو یہ سمجھا جاتا کہ وہ اُسے بدنام کر رہا ہے۔ اور ایک بار سوخ انگریز کی بیٹی کو بدنام کرنا کوئی معمولی ”جرم“ نہیں تھا۔ میں تو رہا ایک طرف اس جرم میں ہمارے ایس پی صاحب تک کی بیٹی اتر سکتی تھی..... سیوک کے بعد گلزار کے ساتھ بھی ایسا ہی واقعہ پیش آیا تھا۔ میں نے گلزار کو اپنے کوارٹر میں بلایا اور دو ڈھائی گھنٹے لگا کر اطمینان سے اُسے سمجھایا کہ جو کچھ ہو گیا ہے وہ اب اُسے بھول جائے۔ یہ ایک بڑا خطرناک معاملہ ہے اور جہاں رک گیا ہے اُسے وہیں رک جانا چاہیے۔ میں نے اُس سے یہ بھی کہا کہ وہ بھول کر بھی اس واقعے کا ذکر کسی اور سے نہ کرے۔ گلزار نے مجھے جو جواب دیا وہ بڑا بیوقوفی کا تھا۔ کہنے لگا۔ ”لالہ جی! میں یہ نہیں کہتا کہ میم صاحبہ پاک صاف ہے اور مجھ سے پہلے وہ کسی اور سے نہیں ملی لیکن ایک بات کا مجھے یقین ہے۔ اُس نے مجھے پسند کیا ہے اور یہاں سے جا کر وہ دن رات مجھے یاد کرتی ہوگی۔“ (وہ نشتہ لالہ کہتا تھا)

میراجی چاہا کہ جوتا اتار کر گلزار کے سر پر ماروں تاکہ اُس کے دماغ سے عشق کے نیشے جھڑکیں۔ وہ خود کو پرلے درجے کا چنڈ ثابت کر رہا تھا۔ اُس کا رویہ اُس کو خیر لڑکے سمجھا جویلی بار کی طوائف کے پاس جاتا ہے اور سمجھتا ہے کہ اب یہ طوائف اپنا کاروبار بند

حوالاتی اعتراف کرنے لگے تو تفتیش کرنے والے کا حوصلہ بلند ہو جاتا ہے اور اُسے اطمینان ہو جاتا ہے کہ وہ ایک بے گناہ شخص کو مار پیٹ کا نشانہ نہیں بنارہا۔ وہ زیادہ اعتماد کے ساتھ اُسے پھینٹی لگاتا ہے اور اس پھینٹی کا نتیجہ کبھی کبھی کسی انکشاف کی صورت میں نکل آتا ہے۔ سیوک سنگھ کے معاملے میں بھی یہی کچھ ہوا۔ مار پیٹ سے جان بچانے کے لیے سیوک سنگھ نے انکشاف کیا کہ وہ ایک بہت بڑی میم صاحبہ کے ساتھ اُس کے گھر میں رات گزار چکا ہے اور وہ سب کچھ کر چکا ہے جو ایک جوان مرد اور عورت کرتے ہیں۔ اے ایس آئی نے اُس سے میم صاحبہ کا نام پوچھا تو سیوک نے یہ بتا کر اے ایس آئی کے چھکے چھڑا دیئے کہ وہ ”پال کالونی“ کے آٹھ نمبر گیٹ میں رہتی ہے۔ یہ پتہ لکھ پتی انگریز صنعت کار کی حسین و جمیل بی بی جین شیلڈ عرف جینی کا تھا۔ اے ایس آئی فوراً میرے پاس آیا اور بتایا کہ سیوک نامی حوالاتی یہ بات کہتا ہے۔ میں نے خود جا کر سیوک سے پوچھ گچھ کی۔ وہ حلفیہ کہہ رہا تھا کہ ایسا ہو چکا ہے۔ اُس نے بتایا کہ ایک روز میں ڈاک خانے کے سامنے جی والے چوک میں دوسرے مزدوروں کے ساتھ دیہاڑی لگانے کے لیے بیٹھا ہوا تھا۔ سُرخ رنگ کی ایک کار آئی اُس میں دو میم صاحبہ تھیں۔ انہوں نے مجھے پاس بلایا۔ دیہاڑی ملنے کی اور کار میں بیٹھا کر پال کالونی لے آئیں۔ یہاں کوئی خاص کام نہیں تھا میں سارا دن ایک باغیچے میں مٹی ادھر سے ادھر کرتا رہا۔ دوپہر کو مجھے بڑا لمبا چوڑا کھانا بھی کونھیں والوں نے ہی کھلایا۔ شام کو میں واپس جانے لگا تو انگریز میم صاحبہ مجھے اندر لے گئی۔ اُس کے بعد جو کچھ ہوا وہ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ میں خود کو میم صاحبہ کی جوتیوں میں بیٹھنے کے قابل بھی نہیں سمجھتا تھا پال کالونی میں مجھے سر آنکھوں پر بٹھالیا۔ صبح میں جانے لگا تو اُس نے پچاس روپے میری جیب میں رکھ دیئے اور کہا کہ جو کچھ ہوا اُسے بھول جاؤ اور آئندہ کبھی اس طرف آنے کی کوشش نہ کرنا۔ نہ ہی کسی کو اس واقعے کے بارے میں بتانا..... میں چند دن حیران پریشان پھرتا رہا۔ پھر میں نے اپنے مزدور دوستوں کو اس بارے میں بتا دیا۔ وہ مجھ پر ہنسنے لگے۔ انہوں نے کہا کہ میں نشہ کر کے ساری رات کسی گندی نالی میں پڑا رہا ہوں اور انہیں سبز پری کی کہانی سنارہا ہوں۔ انہیں میری کسی بات پر یقین نہیں آیا۔ تھک بار کر میں چپ ہو گیا۔ جن دو مزدور ساتھیوں کو میں نے اپنی کہانی سنائی تھی انہوں نے میری بات پر یقین نہیں کیا لیکن انہوں نے جس تیسرے شخص کو اس بارے میں بتایا وہ بے وقوف قسمت آزمائے کے لیے ”پال کالونی“ کے آٹھ نمبر گیٹ چلا گیا۔ وہ وہاں گیٹ کے سامنے ٹھل رہا تھا کہ دو آدمیوں نے اُسے پکڑ لیا اور مار مار کر کپڑے پھاڑ دیئے۔ پھر اُسے سڑک پر مرغا بنادیا اور چھڑیوں سے پیٹا۔ بعد میں اُس پر کتے چھوڑ دیئے

کر کے بیٹھ جائے گی اور ساری عمر اُس کی راہ نکلتی رہے گی..... میں نے گلزار کو سمجھایا کہ کوشش کی۔ وہ ”ہوں ہاں“ میں سر ہلاتا رہا مگر کوئی بات بھی اُس کے دل پر اثر نہیں کرتی تھی..... میں نے اندازہ لگایا کہ میم صاحبہ اس کی زندگی میں آنے والی پہلی عورت ہے اور اُس سے مل کر گلزار نے جو انوکھا تجربہ حاصل کیا ہے وہ روگ کی طرح اُس کے ذہن سے چھوڑا نہیں ہے۔ سب کچھ جانتے بوجھتے بھی وہ خیال کر رہا تھا کہ میم صاحبہ اُس سے خاص الخاص انداز میں ملی ہے اور کبھی اُسے بھول نہیں پائے گی۔ اُس نے بڑے فخر سے مجھے بتایا کہ برف بار کے سیزن میں میم صاحبہ پھر یہاں آ رہی ہے اور اُس نے وعدہ کیا ہے کہ وہ میرے ہی کمرے میں ٹھہرے گی۔

دن گزرتے رہے۔ اکتوبر کا سارا مہینہ سرد اور خشک ہوا میں چلتی رہیں۔ نومبر میں کچھ اور بڑھ گئی۔ درختوں کے پتے زرد ہو کر گرنے لگے۔ خزاں جو دے پاؤں ان جبر چوٹیوں کی طرف بڑھ رہی تھی۔ ایک دم جست لگا کر نشیب و فراز پر چھا گئی۔ نومبر کے ہوتے ہی برف باری کے آثار نمودار ہونے لگے۔ دسمبر کے پہلے ہفتے میں شدید برف بار ہوئی اور ”ڈلہوزی“ نے برف کا خوبصورت لباس پہن لیا۔ اس لباس کو دیکھنے کے لیے میدان علاقوں سے لوگ ٹولیوں کی صورت میں یہاں پہنچنے لگے۔ اکا دکا بھول کھل گئے اور گلزاروں کی ویرانی دور ہونے لگی۔ گلزار بڑی شدت سے میم صاحبہ کا انتظار کر رہا تھا۔ عجیب سی حالت ہو چکی تھی اُس کی..... ہر وقت کھویا کھویا رہتا۔ گھنٹوں چشمے کے کنارے خاموش بیٹھا رہتا۔ کبھی گھوڑے پر بیٹھ کر وادی میں نکل جاتا اور دو تین روز بعد لوٹتا۔ میم صاحبہ نے اُس سے دسمبر کے تیسرے ہفتے میں آنے کا وعدہ کیا تھا۔ جوں جوں دسمبر کا تیسرا ہفتہ نزدیک آ رہا تھا اُس کی بے قراری بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ جب بھی مجھ سے ملتا سب سے پہلے تاریخ پوچھتا کہ لاہور میں موسم کیسا ہوگا۔ بارشوں کی وجہ سے راستے خراب تو نہیں ہوں گے۔ وغیرہ وغیرہ۔ صاف طور پر پتہ چلتا تھا کہ وہ میم صاحبہ کے انتظار کی ایک آہ گھڑی گن کر گزار رہا ہے..... مگر اب زبانی طور پر وہ اس کا اقرار نہیں کرتا تھا۔ کم از کم مجھ سے یہی ظاہر کر رہا تھا کہ میم صاحبہ کے متعلق اُس نے سوچنا چھوڑ دیا ہے۔ مجھ سے اُس نے یہ کیا تھا کہ اپنی ماں کے کپے پر عمل کرتے ہوئے وہ اس ماہ اپنی مگنی بھی کرا لے گا۔ اُس کا اپنی ہی برادری میں ایک قبول صورت لڑکی سے ہو رہا تھا۔

دسمبر کا تیسرا ہفتہ گزرا اور چوتھا ہفتہ بھی گزر گیا لیکن میم صاحبہ نہیں آئی۔ گلزار کی قابلِ رحم تھی۔ وہ ظاہر کچھ نہیں کرتا تھا لیکن ایسی ”بیاریاں“ چھپی کب رہتی ہیں۔ اُس کا

پنا چھوٹا ہوا تھا۔ رنگ زرد ہو چکا تھا اور رت جگے سے آنکھیں دھندلائی رہتی تھیں۔ ہر روز علی الصبح وہ اپنے ہاتھوں سے کالج کی جھاڑ پونچھ کرتا، جھاڑ دیتا، گراؤنڈ میں پانی وغیرہ لگاتا۔ پھر گھوڑے کے کھانے دانے اور مالش سے فارغ ہو کر چشمے کے کنارے جا بیٹھتا اور اپنی نگاہیں دور نیچے وادی میں بل کھاتی ہوئی سیاہ سڑک پر لگا دیتا..... یہاں تک کہ شام ہو جاتی۔ یہ جنوری کی دویاتین تاریخ کی بات ہے۔ چھٹی کا دن تھا۔ میں اپنے کوارٹر کے صحن میں سورج اور بادلوں کی آنکھ چھوٹی دیکھ رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ میرے ملازم نے دروازہ کھولا۔ سرگودھے سے آئے ہوئے ایک پارسی ڈاکٹر صاحب مجھ سے ملنا چاہتے تھے۔ ساتھ میں ان کے بیوی بچے بھی تھے۔ میں نے ذہن پر زور دیا تو اُن کی صورت یاد آ گئی۔ وہ ڈیڑھ سال پہلے گرمیوں کے سیزن میں یہاں چند روز قیام کر چکے تھے۔ ”یہاں“ سے میری مراد گلزار کا کالج ہے۔ اس قیام کے دوران مجھ سے اُن کی تھوڑی سی علیک سلیک ہو گئی تھی۔ میں نے ڈاکٹر صاحب کو اندر بلا لیا۔ انہوں نے اپنا مسئلہ بیان کرتے ہوئے کہا کہ اُن کی بیوی بچے ایک بار گلزار کے کالج میں رہ چکے ہیں اب وہ ضد کر رہے ہیں کہ گلزار کے کالج میں ہی رہیں گے۔ دوسری طرف گلزار کالج خالی ہونے کے باوجود انہیں دینے پر رضامند نہیں ہے۔

میں نے گلزار کو بلایا۔ وہ کچھ برہم دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے اُسے ایک طرف لے جا کر کہا۔ ”کیا بات ہے بھئی۔ کیوں انکار کر رہے ہو ڈاکٹر صاحب کو؟“ وہ بولا۔ ”لالہ! تم دیکھتے نہیں ہو۔ چھ بچے ہیں ان کے ساتھ۔ بچوں والی فیملی تو کبازہ کر دیتی ہے ہر چیز کا۔“

میں نے کہا۔ ”بھلے مانس، آدھا سیزن گزر گیا ہے۔ باقی جو آدھا رہ گیا ہے وہ بھی خالی گزر گیا تو کیا کرو گے۔ کسٹمر تو کہیں نظر نہیں آ رہا۔ تمہیں قسمت سے مل رہا ہے تو کیوں ٹھکرا رہے ہو؟“

وہ جل کر بولا۔ ”لالہ! ایسے کسٹمر سے کالج خالی ہی رہے تو بہتر ہے۔“ میں نے کہا۔ ”گلزارے! کسٹمر تو وہی ہے جسے تم نے پچھلے سال بڑے شوق سے کالج بھرتا مگر اب تمہاری سوچ وہ نہیں ہے..... بڑی بیوقوفی کا کام کر رہے ہو تم..... یہ بھی نہیں سوچتے کہ پورے ایک گھرانے کا بوجھ تمہارے کندھوں پر ہے۔“

”کیا مطلب؟“ وہ تنک کر بولا۔

”مطلب یہ کہ عشق سے خالی پیٹ نہیں بھرتا..... جس کا انتظار کر رہے ہو، وہ نہیں آئی

اُس کا رنگ ایک دم پھیکا پڑ گیا۔ کچھ دیر خاموش رہا، پھر ذرا سنبھل کر بولا۔
 ”لالہ! تم بالکل غلط سمجھ رہے ہو۔ ایسی بات نہیں ہے۔ یہ لو چابی..... جس کو مرنی
 دو کاٹج۔“ وہ چابی میرے سامنے میز پر رکھتے ہوئے تیز قدموں سے باہر نکل گیا۔

اُسی ہفتے وہ بیمار پڑ گیا۔ پہلے سر میں درد ہوا پھر تیز بخار چڑھ گیا۔ پانچ چھ روز اُس
 ڈاکٹر کی دوائی کھائی پھر کاٹج کا کام اپنے دوست جماعت علی کے سپرد کر کے گاؤں چلا
 گاؤں سے اُس کی واپسی کوئی ایک ماہ بعد ہوئی۔ میں نے اُسے دیکھا تو بہت حیران ہوا۔
 بے حد کمزور نظر آ رہا تھا۔ آنکھوں میں جیسے ایک مستقل آگ سی جل رہی تھی۔ اُس نے
 بتایا کہ وہ جہلم جا رہا ہے۔ وہاں اُس کا ایک چچا زاد بھائی ویلڈنگ کا کام کرتا ہے۔ ابھی وہ
 ڈلبوزی میں تو کوئی کام ہے نہیں وہ سوچ رہا ہے کہ وہاں جہلم میں چچا زاد بھائی کے ساتھ
 تین ماہ لگا آئے۔

میں جانتا تھا بات کچھ اور ہے..... پولیس والوں کا واسطہ دن رات جھوٹ بولنے والی
 سے رہتا ہے۔ انہیں جھوٹ کی جی پہچان عام آدمی سے زیادہ ہوتی ہے۔ مجھے شبہ تھا کہ جہلم
 صرف بہانہ ہے۔ گلزار داتا کی نگری لاہور جائے گا اور وہاں میم صاحبہ کو تلاش کرے گا۔
 اگر جہلم گیا بھی تو بہت جلد وہاں سے بستر بویا اٹھا کر لاہور پہنچ جائے گا۔ لاہور سے جہلم
 فاصلہ ہی کتنا ہے۔ زیادہ سے زیادہ سو میل۔ میں نے سوچا کہ گلزار کو روکنا چاہیے۔ وہ اُس
 سے کھیلنے کی کوشش کر رہا تھا اور اس کا جلنا یقینی تھا کیونکہ حالات نے اُس کے لباس پر غریب
 تیل چھڑک رکھا تھا۔ گلزار میری والدہ کو اچھا لگتا تھا اس لیے مجھے بھی اچھا لگتا تھا۔ میں نے
 چاہتا تھا کہ جسے ماں جی نے بیٹا کہہ کر پکارا ہے وہ اجنبی شہر میں رسوا ہوا اور ایک فاحشہ کی خانہ
 اپنی عزت اور جان خطرے میں ڈالے۔ میں نے ارادہ کیا کہ آج رات اپنی نیند گلزار کی
 کے لیے قربان کروں، چھٹی کے بعد گلزار کے گاؤں پہنچوں اور اُس کے گھر والوں سے کہہ
 کہ وہ منگنی شکنی چھوڑیں اور سیدھے سہاؤ دو بول پڑھوا کر گلزار کے پاؤں میں بیوی کی
 ڈال دیں۔ یہ حقیقت ہے کہ شادی، عشق کے بڑے بڑے ڈھیٹ بھوتوں کو بھی مار بھا
 ہے۔ عاشق ”شوہر“ بن کر گھر گریہ ہستی کے ایسے چکروں میں الجھتا ہے کہ دیرے دیرے
 کچھ بھول جاتا ہے۔ خود میرے پیارے خیر بلال شاہ کے ساتھ بھی اس سے ملتا جلتا واقعہ
 تھا۔ آغاز شباب میں وہ ایک لڑکی کے عشق میں گرفتار ہوا تھا۔ وہ بھیڑ بکریاں پالنے والا
 لوگ تھے۔ جب بلال شاہ کی شادی کسی اور جگہ ہونے لگی تھی تو اُس نے محبوبہ سے کہنا

”پیارے! میری جان تو تمہارے پاس ہے۔ میرا باپ مجھے نہیں میری لاش کو سہرا باندھ رہا
 ہے۔“ لاش نے سہرا باندھا تھا۔ اپنی شادی کے چاول کھائے تھے..... اور پھر اس لاش نے
 دس عدد بچے پیدا کیے تھے۔ اب یہ لاش سب کچھ بھول چکی تھی۔ دودھ جلیبیاں کھاتی تھی۔
 ادھر رڑکے جیتی تھی۔ اور بالکل ”زندہ انسانوں کی طرح“ لمبے لمبے ڈکار لیتی تھی۔

رات آٹھ بجے کے قریب جب میں اپنی سرکاری جیب پر گلزار کے گاؤں ”جاہو“
 جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ جماعت خان میرے پاس آیا اور اُس نے بتایا کہ گلزار جہلم جانے
 کے لیے آج تین بجے ڈلبوزی سے روانہ ہو گیا ہے..... میں سر پکڑ کر رہ گیا۔

☆=====☆=====☆

دو ہفتے بعد میں نے جہلم کے ایڈریس پر گلزار کا پتہ کرایا۔ میرے ہیڈ کانسیبل کو گلزار
 کے چچا زاد بھائی نے بتایا کہ گلزار اُس کے پاس آیا تھا۔ پانچ چھ روز اُس نے کام کیا۔ بیماری
 سے اٹھا تھا ابھی کمزوری باقی تھی اُسے پھر بخار چڑھنے لگا۔ کہنے لگا لاہور جا کر بڑے اسپتال
 میں دکھاؤں گا۔ بس میں بیٹھا اور لاہور چلا گیا۔ ابھی تک واپس نہیں آیا۔

یہ اطلاع میری توقع کے عین مطابق تھی۔ مجھے گلزار کی بیماری کا پتہ تھا اور اُس ”بڑے
 اسپتال“ کا بھی جہاں اُس نے جانا تھا۔ وہ یقیناً جین عرف جینی کی تلاش میں گیا تھا۔ وہ کوئی
 بچہ ہوتا تو میں اُسے ڈانٹ ڈپٹ کر سمجھا لیتا۔ وہ عاقل بالغ اور اپنے اچھے برے کا ذمے دار
 تھا۔ میں اُسے کہاں تک رسی ڈال کر رکھتا اور پھر میری اپنی مصروفیات بھی تھیں۔ تھانیدار کو تو
 بعض اوقات آٹھوں پہر ڈیوٹی پر رہنا پڑتا ہے۔ میرے لیے بھی اُس تھانے میں سوطر کے
 کنبڑے تھے۔ ہر تیسرے چوتھے روز کوئی نہ کوئی سنگین واردات ہو جاتی تھی۔ مارچ کے آخر
 میں ست دھارا کے نزدیک ڈکیتی کی ایک بڑی واردات ہوئی اور میں اُس میں ایسا الجھا کہ دو
 تین ہفتے اور گرد کی خبر نہ رہی۔ پٹھانکوٹ اور مہربا میں تقیش کرنے کے بعد ایک روز میں
 ڈلبوزی واپس آیا تو میرے اے ایس آئی نے کئی دوسری اطلاعات کے ساتھ ساتھ گلزار کے
 بارے میں بھی اطلاع دی۔ اُس نے بتایا کہ گلزار کی ماں گاؤں سے آئی ہوئی ہے اور میرے
 ہی کوارٹر میں رہائش پذیر ہے۔ وہ گلزار کے بارے میں بہت پریشان تھی اور چاہتی تھی کہ
 لاہور میں گلزار کا پتہ کرایا جائے۔ میرے اے ایس آئی نے مجھ سے پوچھے بغیر ہی دو کانسیبل
 روانہ کر دیئے تھے تاکہ وہ گلزار کا پتہ معلوم کریں۔

اسے ایس آئی اس کے سوا اور کبھی کیا سکتا تھا۔ بہر حال میں گھر پہنچا۔ گلزار کی ماں کے
 ساتھ اُس کی بڑی بیٹی بھی آئی ہوئی تھی۔ دونوں زار و قطار رو رہی تھیں۔ گلزار نے ڈلبوزی سے

نوجوان اس میں بیٹھ کر چلا گیا۔ اس واقعے کے بعد کرنل کے چوکیدار نے اُسے پھر نہیں دیکھا۔ کرنل کے چوکیدار نے جو کچھ بتایا تھا اُس کے مطابق سُرخ رنگ کی وہ گاڑی ماڈل ۱۹۷۰ کے سب سے امیر اور بااثر شخص لالہ ہر پرشاد کے اکلوتے بیٹے پرچی پال کی تھی۔ چوکیدار کے مطابق پرچی پال ایک بہت پڑھا لکھا اور فیشن اسبل نوجوان ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ایک بہت بڑا غنڈہ بھی ہے۔ درجنوں لوگوں کے ہاتھ پاؤں توڑ چکا ہے اور اُسے جانے والے اُس کے نام سے کانپتے ہیں۔ یہ پرچی پال مسٹر الفریڈ کی بیٹی جین کا منگیترا ہے اور اس مسٹر الفریڈ کے گھر آتا جاتا رہتا ہے۔ اُس کی گاڑی میں پہاڑی نوجوان کا بیٹھ کر چلے جانا خطرے کی نشانی ہے۔

دونوں کانشیلوں نے اپنے طور پر بہت کوشش کی تھی کہ گلزار کا کوئی سراغ ملے لیکن پرچی پال کی گاڑی میں بیٹھ کر چلے جانا اُس کا آخری سراغ ثابت ہوا تھا۔

☆=====☆=====☆

کانشیلوں کی دی ہوئی اطلاع کسی طور بھی تسلی بخش نہیں تھی۔ حالات بالکل ویسا رخ اختیار کر رہے تھے جیسا میں نے اندازہ لگایا تھا۔ گلزار میم کی سنہری زلفوں میں الجھ کر لاہور پہنچا تھا اور وہاں سے گم شدہ ہو گیا تھا۔ ادھر ڈلہوزی میں اُس کے گھر والوں پر قیامت گزر رہی تھی۔ میں نے گلزار کی ماں سے وعدہ کیا تھا کہ جلد گاؤں آکر اُسے گلزار کی خیر خیریت سے آگاہ کر دوں گا اور ہو سکتا ہے گلزار کو اپنے ساتھ ہی لے آؤں، اب سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس اندے سے گاؤں جاؤں اور انہیں تسلی دوں۔ گلزار کو ڈلہوزی سے نکلے اب قریباً سات ہفتے ہو چکے تھے اور گزرنے والے ہر دن کے ساتھ اُس کی گمشدگی سنگین ہوتی جا رہی تھی۔

دو تین روز کے اندر میں نے تھانے میں اپنے ضروری کام نبھائے اور کانشیل احسان الہی کو لے کر ڈلہوزی سے عازم لاہور ہو گیا۔ ہم پٹھانکوٹ سے ٹرین میں پنڈی پہنچے اور وہاں سے بذریعہ بس ایک دشوار سفر کے بعد لاہور آ گئے۔ یہ اپریل کا مہینہ تھا۔ لاہور میں ابھی گرمی کا زور نہیں ہوا تھا لیکن ڈلہوزی کی ٹھنڈی ٹھار ہواؤں سے نکل کر آئے تھے لہذا ہمیں کافی گرمی محسوس ہو رہی تھی۔ لاہور پہنچتے ہی مقامی تھانے کا رخ کیا۔ ایس ایچ اوانا تھا سنگھ ایک مددگار شخص تھا۔ میرے دونوں کانشیل پہلے ہی اُس سے مل چکے تھے لہذا اس کیس کی الف ب اُسے معلوم تھی۔ وہ مجھے کچھ ڈرا ڈرا سا لگا۔ اس ڈر کی وجہ کوئی ڈھکی چھپی نہیں تھی۔ میں جس معاملے کی چھان بین کے لیے یہاں آیا تھا اُس میں مسٹر الفریڈ اور لالہ ہر پرشاد جیسے لوگوں کا نام آ رہا تھا۔ اگر خدا نخواستہ یہ معاملہ بگڑ جاتا تو نا تھا سنگھ کے لیے تو قیامت ہی آ جانا تھی۔ میں

جانے کے بعد کوئی پیسہ نہیں بھیجا تھا۔ نتیجہ یہ نکلا تھا کہ گھر میں فاتحہ چل رہے تھے۔ یہ فائدہ بھی برداشت کیے جاسکتے تھے مگر یہ تو پتہ چلتا کہ گلزار ہے کہاں۔ جہلم سے گلزار کے چچا نے جو خط لکھا اُس میں یہی بتایا تھا کہ وہ چند روز اُس کے پاس ٹھہرنے کے بعد لاہور پہنچا ہے۔ میں نے ماں بیٹی کو ہر طرح تسلی دی اور انہیں خود واپس گاؤں چھوڑ کر آیا۔ میں نے انہیں کہا کہ جیسے ہی گلزار کا اتہ پتہ معلوم ہوتا ہے میں انہیں خود بتا کر جاؤں گا۔ واپس آتے ہوئے میں نے گلزار کے بھائی کی جیب میں چپکے سے چند روز کا خرچہ ڈال دیا۔

لاہور گئے ہوئے کانشیل پورے ایک ہفتے بعد واپس آئے۔ یہ بڑے ہوشیار کانشیل تھے اور سادہ کپڑوں میں سن گن لینے کا انہیں وسیع تجربہ تھا۔ ان میں سے ایک کانشیل ”شاہی“ والے کیس میں بڑی مدد کی تھی۔ ان کانشیلوں نے گلزار کے متعلق جو اطلاع دی، ہرگز تسلی بخش نہیں تھی۔ انہوں نے بتایا کہ پچھلے مہینے گلزار نہ صرف لاہور پہنچا تھا بلکہ میم صاحب سے ملنے اُس کی رہائش گاہ تک گیا تھا۔ یہ وسیع و عریض رہائش گاہ ماڈل ٹاؤن کے ایک شاندار علاقے میں تھی اور اس علاقے میں کوئی ایریا غیر شخص قدم بھی نہیں رکھ سکتا تھا۔ میرے کانشیلوں کی حاصل کردہ معلومات کے مطابق میم صاحب کے والد گرامی کا نام الفریڈ الفریڈ پکی عمر کا ایک لمبا چوڑا انگریز تھا۔ وہ کئی گز لمبی کار میں گھومتا تھا اور اُس کی کار میں وقت ایک نہایت خوفناک صورت کا براؤن کتا موجود رہتا تھا۔ الفریڈ کی رہائش گاہ نزدیک ہی ایک کوٹھی میں کوئی کرنل صاحب رہتے تھے۔ کرنل کی کوٹھی کا چوکیدار پولیس ریٹائرڈ ملازم تھا۔ میرے کانشیلوں نے اسی ملازم سے رابطہ کر کے گلزار کے بارے میں کون گن لی تھی۔ کرنل کے چوکیدار نے بتایا تھا کہ پچھلے مہینے چند سولہ تاریخ کو انگریز الفریڈ کوٹھی میں کوئی پارٹی تھی۔ گیٹ پر روشنیاں لگی ہوئی تھیں اور چندہ بیس گاڑیاں کھڑی تھیں۔ شام سے تھوڑی دیر پہلے شلوار قمیص والا ایک نوجوان گیٹ پر آیا اور چوکیدار سے باتیں کر لگا۔ (اس نوجوان کا حلیہ گلزار سے ملتا جلتا تھا) اُس نے پہاڑی چپل پہن رکھی تھی اور چترالی طرز کی ٹوپی تھی۔ وہ کافی دیر مسٹر الفریڈ کے چوکیدار سے باتیں کرتا رہا۔ پھر انہوں نے بحث کی شکل اختیار کر لی۔ ایک دو ملازم اور بھی اکٹھے ہو گئے اور انہوں نے نوجوان دھکے دے کر گیٹ سے بنا دیا۔ اگلے روز کرنل کے چوکیدار نے اس پہاڑی نوجوان کو پچھلے کے گرد منڈلاتے دیکھا۔ اس سے پہلے کہ وہ اُس سے پوچھ گچھ کرتا مسٹر الفریڈ کی کوٹھی سُرخ رنگ کی گاڑی نکلی۔ نوجوان نے ہاتھ دے کر گاڑی کو روکا۔ اُس کی کھڑکی میں کچھ دیر کچھ دیر باتیں کرتا رہا۔ اس کا انداز بڑا خوشامدی تھا۔ تھوڑی دیر بعد گاڑی کا دروازہ کھلا

کیوں میں میری مدد کر چکے تھے۔ انہوں نے میری بات تسلی سے سنی۔ پھر کہنے لگے۔ ”مسٹر الفریڈ اور لالہ ہر پرشاد دونوں شہر کے معزز لوگوں میں سے ہیں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ قانون سے بالاتر کوئی نہیں۔ تم اگر ہر پرشاد کے بیٹے سے پوچھ گچھ کرنا چاہتے ہو تو ضرور کرو۔ ہاں..... یہ بات ہے کہ وہ بہت مصروف شخص ہے۔ میں فون پر بات کر کے اُس سے وقت لے لوں گا۔ پھر تمہیں بتا دوں گا۔“

مجھے بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ جہاں اتنے دن انتظار کیا تھا وہاں ایک آدھ دن مزید انتظار کرنے سے کیا فرق پڑتا تھا۔ تیسرے روز ایس ایس پی صاحب نے انسپکٹر ناتھ سنگھ کو فون کر کے بتایا کہ انسپکٹر نواز خان آج سہ پہر ٹھیک تین بجے پر تھی پال کے آفس واقع ڈیوس روڈ پر پہنچ جائے۔

میں ٹھیک تین بجے پر تھی پال کے دفتر پہنچ گیا۔ یہ دفتر ایک بہت بڑی عمارت میں تھا۔ عمارت کی پیشانی پر دھات کے بڑے خوبصورت الفاظ میں ”ونڈر کارپس ڈیلرز“ کے الفاظ آویزاں تھے۔ پر تھی پال نے ایک آراستہ پیراستہ دفتر میں مجھے ملاقات کا ”اعزاز“ بخشا۔ وہ شکل و صورت سے ہی ایک بگڑا ہوا رئیس زادہ نظر آتا تھا۔ گلے میں سونے کی موٹی زنجیر۔ ہاتھوں میں ڈائمنڈ کی انگوٹھیاں۔ آنکھوں میں سنہری فریم کی عینک۔ وہ ایک وسیع میز کے پیچھے بیٹھا مجھے خشک نگاہوں سے گھور رہا تھا۔ جیسے پوچھ رہا ہوں۔ اچھا..... تو یہ تم ہو وہ دو ٹکے کے انسپکٹر جس نے مجھ سے پوچھنا چھ کرنے کی جرأت کی ہے۔

”بیٹھو۔“ اس نے اپنے بھاری بھر کم لہجے میں کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ میں بیٹھ گیا۔ ”کہو، میں کیا سیوا کر سکتا ہوں تمہاری۔“ وہ اکھڑے ہوئے لہجے میں بولا۔ اُس کے انداز سے لگتا تھا جیسے ملزم میں ہوں اور وہ تھانیدار ہے۔

میں نے کہا۔ ”پر تھی پال صاحب! ڈھلوزی کا ایک نوجوان گھڑا پچھلے ڈیڑھ ماہ سے لاپتہ ہے ہم اُسی کی تلاش میں یہاں آئے ہوئے ہیں۔ ہمیں معلوم ہوا ہے کہ یہ نوجوان مسٹر الفریڈ کی رہائش گاہ کے آس پاس دیکھا گیا تھا۔ میں اسی سلسلے میں آپ سے چند سوال کرنا چاہتا ہوں۔“

وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔ ”میں آپ کے سوالوں کے جواب دینے کے لیے ہی تو یہاں بیٹھا ہوا ہوں۔ اب آپ منہ سے کچھ نکالیں گے تو مجھے پتہ چلے گا ناں کہ مجھے کیا جواب دینا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”پچھلے مہینے سولہ تاریخ کو بروز جمعرات مسٹر الفریڈ کی رہائش گاہ پر ایک

نے فیصلہ کیا کہ کوئی بھی کارروائی کرنے سے پہلے ناتھ سنگھ کو سب کچھ بتا کر پوری طرح میں لے لوں۔ میں نے اُسے گلزار اور جین (میم صاحب) کی پوری سنوری سنائی۔ جب میں نے ناتھ سنگھ کو بتایا کہ مسٹر الفریڈ کی یہ خوبصورت بیٹی گھر سے دور جا کر کیا گل کھلاتی رہی وہ بھی ششدر رہ گیا..... نا جائز تعلقات اور وہ بھی بالکل معمولی قسم کے لوگوں سے..... کی بات تھی۔ جین جیسی لڑکیاں تو جس پھل کی طرف ہاتھ بڑھائیں۔ وہ شاخ سمیت آتا ہے۔ اعلیٰ خاندانوں کے حسین و جمیل نوجوان جین جیسی لڑکی سے دوستی کے خواہش ہو سکتے تھے۔ پھر وہ کیوں راج مزدوروں، ڈرائیوروں اور چوکیداروں پر نگاہ کر رہی تھی ناتھ سنگھ میری بات سن کر گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ کہنے لگا۔

”نواز خان! میری سمجھ میں ایک ہی بات آتی ہے۔ یہ جو گڑی ہے ناں تھی (ا) پیدا ہوئی ہے۔ تھوڑا بہت میں بھی جانتا ہوں اسے۔ اس میں کوئی گل سیدھی ہے ہی نہیں۔ دوسروں کو حیران کرنا چاہتی ہے۔ چاہے اس کے لیے سارے کپڑے اتار کر بھرے بازار کھڑا ہونا پڑے۔ یہ پچھلی دیوالی کی بات ہے۔ وہ اور اُس کی سیملی حرام جادی..... کیا نام اُس کا..... ہاں پریم..... وہ دونوں اپنی دس گز لمبی کار میں بیٹھ کر پرانی انارکلی میں دی گئے کھانے پہنچ گئیں۔ اوپر سے لباس ایسا پہن رکھا تھا کہ چھ سال کا بچہ بھی دیکھے تو ایک دم دم سال کا ہو جائے۔ وہاں تو بھی مجمع لگ گیا تماش بینوں کا۔ ایک سے بڑھ کر ایک بہن کا تھا۔ راگبیر بھی رک رک کر دیکھنے لگے۔ ٹریفک جام ہو گئی۔ میرا ایک سب انسپکٹر ادھر سے رہا تھا۔ اُس نے اُن دونوں کو سمجھایا کہ وہ کیوں اپنا اور دوسروں کا تماشا بن رہی ہیں۔ بازار میں اچھے برے ہر طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ یہ نہ ہو کہ کوئی مصیبت پڑ جائے۔ اگر وہی کھانے کا اتنا ہی شوق ہے تو وہ گھر جا کر کھالیں..... بس اتنی سی بات پر حرام جادیاں آگ ہو گئیں۔ سب انسپکٹر کی بے عزتی کر ڈالی۔ وہ تو بندہ سمجھ دار تھا ہوا کا رخ دیکھ کر پیچھے ہٹا۔ ورنہ ہو سکتا تھا پتھر پتھر ہی پڑ جاتے بے چارے کو۔“

انسپکٹر ناتھ سنگھ اور میں دیر تک باتیں کرتے رہے۔ ناتھ سنگھ نے بڑی ہمدردی ساتھ مجھے یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ یہ معمولی لوگ نہیں ہیں اور اگر میں ان سے پوچھ گچھ ہی چاہتا ہوں تو اپنے آپ کو پوری طرح تیار کر لوں۔ ناتھ سنگھ کی بات میں وزن تھا۔ اُسی روز ہیڈ کوارٹر میں انگریز ایس ایس پی صاحب سے رابطہ قائم کیا تھا اور انہیں تمام حوالہ حال بتائی۔ عام طور پر انگریز افسر اپنے کسی ہم وطن کے خلاف کسی مقامی کو کارروائی اجازت نہیں دیا کرتے تھے لیکن ایس ایس پی صاحب مجھے عرصے سے جانتے تھے۔

بک رہا تھا۔ چوکیدار پہلے تو اُسے سمجھاتے رہے وہ باز نہیں آیا تو انہوں نے اس کی مرمت کردی اور دھکے دے کر وہاں سے ہٹا دیا۔

میں نے پوچھا۔ ”موقع پر موجود مہمانوں کا نو جوان کے بارے میں کیا خیال تھا؟“ وہ بولا۔ ”خیال کیا ہونا تھا۔ وہ اُسے ولی اللہ سمجھنے سے تو رہے۔ سب دیکھ رہے تھے کہ وہ پاگل سانٹے باز ہے۔“

میں نے پوچھا۔ ”اُس نو جوان سے آپ کی دوسری ملاقات کب ہوئی؟“ وہ بولا۔ ”ابھی تک تو نہیں ہوئی۔ اگر ہوگئی تو میں سب سے پہلے تمہیں اطلاع دوں گا۔“

”لیکن کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ وہ نو جوان پارٹی سے اگلے روز دس بجے کے قریب آپ کی گاڑی میں بیٹھ کر آپ کے ساتھ گیا تھا۔“

وہ سگریٹ کا کش لے کر بولا۔ ”جن لوگوں کا یہ خیال ہے انہیں چار نمبر بس پر بٹھا کر پاگل خانے پہنچا دو..... یا پھر انہیں باؤ لے کتے نے کاٹا ہوگا اُن کا علاج شلاج کراؤ۔“

پرتھی پال کا لہجہ بڑا تند و تیز تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ اگر میں نے اُسے مزید کریدنے کی کوشش کی تو وہ بھڑک اٹھے گا۔ میں نے موضوع بدل دیا اور تھوڑی دیر ادھر ادھر کی باتیں کر کے اُس کے پاس سے اٹھ آیا۔

پرتھی پال سے ملاقات کے بعد میں نے ضروری سمجھا کہ اُس چوکیدار سے ملاقات کی جائے جس نے ایک مہینہ پہلے گلزار کو پرتھی پال کی سُرخی کار میں سوار ہوتے دیکھا تھا۔ اُس چوکیدار سے ملاقات کرنل کی کوٹھی میں ہی ہو سکتی تھی۔ شام کو میں سادہ لباس میں کرنل کی کوٹھی جا پہنچا۔ چوکیدار کا نام محمد حسین تھا اور وہ پنجاب پولیس میں حوالدار رہ چکا تھا۔ مہندی رنگے بالوں والا یہ اڈھیر عمر شخص مجھے بڑے تپاک سے ملا۔ میرے کانسیلیوں سے اُسے میرے بارے میں سب کچھ معلوم ہو چکا تھا۔ کرنل کی کوٹھی کے گیٹ پر لکڑی کا بنا ہوا ایک بزرنگ کا کیبن تھا۔ اس کیبن میں دو کرسیاں اور ایک چارپائی پڑی تھی۔ ایک تھری ناٹ تھری رائفل، گولیوں والا ایک بیلٹ، ایک نارنج، چائے کے برتن اور چابیوں کا ایک بڑا گچھا۔ یہ اس کیبن کی کل کائنات تھی۔

میں محمد حسین کے ساتھ چارپائی پر جا بیٹھا۔ کوٹھی میں مکمل تاریکی تھی۔ معلوم ہوا کہ کرنل صاحب بمعہ اہل و عیال کہیں گئے ہوئے ہیں..... کیبن کی ایک کھڑکی سے تارکول کی صاف ستھری سڑک نظر آتی تھی۔ اس سڑک کی دوسری جانب کوئی سوگڑ کے فاصلے پر مسٹر الفریڈ کی

ساگرہ پارٹی تھی۔ کیا آپ اُس پارٹی میں شریک ہوئے تھے؟“

”بالکل ہوا تھا۔“ پرتھی پال نے جواب دیا۔ ”وہ جینی کی ساگرہ تھی اور

جینی میری ہونے والی لائف پارٹنر یعنی کیا کہتے ہیں بیوی ہے۔“

”آپ اُس پارٹی میں کب سے کب تک رہے؟“

”شروع سے آخر تک۔“

”میں ٹائم پوچھنا چاہتا ہوں۔“

پرتھی پال مجھے گھورتے ہوئے بولا۔ ”بال کی کھال اتارنا چاہتے ہو تو یہ کوئی اچھا شوق نہیں ہے۔“

”گستاخی معاف۔ میں شوق کے لیے نہیں قانونی ضرورت کے تحت پوچھ رہا ہوں۔“

وہ گہری سانس لے کر بولا۔ ”پارٹی قریباً سازی رات چلتی رہی تھی۔ صبح دم اکثر مہمان

انیکسی میں ہی سو گئے تھے۔ میں بھی صبح دس گیارہ بجے اٹھ کر آیا تھا۔“

میں نے پوچھا۔ ”کیا اس سے پہلے بھی ایسا ہوتا رہا ہے کہ آپ نے اپنی منگیت کے گھر شب بسر کی ہو؟“

وہ تھیکے لہجے میں بولا۔ ”بالکل ہوتا رہا ہے۔ نچلے لوگوں جیسی تنگ نظری ہمارے

گھرانوں میں نہیں ہوتی۔ ہم اکٹھے گھومتے پھرتے ہیں۔ پارٹیوں میں جاتے ہیں۔ اکثر

پارٹیاں رات دیر تک چلتی رہتی ہیں اور شام کو گئے ہوئے مہمان صبح ہی واپس آتے ہیں۔“

میں نے کہا۔ ”پرتھی پال صاحب! آپ کے بیان سے ظاہر ہے کہ شام کے وقت آپ

مسٹر الفریڈ کی کوٹھی میں تھے۔ چند گواہیوں کے مطابق شام کے وقت کوٹھی کے گیٹ پر جھوٹا سا

جھگڑا ہوا تھا۔ ایک اجنبی نو جوان کوٹھی میں جانا چاہتا تھا۔ چوکیداروں نے اُسے روکا تھا اور

بحث تکرار کے بعد دھکے دے کر اُسے وہاں سے چلتا کیا تھا۔ آپ کو اس جھگڑے کے بارے

میں پتہ ہے؟“

پرتھی پال بولا۔ ”تم نے ذکر کیا ہے تو مجھے یاد آیا ہے۔ شام کے وقت گیٹ پر کچھ ہلا گلا

ہوا تھا۔ یہ ایک خطبی سا پہاڑی لڑکا تھا۔ کپڑے بوسیدہ تھے اور داڑھی بڑھی ہوئی تھی۔ غالباً اُس

نے کچھ نشہ وغیرہ بھی کر رکھا تھا۔ کہہ رہا تھا کہ میں نے میم صاحبہ سے ملنا ہے۔ میم صاحبہ سے

اُس کی مراد غالباً جینی ہی تھی۔ چوکیدار نے پوچھا کہ میم صاحبہ سے تمہارا کیا واسطہ ہے؟ وہ بولا

میں میم صاحبہ کا خادم ہوں اُن کا سیوک ہوں۔ انہوں نے میرا بنگلہ بک کر رکھا ہے۔ میں نے

اُن سے پوچھنا ہے کہ وہ میرے بنگلے میں رہنے آئیں گی یا نہیں..... پتہ نہیں کیا وہی بتائی

کوٹھی کا جہازی سائز گیٹ تھا۔ چوکیدار محمد حسین نے مجھے تفصیل سے بتایا کہ وہ کہاں بیٹھا تھا۔ شلوار قمیص والا پہاڑی نوجوان کہاں گھوم رہا تھا اور پرتھی پال نے کس جگہ گاڑی روک کر نوجوان کو گاڑی میں سوار کرایا تھا۔

میں نے چوکیدار محمد حسین سے کہا۔ ”تم جو کچھ بتا رہے ہو اس سے ثابت ہوتا ہے کہ 17 مارچ کی صبح پرتھی پال نے گلزار کو کسی برے ارادے کے ساتھ اپنی گاڑی میں بٹھایا اور کہیں لے کر چلا گیا۔ اب دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں۔ وہ اُسے قتل کر چکا ہے یا پھر کسی محفوظ جگہ پر جس بے جا میں رکھا ہوا ہے۔ اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ ایسی محفوظ جگہ کون سی ہو سکتی ہے۔“

محمد حسین نے کہا۔ ”جناب! اس بارے میں میں نے بھی سوچ بچار کی ہے۔ میرا خیال ہے کہ آپ کو کالا شاہ کا کووالی فیکٹری سے پتہ کرنا چاہیے۔“

میں کالا شاہ کا کوکی فیکٹری کا ذکر پہلی بار سن رہا تھا۔ میں نے پوچھا۔ ”یہ کس کی فیکٹری ہے؟“

محمد حسین نے بتایا۔ ”جناب! میرے علم کے مطابق اس فیکٹری کی زمین پرتھی پال صاحب کو اپنی منگنی کے تحفے میں ملی ہے۔ اب اُس زمین پر وہ اپنے خرچے سے فیکٹری بنا رہے ہیں۔ بڑی لمبی چوڑی عمارت ہے۔ سیلاب کی وجہ سے فیکٹری میں پانی چلا گیا تھا۔ اس لیے پچھلے پانچ سات مہینے سے وہاں کام رکا ہوا ہے۔ پرتھی پال صاحب وہاں اکثر آتے جاتے رہتے ہیں۔ سنا ہے وہاں رنگ رلیاں بھی ہوتی ہیں۔ پرتھی پال صاحب نے وہاں دو تین کمرے بنوا رکھے ہیں جہاں اپنے دفتر کی ملازم لڑکیوں کو ”نوکری پکی کرنے“ کے لیے لے جاتے رہتے ہیں۔ میرا دل گواہی دے رہا ہے جی کہ اگر پرتھی پال صاحب نے اُس لڑکے کو کسی بُری نیت سے گاڑی میں بٹھایا تھا تو ضرور اس فیکٹری میں لے گئے ہوں گے۔ وہاں ایک تو کیا پچاس بندے بڑے آسانی سے قید رکھے جاسکتے ہیں اور اگر کسی کو قتل کر کے مدعا غائب کرنا ہو تو بھی وہ جگہ بڑی مناسب ہے۔“

☆=====☆=====☆

رات خنک اور پُر سکون تھی۔ چودھویں تاریخ تھی اپریل کی اور چاند کی بھی غالباً چودھویں پندرھویں ہی تھی۔ زرد چاندنی گندم کے سنہری کھیتوں پر گر کر کچھ اور بھی زرد نظر آرہی تھی۔ میں نے اپنی جیب فیکٹری کے بلند و بالا گیٹ سے کوئی ایک فرلانگ دور جنت اور کیکر کے گھنے درختوں میں روک دی۔ میں سادہ لباس میں تھا۔ قمیص کے نیچے میں نے ہولٹر

باندھ رکھا تھا اور اُس میں بھرا ہوا سرکاری ریوالور تھا۔ فیکٹری کا اندر باہر مکمل تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ صرف لوہے کے زنگ آلود گیٹ کے قریب کچھ روشنی نظر آرہی تھی۔ روشنی کی موجودگی سے اشارہ ملتا تھا کہ شاید فیکٹری میں چوکیدار موجود ہو لیکن یہ کوئی ضروری بھی نہیں تھا۔ میں گیٹ کے قریب سے گزرا اور درختوں میں ٹہلتا ہوا چار دیواری کے ساتھ ساتھ آگے بڑھنے لگا۔

جونہی میں فیکٹری کے پچھواڑے پہنچا مجھے ٹھک کر رک جانا پڑا۔ فیکٹری کی دیوار کے ساتھ ہی مزدوروں کی چند جھونپڑیاں نظر آرہی تھیں۔ ایک شخص لپک کر میرے سامنے آیا اور بڑے ادب سے جھک کر سلام کی۔ وہ ایک ادھیڑ عمر شخص تھا۔ جسم پر فقط ایک لنگوٹی تھی اور چاندنی میں پسلیاں نمایاں نظر آرہی تھیں۔ وہ ہاتھ جوڑ کر بولا۔ ”معاف کرنا صاحب! اُس کا بچہ بیمار تھا۔ وہ آنہ سکی۔ آج آپ نہ آتے تو میں ابھی خود چھوڑ کر آتا اُسے۔ معاف کر دیں صاحب۔ وہ بالکل تیار ہے۔ میں ایک سینکڑے میں حاجر کرتا ہوں اُسے۔“ پھر وہ تیزی سے مڑا اور جھونپڑے کی طرف منہ کر کے دہلی آواز میں بولا۔ ”اوراجی..... اوراجی..... چل آجا باہر۔ بابو صاحب آئے ہیں۔“

میں حیرت میں گم یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ دو سینکڑے بعد جھونپڑے کا پردہ ہلا اور ایک ہیولا سائل کر میرے سامنے کھڑا ہو گیا۔ وہ چوبیس پچیس سال کی ایک عورت نما لڑکی تھی۔ رنگ گندمی، آنکھیں بڑی بڑی اور جسم نازک لیکن فاقہ زدہ۔ مدقوق بوڑھا مجھے اور لڑکی کو آٹے کے سامنے چھوڑ کر گناہ گار انداز میں جھونپڑے کے اندر غائب ہو گیا۔ میں چند سینکڑے تو مبہوت کھڑا رہا۔ پھر تیزی سے فیصلہ کیا اور ایک طرف چل دیا۔ لڑکی پائل اور چوڑیاں چھنکاتی میرے ساتھ آئی۔

کبھی سادگی تھی قربان ہونے کو دل چاہ رہا تھا۔ نہ نام پتہ پوچھا، نہ آنے کی وجہ، نہ کوئی سوال اور لڑکی میرے ساتھ روانہ کر دی..... چینی مفکر کنفیو شس کہتا ہے کہ معدہ خالی ہو تو عقل نامانوس نکل کر معدے میں اتر جاتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ بھوکا شخص روٹی سے آگے کی چیزیں نہ جانتا۔ اس بھوکے شخص کو بھی شاید صرف، دوٹی نظر آرہی تھی جو اُسے اپنی بہو بیٹی کی عزت کے بدلے میں ملتی تھی۔ میں لڑکی کو درختوں میں چلاتا ہوا جیب کی طرف لے گیا۔ پولیس جیب کو دیکھ کر وہ ایک دم حیران بلکہ خوفزدہ نظر آنے لگی۔ اُس کے ہونٹوں سے ڈری سہی آواز نکلی۔ ”بابو صاحب! کہاں جانا ہے؟“

”تھانے میں۔“ میں نے تسلی سے جواب دیا۔

لڑکی کا زرد چہرہ ایک دم تاریک نظر آنے لگا۔ مجھے محسوس ہوا کہ وہ ایک دم بھرا گیا۔ میں نے لپک کر اس کا بازو پکڑ لیا۔ وہ تھر تھر کانپ رہی تھی۔ روہانی آواز میں ”میرا اس میں کوئی تصور نہیں ہے تھانیدار جی۔ میرے گھر والے کا باپ جو کہتا ہے میں ہوں۔ میرا گھر والا ہسپتال میں ہے جی۔ اُس کی گردن میں جبر باد کا پھوڑا ہے۔ ہمارے کھانے کو کچھ نہیں ہے۔ خالی پیٹ ہم کسی سے ٹکر کاہے کو لے سکتے ہیں۔ وہ بابو لوگ جو روا لے ہیں۔ ہم اُن کا کہنا نہ مانیں گے تو کیا کر لیں گے۔ عجت تو پھر بھی جائے گی۔ چند روپے پیٹ کا دوغ بچھانے کو ملتے ہیں وہ بھی نہیں ملیں گے۔“ وہ چہرہ ہاتھوں میں چب زار و قنار روئے لگی۔

میں نے اُس سے پوچھا۔ ”کون ہیں وہ بابو لوگ؟“
وہ روتے روتے بولی۔ ”اس کا رخانے کے مالک۔ وہ جو بڑی بڑی گاڑیوں میں آتے ہیں۔“

صورت حال کافی حد تک میری سمجھ میں آرہی تھی۔ میں نے لرزتی کانپتی لڑکی شانے پر ہاتھ رکھا اور بڑی نرمی کے ساتھ اُسے گاڑی کے اندر لے آیا۔ میں نے اُسے کہ بابو اور اُس کے ساتھیوں پر زبردست چھاپہ پڑنے والا ہے۔ اگر وہ تھانے پکھڑیوں چکر سے بچنا چاہتی ہے تو ہر بات صاف صاف بتا دے۔ میری یہ بات دہلی پتلی لڑکی میں آگئی۔ وہ پہلے تو ہنچکپاتی رہی پھر اُس نے ہمت کر کے سب کچھ میرے گوش گزار کر دیا۔ اُس کا نام حسہ تھا اور کوئی ایک برس پہلے اُس کی شادی ہوئی تھی۔ اُس نے جو کہ وہ مختصر اس طرح ہے۔ فیکٹری میں سیلاب آنے سے پہلے بابو پر تھی پال اور اس کے دوست ہر ہفتے اس جگہ محفل جماتے تھے۔ شراب اور جواء وغیرہ تو اس محفل میں ہمیشہ کبھی کبھار کوئی لڑکی بھی بلالی جاتی تھی۔ ایک مرتبہ انہیں کوئی لڑکی نہ ملی تو وہ حسہ کو زبردستی کر اپنی محفل میں لے گئے۔ شیر کے سامنے کوئی احتجاج کر سکتا ہے۔ یہ بھوکے منگے لہو کے گھونٹ پی کر چپ ہو رہے۔

حسہ اس جھوپڑا بستی کی سب سے خوبصورت لڑکی تھی۔ وہ ایک بار فیکٹری گئی تو جانے لگی۔ پہلے وہ روتی منہ بسورتی جاتی تھی لیکن جب نوٹ وغیرہ ملنے لگے تو اپنی مرضی جانے لگی۔ بلکہ ایک موقع ایسا آیا کہ بستی کی دوسری لڑکیاں اُس پر رشک کرنے لگیں۔ دنوں فیکٹری میں سیلاب کا پانی گھس گیا اور کئی مہینوں کے لیے یہ خرستیاں دم توڑ رہیں۔ اب مہینے ڈیڑھ مہینے سے یہ سلسلہ پھر شروع ہو گیا تھا۔ کل بھی فیکٹری میں محفل جی ہوا۔

بڑے بابو صاحب نے چوکیدار کے ہاتھ پیغام بھیجا تھا کہ حسہ فیکٹری میں آجائے۔ اُسے سخت بیمار تھا اور پھر بارش بھی شروع ہو گئی تھی۔ وہ نہ جاسکی۔ آج وہ اور اُس کا سسر خوف سے کانپ رہے تھے۔ اتنے میں میں وہاں پہنچ گیا۔ حسہ کا سسر مجھے اندھیرے میں دیکھ کر یہی سمجھا کہ بڑے بابو صاحب نے اپنی کسی ساتھی کو بھیجا ہے۔ اُن کے سوا یہاں اور آ بھی کون سکتا تھا۔ اُس نے فوراً بہو کو میرے ساتھ روانہ کر دیا۔

میں نے حسہ نامی اس لڑکی سے اندر کی تمام معلومات حاصل کر لیں۔ اُس نے بتایا کہ آج کل فیکٹری میں صرف ایک چوکیدار ہے اور وہ بڑے گیٹ کے پاس لینا رہتا ہے یا کرسی پر بیٹھا رہتا ہے۔ بڑے بابو صاحب (پرتھی پال) کے ساتھ تین یا چار لڑکے ہوتے ہیں۔ اُن کے پاس کوئی اسلحہ وغیرہ نہیں ہوتا۔ ہاں بڑے بابو کی گاڑی میں ایک عجیب سا پستول پڑا رہتا ہے۔ میں نے حسہ کو پوری طرح اعتماد میں لے لیا تھا۔ میں نے اُسے بتایا کہ آج سے کوئی ایک مہینہ پہلے پرتھی پال نے ڈلہوڑی سے آئے ہوئے ایک لڑکے کو اغوا کیا ہے۔ ہم اُسی کو تلاش کر رہے ہیں۔ کیا وہ اس سلسلے میں ہماری کوئی مدد کر سکتی ہے؟

وہ ڈری ہوئی آواز میں بولی۔ ”صاحب جی! اپنے بچے کی قسم، مجھے اس بارے میں کچھ پتہ نہیں۔ پچھلے ایک ڈیڑھ مہینے میں صرف تین بار کارخانے میں گئی ہوں۔ مجھے تو وہاں بڑے بابو اور اُس کے یاروں کے سوا اور کوئی خبر نہیں آیا۔“

میں نے پوچھا۔ ”کارخانے میں کوئی ایسی جگہ ہے جہاں کسی کو بند رکھا جاسکے اور کارخانے میں آنے جانے والے اُسے دیکھ بھی نہ سکیں؟“

وہ بولی۔ ”ہاں جی۔ جرور ہے ایسی جگہ اور۔۔۔۔۔“ ایک دم وہ کچھ کہتے کہتے چپ ہو گئی۔ مجھے اُس کے چہرے پر گہری سوچ اور تیر کے آثار نظر آئے۔ صاف محسوس ہوتا تھا کہ اُسے کوئی بہت اہم بات یاد آئی ہے۔ پوچھے گی۔ ”صاحب جی! یہ جو آپ نے اغوا دلی بات بتائی ہے۔ یہ کب کی ہے۔۔۔۔۔“

میں نے کہا۔ ”پچھلے مہینے سترہ اٹھارہ تاریخ کی۔“
وہ بولی۔ ”مجھے انگریجی مہینے کا تو پتہ نہیں جی۔۔۔۔۔ چاند کی وہ پندرہ تاریخ تھی، مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ اُس رات بڑی دیر تک کارخانے کے اندر سے چیخوں کی آوازیں آتی رہی تھیں۔ آپ نے دیکھا ہی ہے ہمارے جھوپڑے کارخانے کی دیوار کے بالکل ساتھ ہیں اندر کی ساری آوازیں باہر آتی رہی تھیں۔ ہمارا خیال ہے اُس رات بڑے بابو اندر کسی کو مار رہے تھے۔ وہ جو جرور سے روتا تھا اور ”ہائے ہائے“ کرتا تھا۔ بڑا ڈر لگتا تھا اُس کی آواز سن کر۔“

لڑکی کا بیان بڑا اہم تھا۔ میں نے حساب لگایا وہ چاند کی جوتاریخ بتا رہی تھی اُس کے مطابق عین سترہ مارچ کی رات آتی تھی۔ ایک طرح سے اب بات واضح ہوتی جا رہی تھی۔ 16 تاریخ کی شام مسٹر الفریڈ کی کوٹھی پر ہنگامہ ہوا تھا اور چوکیدار محمد حسین نے ہنگامہ کرنے والے نوجوان کا جو حلیہ بتایا تھا وہ سو فیصد گلزار کا تھا۔ اگلے روز دس بجے یہی گلزار اپنے رقیب پر تھی پال کی سُرخ گاڑی میں بیٹھ کر کسی نامعلوم مقام کی طرف چلا گیا۔ یہ سترہ تاریخ تھی۔ سترہ اور اٹھارہ تاریخ کی درمیانی شب کو پر تھی پال کی زیر تعمیر فیکٹری سے چیخوں کی آوازیں باہر تک سنی گئیں..... اس کے بعد کیا ہوا؟ یہ ابھی اندھیرے میں تھا۔ مجھے اسی اندھیرے کا پردہ چاک کرنا تھا۔

میں نے حسد نای اس لڑکی کو حفاظت کی ضمانت دی اور پوری طرح اعتماد میں لینے کے بعد کہا کہ وہ آج رات کسی طرح فیکٹری کے اندر جانے میں میری مدد کرے۔ وہ بہت ڈری ہوئی تھی پہلے تو اُس نے انکار کیا لیکن پھر یہ بات اُس کے دماغ میں آگئی کہ میری بات مان کر وہ پولیس کی مدد کرے گی اور بڑا باپو کتنا بھی زور آور ہے پولیس سے زور آور تو نہیں ہو سکتا۔

اُس نے بتایا کہ فیکٹری کے اندر شمالی دیوار کے ساتھ بڑے بابو نے ایک چھوٹا سا مکان بنا رکھا ہے۔ اس میں تین چار کمروں کے علاوہ کام کرنے کا دفتر، غسل خانہ اور باورچی خانہ وغیرہ بھی ہے۔ اس مکان کا ایک چھوٹا سا دروازہ فیکٹری سے باہر کھیتوں میں کھلتا ہے۔ حسد نے بتایا کہ اس دروازے میں اندر کی طرف اکثر تالا پڑا رہتا ہے لیکن کبھی کبھی تالا نہیں بھی ہوتا۔ وہ بولی۔ ”صاحب جی! اگر مجھے اُس طرف آنے کا موقع مل گیا اور دروازے پر تالا نہ ہوا تو میں اندر کی کنڈی گرا دوں گی۔ آپ دروازہ کھیل کر اندر چلے آنا۔“

..... اور اُس کمزور سی لڑکی نے یہ مشکل کام کر دکھایا۔ اُس کے فیکٹری میں چلے جانے کے ایک گھنٹے بعد میں نے اپنی جگہ سے حرکت کی اور فیکٹری کی بلند و بالا دیوار کے ساتھ چلتا ہوا شمالی رخ پر اُس چھوٹے سے آہنی دروازے کے سامنے پہنچ گیا جو اپنے گیرواں رنگ کی وجہ سے دیوار کا ہی حصہ نظر آ رہا تھا۔ قمیص تھپتھپ کر میں نے ریوالور کی موجودگی کا یقین کیا اور پھر بے آہستگی دروازے کو دھکیلا۔ وہ بڑی روانی کے ساتھ بے آواز کھلتا چلا گیا۔ میں نے اندر قدم رکھا اور اس کے ساتھ ہی مجھے احساس ہوا کہ میں نرم قالین پر کھڑا ہوں اور جس کمرے میں کھڑا ہوں وہ ایک دفتر ہے۔ میں نے دفتر کے اندرونی دروازے کو دھکیلا اور اُسے کھول کر ایک برآمدے میں آ گیا۔ اس برآمدے کے سامنے فیکٹری کا وسیع و عریض احاطہ نظر آ رہا تھا۔ یہ قریباً چار پانچ ایکڑ جگہ تھی۔ ہر طرف تعمیر کا سامان بکھرا ہوا تھا۔ کچھ حصے تعمیر ہو چکے تھے، کچھ

اور بے تھے اور کچھ ابھی شروع ہی ہوئے تھے۔ برآمدے کے عین سامنے مجھے تین گاڑیاں نظر آئیں۔ ایک بیوی جیپ تھی اور دو کاریں تھیں۔ ان میں سے ایک سُرخ رنگ کی کار میں جنم پال کے ڈپوس روڈ والے دفتر میں پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ یہ پر تھی پال کی پسندیدہ کار تھی۔ میں کچھ دیر برآمدے میں کھڑا اس گن لیتا رہا۔ مکان کے کسی اندرونی کمرے سے ہنسنے بولنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ یقیناً یہ پر تھی پال اور اُس کے دوست تھے۔ میں بڑی احتیاط سے چٹا ہوا ایک لمبوترے سے کمرے سے گزرا اور ایک ایسی کھڑکی کے سامنے پہنچ گیا جہاں سے روشنی چھن چھن کر باہر نکل رہی تھی۔ میں نے کھڑکی کی ایک درز سے کمرے میں جھانکا۔ یہ کمرہ خالی تھا۔ محفل ساتھ والے کمرے میں جبی ہوئی تھی۔ پھر میرے دیکھنے ہی دیکھنے پر خالی کمرے میں حسد داخل ہوئی۔ وہ ننگے پاؤں تھی۔ سر سے اوڑھنی غائب تھی۔ الماری کے پاس رک کر اُس نے بوتل سے چار گلاسوں میں دہسکی انڈینی شروع کی۔ روشنی میں میں نے اُسے غور سے دیکھا۔ سانولی ہونے کے باوجود خاصی پُرکشش تھی۔ اُس کا جسم گداز تو نہیں تھا لیکن دبلے پن میں بھی ایک نزاکت تھی۔ یقیناً پر تھی پال وغیرہ کے ہتھے چڑھنے سے پہلے وہ اس سے زیادہ پُرکشش رہی ہوگی۔ میں نے کھڑکی سے نگاہیں ہٹا کر ایک دوسری کھڑکی میں جھانکا۔ یہاں تاریکی کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ محتاط انداز میں میں نے سارا مکان دیکھ لیا مگر ذرا تک روم کے علاوہ اور کہیں زندگی کے آثار نظر نہیں آئے۔ مجھے گلزار کی تلاش تھی اور اگر وہ زندہ تھا تو عین ممکن تھا کہ اس وقت فیکٹری کی چار دیواری میں کہیں موجود ہو۔

مکان سے باہر نکل کر میں نے ایک خاموش سائے کی طرح فیکٹری کے طول و عرض میں گھومنا شروع کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ رہائشی مکان اور ایک زیر تعمیر گودام کے سوا مجھے فیکٹری میں کوئی ایسی جگہ نظر نہیں آئی جہاں کسی شخص کو چھپایا جاسکے اور وہ دونوں جگہیں خالی تھیں۔ میں گھومتا ہوا سُرخ کار کی طرف آ گیا۔ دفعتاً مجھے اندازہ ہوا کہ کار کا ایک دروازہ لاک نہیں ہے۔ میں نے مڑ کر دیکھا فیکٹری کا مین گیٹ قریباً دو سو فٹ کی دوری پر تھا۔ لازمی بات تھی کہ اب اس ناکل بردار چوکیدار موجود تھا مگر وہ مجھے نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں نے آہستگی سے دروازہ کھولا اور گاڑی کے اندر گھس گیا۔ مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں تھا کہ گاڑی کے ڈیش بورڈ کے سامنے ”عجب سا پستول“ دیکھوں جس کا ذکر حسد نے کیا تھا۔ ڈیش بورڈ بغیر تالے کے تھا۔ میں نے اُسے کھولا تو فلائین کے کپڑے میں لپٹا ہوا پستول مجھے نظر آ گیا اور اس کے ساتھ ہی ایک بڑے چل گیا کہ حسد نے اُسے عجیب کیوں کہا تھا۔ اس پستول کے آگے کوئی آٹھ انچ لمبا ہینڈل لگا ہوا تھا۔ پستول اور سائیلنسر دونوں امپورٹڈ تھے اور اُن کی قیمت موجودہ حساب سے

بجے تک اور غالباً اس کے بعد بھی پرتھی پال فلیٹز ہوٹل میں تھا..... اب سوچنے کی بات یہ تھی کہ جس رات کالا شاہ کا کوکی فیکٹری میں ایک نامعلوم شخص پر تشدد کرنے والا کون تھا اور کیوں تشدد کر رہا تھا۔ میرا دھیان رہ رہ کر اس تحریر کی ابتدائی سطروں کی طرف جا رہا تھا اور مجھے احساس ہو رہا تھا کہ ان سطروں میں ایک اہم نکتہ چھپا ہوا ہے۔ پرتھی پال نے لکھا تھا کہ وہ پورچ میں بیٹھ کر پتہ چلا کہ گاڑی سونا لے گئی ہے..... یہ کوئی دس بجے کا مکمل تھا۔ اور یہی وقت تھا جب رزل کے چوکیدار محمد حسین نے سرنخ گاڑی کو گیٹ سے نکلنے اور آگے جا کر اُس میں گلزار کو مارہوتے دیکھا۔ میں پرتھی پال کی سرنخ گاڑی کو اچھی طرح دیکھ چکا تھا۔ اُس کی پچھلی کھڑکیوں اور بیک اسکرین پر پردے پڑے ہوئے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ چوکیدار محمد حسین نے جب اپنے کیمین سے اس گاڑی کو دیکھا ہوگا تو اُسے ٹھیک سے پتہ نہیں چل سکا ہوگا کہ گاڑی کون چلا رہا ہے لیکن چونکہ یہ پرتھی پال کی گاڑی تھی اور وہ اسی پر یہاں پہنچا تھا لہذا محمد حسین نے تصور کیا کہ گاڑی پرتھی چلا رہا ہے۔

اب اس ڈائری کی تحریر بتا رہی تھی کہ گاڑی پرتھی پال نہیں وہ سونا نامی لڑکی چلا رہی تھی۔ سونا نامی یہ لڑکی کون تھی اور پرتھی پال سے اُس کا کیا رشتہ تھا؟ اس بارے میں ڈائری کچھ نہیں بتاتی تھی۔ میں نے ڈائری کی اچھی طرح ورق گردانی کی۔ پچھلے ڈھائی مہینوں کی روداد میں میں چار جگہ اس سونا نام کی لڑکی کا ذکر آیا تھا لیکن اس ”ذکر“ کے حدود اربعے پر کوئی روشنی نہیں پڑتی تھی۔

میں اپنی سوچوں میں گم بیٹھا تھا۔ یہ انسپکٹر ناتھ سنگھ کا کمرہ تھا۔ وہ کسی تفتیش پر گیا ہوا تھا۔ اس کا سنتری دروازے پر چوکس کھڑا تھا۔ دفعتاً مجھے محسوس ہوا کہ سنتری کسی عورت سے باتیں کر رہا ہے۔ چند لمحے بعد سنتری نے اندر آ کر کھٹاک سے سیلوٹ کیا اور مجھے اطلاع دی کہ ”میں صاحبہ مجھ سے ملنا چاہتی ہیں۔“ میم صاحبہ کا نام سن کر میری رگوں میں سنسنیٹ دوڑ گئی۔ دھیان سیدھا جین عرف جینی کی طرف گیا۔ میرا اندازہ درست نکلا۔ وہ جینی ہی تھی۔ سنتری نے جتن اٹھائی تو وہ جھک کر اندر آ گئی۔ میں اُسے پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ آج وہ پہلے سے زیادہ خوبصورت اور ماڈرن نظر آ رہی تھی۔ اُس نے پتلون کے اوپر ایک پتلی سی بنیان میں مٹی کی تھی۔ اس ”بے چاری بنیان“ سے میم صاحبہ کا جو بن سنبھالے نہیں سنبھلتا تھا۔ حد یہ تھی کہ وہ اپنا گھر کے سائز کا کتا بھی ساتھ ہی لیتی چلی آئی تھی۔ یہ بلڈاگ بڑی خونخوار نظروں سے اڑھانے والی چیزوں کو گھور رہا تھا۔ ظاہر ہے میں اور سنتری بھی ”ان چیزوں“ میں شامل تھے۔ اچھی طرح اطمینان سے بیٹھنے کے بعد جینی نے گفتگو کا آغاز کیا۔ وہ ٹوٹے پھوٹے

چودہ پندرہ ہزار سے کم نہیں تھی۔ میں ڈیش بورڈ بند کر کے گاڑی سے نکلنا ہی چاہتا تھا۔ شے پر میری نگاہ پڑی اور میں ٹھنک سا گیا۔ یہ ایک سیاہ ڈائری تھی جس کا ایک کونڈ ڈش کے نیچے خانے سے جھانک رہا تھا۔ بوسیدہ سی جلد تھی۔ میں نے چاند کی روشنی میں اس ورق گردانی کی تو انکشاف ہوا کہ یہ سچ مچ کی ڈائری ہے۔ یعنی ہر صفحے پر تاریخ اور روزنامہ مصروفیات لکھی ہوئی تھیں۔ تحریر انگریزی میں تھی اور کافی شکستہ تھی تاہم اچھی روشنی میں جاسکتی تھی۔ اس گاڑی میں اس سے قیمتی شے میرے لیے بھلا کیا ہو سکتی تھی۔ میں نے اپنے لباس میں رکھ لی اور گاڑی سے باہر نکل آیا..... تھوڑی ہی دیر بعد میں دوبارہ فیکٹری آفس میں کھڑا تھا۔ میں نے بیرونی دروازہ کھولا اور جس خاموشی سے آیا تھا اسی خاموشی سے باہر نکل آیا۔

☆=====☆=====☆

ڈائری میرے سامنے میز پر پڑی تھی اور میں سر پکڑے بیٹھا تھا۔ اس ڈائری نے میری تفتیش کو آگے بڑھانے کی بجائے فل اسٹاپ لگا دیا تھا۔ میں نے اس ڈائری کو کوئی جگہ پڑھا تھا خاص طور پر سترہ مارچ والا صفحہ میرے زیر مطالعہ رہا تھا۔ مارچ کی دوسری تاریخوں کی طرح اس تاریخ میں بھی پرتھی پال نے ایک مصروف دن گزارا تھا۔ صبح دس بجے سے رات بجے تک کی مصروفیات لکھی ہوئی تھیں۔ اس ڈائری میں پرتھی پال نے جو کچھ بھی لکھا تھا وہ احتیاط سے لکھا تھا۔ کم از کم اس ڈائری کی وجہ سے اُس پر کوئی حرف نہیں آ سکتا تھا اور نہ سترہ تاریخ کی مصروفیات تو ویسے بھی سیدھی سادی تھیں۔ اُس نے لکھا تھا۔ ”رات پال سے ختم ہوئی تھی۔ اس لیے دیر سے سویا اور دیر سے اٹھا۔ سر بہت بھاری تھا۔ سو جاگھڑ نہاتا ہوں لیکن باہر پورچ میں آیا تو پتہ چلا کہ گاڑی سونا لے کر گئی ہے۔ سونا ایسی ہی حرکت کرتی ہے۔ وہ ساڑھے گیارہ بجے کے قریب واپس آئی۔ میں اُس وقت تک نہا جا رہا تھا۔ کرچکا تھا۔ پھر بھی اپنے شیڈول سے آدھا گھنٹہ لیٹ تھا۔ پہلی کی بجائے دوسری فلائٹ پنڈی جانا پڑا۔ وہاں میٹنگ بھی کافی دیر تک چلی یوں رات گیارہ بجے سے پہلے ہو سکی۔ کالا شاہ کا کو جانے کا تو اب سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ فلیٹز میں ڈنر کیا وہاں رائے سے ملاقات ہوگئی۔ اُن کی خوبصورت وائف بھی ساتھ تھی۔ ڈاکٹر رائے اپنے والے پلاٹ کا ذکر لے بیٹھے۔ اُن کا خیال ہے.....“ اس سے آگے پلاٹ کے متعلق طویل ذکر تھا جس کا اس کہانی سے تعلق نہیں۔

یہ تحریر دیکھنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ سترہ اور اٹھارہ مارچ کی درمیانی شب

فون ہے اور وہ اُس کے متعلق پوچھ رہا ہے۔ وہ اشاروں سے مجھے منع کرنے لگی کہ میں اُسے سمجھ نہ بتاؤں۔ میں نے پرتھی پال سے کہہ دیا کہ نہیں، یہاں کوئی نہیں آیا۔ پرتھی پال نے فون بند کر دیا۔

پرتھی پال سے گفتگو کر کے میرے ذہن میں آندھیاں سی چلنے لگیں۔ چند لمحوں کے اندر اندر ”گلزار“ کی ابھی ہوئی گتھی سلجھ گئی تھی۔ دراصل اس گفتگو کے دوران پرتھی پال کے ہونٹوں سے ایک ایسا لفظ ادا ہوا تھا جس نے اس کیس کے سارے انجربنجر ڈھیلے کر کے مجرم کو چاروں شانے چت کر دیا تھا۔

میں نے اطمینان سے سگریٹ سلگایا اور جینی سے کہا۔ ”مس جین! آپ اطمینان سے گھر جائیں۔ میرا خیال ہے میں آج شام تک اس معے کو حل کر لوں گا۔ بلکہ ہو سکتا ہے میں جب شام کو آپ کے پاس آؤں تو گلزار بھی برآمد ہو چکا ہو۔“

”اوگاڈ!“ وہ حیرانی سے بولی۔ ”اتنی جلدی؟..... یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“

”یہ ایسے ہی ہوگا۔“ میں نے اسے یقین دلایا پھر گھڑی دیکھتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

”دیری ساری..... مجھے ذرا جلدی نکلتا ہے۔“ اُس نے کتے کی زنجیر کھینچ کر اُسے جلدی سے میرے راستے سے ہٹالیا۔ میں لمبے ڈگ بھرتا ہوا باہر صحن میں آ گیا۔ جینی میرے پیچھے ہی نکل آئی۔

☆=====☆=====☆

شام آٹھ بجے میں مسٹر الفریڈ کی کونٹھی میں اُن کے شاہانہ ڈرائنگ روم میں بیٹھا تھا۔ یوں لگتا تھا کونٹریہ دور کے کسی محل میں آ گیا ہوں۔ مسٹر الفریڈ خود گھر میں نہیں تھے۔ اُن کی شوخ و شنگ بیٹی بڑی ادا سے میرے سامنے بیٹھی تھی۔

”ہاں کیا رپورٹ ہے مسٹر انسپٹر۔ کچھ اتہ پتہ چلا؟“

”میں نے آپ سے جو وعدہ کیا تھا، وہ پورا کیا ہے۔“

”ادامائی گاڈ۔“ جینی نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھا۔ ”کہاں ہے گول زار۔ ہم اُس کے بارے میں بڑاوری ہے۔ بڑا بے قرار تھا ہم۔ کہاں ہے گول زار۔ کس نے اغوا کیا تھا اُس کو۔“

میں سگریٹ کا کش لے کر اطمینان سے کہا۔ ”تم نے مس جین..... تم نے اغوا کیا تھا اُسے اور پھر کالا شاہ کا کوئی فیکٹری میں اُس پر تشدد کر کے ختم کر ڈالا۔“

وہ حیرت سے منہ پھاڑے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ ”کک..... کیا کہتا ہے انسپٹر.....“

لفظوں میں اردو بولتی تھی۔ کہنے لگی۔ ”انسپکٹر نواز خان! ہم نے تم کو ڈلہوزی میں دیکھا تھا۔ یہاں دیکھا تو بڑا خوش ہوا۔ ہم کو مالوم ہوا ہے کہ تم گول زار (گلزار) کا انوسٹیگیشن کے لیے ادھر آیا۔ گاڈ جانتا ہے ہم کو اُس کے لاپتہ ہونے کا بڑا دکھ ہے۔ وہ گڈ مین تو اچھا آدمی تھا۔ ہم کو مالوم ہوتا کہ وہ ہم سے ملنے آیا ہے تو ہم خود اُس کو اپنے پاس بلاتا ہوں۔ پاگل وایج مین سے جھگڑا کرتا رہا۔ پھر مالوم نہیں کدھر چلا گیا۔“

میں نے کہا۔ ”مس جین! وہ گیا نہیں اُسے لے جایا گیا ہے اور لے جانے والی کار کے منگیتر محترم پرتھی پال صاحب کی ہے۔“

”یہ تم کو کس نے بتایا؟“ اُس نے ماتھے پر شکنیں ڈال کر پوچھا۔

میں نے چوکیدار محمد حسین کا نام ظاہر کیے بغیر جینی کو بتایا کہ سترہ مارچ کی صبح کوئی نکلنے والی سُرُخ کار کو گلزار نے ہاتھ دے کر روکا تھا اور کار چلانے والا اُسے اپنے ساتھ کر کے لے گیا تھا۔ اس کے بعد سے گلزار کا کچھ پتہ نہیں۔

وہ بولی۔ ”سُرُخ کار تو پرتھی کا ہی ہے لیکن ہم کو یقین نہیں آ رہا کہ وہ ایسا کرے ہاں..... وہ کہیں نشے میں نہ ہو۔ نشے میں اُس کو کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ تم نے اس بارے اُس سے بات کیا؟“

میں نے کہا۔ ”بات کی ہے لیکن وہ ایسا بھلا مانس کہاں ہے کہ آسانی سے بتا دے۔ جینی کے چہرے پر اب سوچ کی گہری پرچھائیاں تھیں۔ یہ وہ سیلانی لڑکی نظر نہیں تھی جو راہ چلتے مردوں کو پکڑ کر ”پرستان“ کی سیر کر دیتی تھی۔ وہ دبے لہجے میں:

”انسپٹر! ہم مانتا ہے کہ پرتھی ہمارا منگیتر ہے مگر ہم انصاف کا گلا کاٹنا نہیں مانگتا۔ ہم چاہتے ہیں کہ جو بھی سچ ہے وہ سامنے آئے۔ ہم تم سے درخواست کرتا ہے کہ تم اس کیس کو ابھی دیکھو.....“

جینی کی باتوں سے یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ جیسے وہ خود بھی پرتھی پال کے متعلق شے میں ہوئی ہے اور سمجھتی ہے کہ گلزار کے غائب ہونے میں پرتھی یا اُس کے کسی ساتھی کا ہاتھ ہے۔ کتنے گھٹیا کردار کے لوگ تھے یہ اور کتنے کمزور تھے ان کے رشتے۔ وہ ایک دوسرے دھوکہ دے رہے تھے اور ساتھ ساتھ اس خیال سے بھی ڈر رہے تھے کہ اُن سے دھوکہ جینی سے میری باتوں کے دوران ہی ٹیلی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ میں نے ریسپونڈ کیا تو وہ جانب سے ایک جانی پہچانی آواز آئی۔ یہ پرتھی پال تھا۔ وہ مجھے انسپکٹر نا تھا کچھ سمجھ پوچھ رہا تھا کہ جینی ادھر پولیس سٹیشن تو نہیں آئی۔ جینی نے فوراً اندازہ لگا لیا کہ یہ پرتھی

تمہارا برین تو خراب نہیں ہو گیا۔“

”میرا دماغ خراب نہیں ہے مس جین..... اور ابھی تمہارا دماغ بھی ٹھکانے پر آجائے گا۔“ میں نے سب انپکٹر کو آواز دی۔ وہ ڈرائنگ روم سے باہر بیٹھا تھا۔ اندر آ کر اُس نے سیلوٹ کیا۔ میں نے کہا ”جاؤ..... گاڑی سے چوکیدار کو لے آؤ۔“

وہ میرے کہنے سے پہلے ہی چوکیدار کو اندر لا چکا تھا۔ دروازہ کھول کر اُس نے چوکیدار کو ڈرائنگ روم میں داخل کر دیا۔ یہ کالا شاہ کا کووالی زیر تعمیر فیکٹری کا چوکیدار تھا۔ اس کا نام لیکر سنگھ تھا۔ تھانے میں لیکر سنگھ کے سارے کس بل نکل چکے تھے۔ اُس کے نچلے ہونٹ سے خون رس رہا تھا اور پیشانی پر بڑا سا گومڑا ہوا تھا۔

میں نے کہا۔ ”ہاں لیکر سنگھ۔ سترہ اور اٹھارہ تاریخ کی درمیانی شب رات نوبت بجے کیا ہوا تھا؟“

لیکر سنگھ گلوگیر آواز میں بولا۔ ”میم صاحبہ اپنی گاڑی میں ایک شخص کو لے کر آئی تھیں۔ ان کے ساتھ پریمیابی بھی تھیں۔ میں اُس وقت نشے میں تھا۔ انہوں نے پہلے مجھے جھاڑیں پلائیں پھر پوچھا کہ پرچی پال صاحب کہاں ہیں۔ میں نے کہا انہوں نے آنا تو تھا لیکن آئے نہیں سنا ہے پنڈی گئے ہوئے ہیں۔ میم صاحبہ غصے میں بڑبڑانے لگیں۔ پھر انہوں نے گیٹ کھلوا دیا اور گاڑی اندر لے گئیں۔ میں گیٹ پر بیٹھا رہا اور وہ گاڑی میں ساتھ آنے والے بندے کو لے کر مکان میں چلی گئیں۔ میرے اوپر نشہ زور مار رہا تھا۔ چار پائی پر بیٹھے بیٹھے میں پھر سو گیا۔ گہری نیند میں مجھے کبھی کبھی چیخوں کی آوازیں آتی رہیں۔ ان آوازوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ میم صاحبہ اُس شخص کی دھناتی کر رہی ہیں۔ ایسی مار پیٹ اس فیکٹری میں کوئی نئی بات نہیں تھی۔ کئی دفعہ ایسا ہوا تھا کہ پرچی پال صاحب کسی بندے کو پکڑ کر یہاں لے آئے اور اس کی خوب مرمت بنائی۔“

اُن کا ایک پارٹی سے کاروباری جھگڑا چل رہا ہے اور اس جھگڑے میں کئی بار مار پیٹ تک نوبت آ چکی ہے۔ میں نے سمجھا شاید یہ بھی کوئی ایسا ہی معاملہ ہے۔ پتہ نہیں کیا وقت تھا جب میم صاحبہ اور ان کی سہیلی گاڑی لے کر واپس چلی گئیں۔ جس شخص کو مارا پینا گیا تھا وہ مجھے گاڑی میں نظر نہیں آیا۔ ہو سکتا ہے وہ میم صاحبہ کے جانے سے پہلے ہی فیکٹری سے نکل گیا ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ پچھلی سیٹ پر لمبا پڑا ہوا اور مجھے نظر نہ آیا ہو۔“

اس بیان کے بعد جینی سکتے کی حالت میں بیٹھی رہی۔ اُس کا رنگ ہمیشہ سے زیادہ سفید نظر آ رہا تھا۔ چند منٹ پہلے اُس کی آنکھوں میں ناچنے والی تمام تیزی طراری رخصت ہو چکی

تھی۔ میں نے کہا۔ ”مس جین! اب تم سوچو گی کہ میں تم تک کیسے پہنچ گیا..... دراصل مجھے معلوم تھا کہ سترہ تاریخ کی صبح گلزار جس گاڑی میں بیٹھ کر گیا تھا وہ پرچی پال کی ضرورت تھی مگر اُسے پرچی پال نہیں چلا رہا تھا۔ اُسے ”سونا“ نام کی کوئی لڑکی یا عورت چلا رہی تھی۔ اب مجھے معلوم نہیں تھا کہ سونا نامی یہ لڑکی یا عورت کون ہے۔ اس سے پہلے کہ میں اس بارے میں معلومات حاصل کرتا تم تھانے پہنچ گئیں اور مجھ سے کیس کے بارے میں بات چیت کرنے لگیں۔“

تمہیں یاد ہو گا صبح ہونے والی اس بات چیت کے دوران ہی پرچی پال کا فون آیا تھا اور یون سننے کے فوراً بعد میں نے تمہارے سامنے دعویٰ کیا تھا کہ شام تک میں یہ معرہ حل کر لوں گا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مجھے ”سونا“ کا پتہ چل گیا تھا۔ سونا تمہارا ہی ”نمک نیم“ ہے اور یہ ”نمک نیم“ پرچی پال نے رکھا ہوا ہے۔ وہ بے تکلفی سے تمہیں ”سونا“ کہتا اور لکھتا ہے۔ میرا خیال ہے اب پوری بات تمہاری سمجھ میں آگئی ہو گی۔“

جینی نے ہونٹوں پر زبان پھیر کر ایک بہت گہری سانس لی اور بولی۔ ”تم جو کچھ کہہ رہا ہے اس کا قیامت تم کو بہت زیادہ ادا کرنا پڑے گا۔ وائچ مین (چوکیدار) کے بیان سے یہ بات کیسے ثابت ہوتا ہے کہ ہم نے گلزار کو اغوا کیا یا مارا ہے؟“

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”اس میں اب شک شبے کی کوئی گنجائش ہی نہیں ہے مس جین شیلڈ..... تمہیں پتہ چل چکا تھا کہ گلزار رات کو کوٹھی پر آیا ہے اور اُس نے تمہارا نام لے کر بنگلہ کیا ہے۔ یہ صورت حال تمہارے لیے کسی طرح بھی خوشگوار نہیں تھی۔ اتفاقاً اگلے روز صبح دل بجے ہی تمہیں اپنے بیوقوف عاشق سے سننے کا موقع مل گیا۔“

تمہیں اپنی ایک دوست کو سی آف کرنے ہوائی اڈے جانا تھا۔ تم شرارت کے طور پر اپنے منگیت پرچی کی گاڑی لے گئیں۔ اس واقعے کا ذکر پرچی نے اپنی ڈائری میں کیا ہے اور یہ ڈائری اس وقت بھی میرے پاس موجود ہے۔ تم گاڑی لے کر گیٹ سے باہر نکلیں تو گلزار نے آگے بڑھ کر تمہارا راستہ روک لیا اور تم سے باتیں کرنے لگا۔ وہ تمہارے عشق میں نیم دیوانہ ہو رہا تھا اُسے پتہ نہیں تھا کہ وہ کس پتھر سے سر پھوڑ رہا ہے، تم ایک ایسی عورت ہو جو مرد کے سینے پر اپنا حسین پاؤں رکھ کر گزرتی ہے اور پھر کبھی مڑ کر نہیں دیکھتی۔ تمہیں گلزار کے والہانہ بننے سے زبردست خطرہ محسوس ہوا۔ اُس کی بے وقوفی اور ہٹ دھرمی کی سزا دینے کے لیے تم نے اُسے گاڑی میں بٹھایا اور اپنی سہیلی پر میا کے فلیٹ میں لے گئیں۔ تم نے اُسے شام تک وہاں رکھا۔ شام کو پر میا اور تم نے اُسے گاڑی میں بٹھایا اور کالا شاہ کا کووالی فیکٹری جا

پہنچیں..... وہاں تم دونوں نے مل کر پہلے اُسے غلامانہ تشدد کا نظانہ بنایا اور پھر مار کر زمین پر گاڑ دیا۔“

جینی نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھاما اور چیخ پڑی۔ ”نہیں..... نہیں..... یو آر رائگ..... یہ بالکل غلط ہے۔ ہم نے ایسا کچھ نہیں کیا..... کچھ بھی نہیں کیا۔ تم یہاں سے چ جاؤ..... آئی سے گیٹ آؤٹ۔“ اُس پر جیسے اچانک ہی ہسٹریا کا دورہ پڑ گیا تھا۔ چہرہ اچانک بازوؤں میں چھپا کر وہ ہچکیوں سے روئے لگی۔

میں نے کہا۔ ”مس جین! تمہارے ماننے یا نہ ماننے سے اب کوئی فرق نہیں پڑتا۔ نے جرم کیا ہے اور یہ جرم عدالت میں ثابت ہو کر رہے گا..... میں تمہیں اقبال جرم کا ایک موقع دے رہا ہوں۔ سارے معاملے پر ٹھنڈے دل سے غور کرو اور فیصلہ کرو کہ تمہیں اپنا جرم چھپانا چاہیے یا نہیں..... خدا حافظ۔“ اس کے ساتھ ہی میں چوکیدار کیکر سنگھ کو لے کر ڈرائنگ روم سے باہر آ گیا۔

☆=====☆=====☆

منظر تھانے کا تھا۔ میں انسپکٹر ناتھ سنگھ کے ساتھ اُسی کے کمرے میں بیٹھا تھا۔ ناتھ سنگھ نے اپنی بھوری ڈاڑھی کو کھجاتے ہوئے کہا۔ ”کیا واقعی مس جین گلزار کو ٹھکانے لگا چکی ہے؟“ میں نے سگریٹ کا گہرا کش لیتے ہوئے کہا۔ ”یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ صرذ ایک بات یقین سے کہی جاسکتی ہے کہ سترہ مارچ کی صبح گلزار جس کے ساتھ گاڑی میں سو ہو کر گیا تھا وہ مس جین تھی۔ اب وہ اُسے کہاں لے کر گئی۔ اُس کا کیا کیا اور اب وہ کہاں ہے یہ سب کچھ فی الحال تاریکی میں ہے۔“

ناتھ سنگھ بولا۔ ”لیکن تم نے تو بڑے دعوے کے ساتھ جین پر قتل کا الزام لگا دیا ہے۔“ ”صرف اُسے بھڑکانے کے لیے..... تاکہ وہ سچ بول دے۔ میں نے.....“ ابھی میری بات منہ ہی میں تھی کہ سنتری نے اندر آ کر کھٹاک سے سیلوٹ کیا اور اطلاع دی کہ میم صاحب مجھ سے ملنا چاہتی ہیں۔ چند لمحے بعد مس جین اندر آئی۔ آج خوفناک صورت والا بلڈاگ کتا اُس کے ساتھ نہیں تھا۔ وہ خود بھی بڑی خاموش اور آرزو سے دکھائی دے رہی تھی۔ گردن جھکا کر میرے سامنے کرسی پر بیٹھ گئی۔ میں نے معنی خیز انداز میں ناتھ سنگھ کو جانے کا اشارہ کیا۔ ناتھ سنگھ چلا گیا تو وہ گلوگیر آواز میں بولی۔ ”ہم تم سے اکیلے میں بات کرنا مانتا۔“

میں نے کہا۔ ”تم جو کچھ کہنا چاہو، یہاں پوری تسلی سے کہہ سکتی ہو۔“

اُس نے اپنا خوبصورت رومال ناک پر رکھ کر سوسوں کی آواز نکالی اور بولی۔ ”انسپکٹر صاحب! تم ٹھیک کہتا ہے سترہ تاریخ کو گلزار ہمارے ساتھ گاڑی میں بیٹھ کر گیا تھا لیکن گاڑ جانتا ہے ہم نے اُس کو کوئی تکلیف نہیں دیا۔ اُس کو انگلی تک نہیں لگایا۔ وہ..... وہ اس وقت زندہ سلامت ہمارے پاس موجود ہے..... ہمارا مہمان ہے وہ۔“

گلزار کے زندہ ہونے کی اطلاع میرے لیے خوش کن تھی۔ اُس کی بوڑھی والدہ اور بہنوں کے چہرے میری نگاہوں میں گھوم گئے..... اور یہ امید پیدا ہو گئی کہ میں ڈلبوزی واپس جا کر اُن کے سامنے سرخرو ہو سکوں گا۔ میں نے مس جین سے پوچھا کہ وہ کہاں ہے؟ وہ بولی۔ ”پریم کا فلیٹ میں ہی ہے۔ پریم نے ایک کمرہ اس کو دے رکھا ہے اور وہاں وہ بڑے سکون سے رہ رہا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”اگر میں تمہاری بات مان لوں تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ تم نے اُسے یوں منظر سے غائب کیوں کیا؟“

میرے اس سوال پر جینی کی حسین آنکھوں میں ایک دم آنسو اُمڈ آئے۔ وہ روتے ہوئے بولی۔ ”اس لیے کہ ہم اُس سے سچ سچ محبت کرنے لگا تھا..... ہم بہت برا گرل ہے انسپکٹر ہم مرد کو کھلونا سمجھتا تھا۔ کسی اجنبی مرد کے ساتھ وقت گزارتا تھا۔ اُسے سر پرانز دیتا تھا اور حیران و پریشان چھوڑ کر آگے بڑھ جاتا تھا۔ پھر گاڑی نے ہمیں ہمارے کیے کا سزا دیا۔ ہمیں ایک ایسا مرد ملا جس نے الٹا ہم کو سر پرانز دیا اور ہمیں حیران و پریشان کر دیا۔ وہ مرد گول زار (گلزار) ہے انسپکٹر۔ آج ہم تم کو سب کچھ سچ بتائیں گے۔ گلزار ایک معمولی شخص تھا۔ مگر معلوم نہیں اُس میں کیا بات تھی ہم ایک بار اُسے مل کر پھر بھول نہ سکا۔ دن رات اُس کا خوبصورت فیس ہماری نگاہوں میں رہا۔“

ڈلبوزی سے واپس آ کر ہم دن رات اُس سے ملنے کو ترستار رہا اور ساتھ ساتھ اپنے دل کو سمجھاتا رہا کہ وہ یہ نادانی نہ کرے..... ہم جانتا تھا کہ پرچی پال جیسا کروڑپتی شخص ہم سے شادی بنانا چاہتا ہے اور نہ شادی ضرور ہونی ہے..... پھر ہم کیوں ایک فلیش لڑکی کی طرح سوچ رہا ہے۔ ہم اپنے دل کو سمجھانے کی بہتوش کر رہا اور اس میں بہت حد تک کامیاب بھی ہو گیا۔

لیکن پھر ایک دن اچانک گلزار پھر ہمارے سامنے آن کھڑا ہوا۔ ہم کو مالوم ہوا کہ اُس نے ہماری خاطر کبھی کے گیٹ پر جھڑپایا ہے اور چوکیدار مہبات خان نے اُسے بری طرح مارا ہے اور ذلیل کر کے نکال دیا ہے۔ ہم گلزار کی مصیبت پر ٹپ اٹھا۔ ہم بہت وری تھا۔ ہم

وہ ہر صورت یہ دونوں چیزیں حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اپنے اس لالچ میں وہ کسی کی جان لے سکتا ہے اور اپنی جان دے بھی سکتا ہے۔ (یہی خوف تھا جس کے سبب مس جین نے گلزار کو موقع سے غائب کر دیا تھا اور بعد میں پرتھی پال سے جان چھڑانے کے لیے میری تفتیش کا رخ پرتھی کی طرف موڑنے کی کوشش کی تھی) میرے ساتھ اپنی بات چیت میں گلزار نے جو سب سے بڑا اور دھماکہ خیز انکشاف کیا وہ یہ تھا کہ مس جین اُس سے شادی کرنا چاہتی ہے۔

میں فوری طور پر اس بات پر یقین نہیں کر سکا۔ کوئی ہوش مند بھی نہیں کر سکتا تھا۔ کہاں ایکسٹراڈرن جین اور کہاں دس جماعتیں پاس گلزار۔ کوئی جوڑ کوئی جواز ہی نہیں تھا لیکن ایک بات میں بھول رہا تھا اور ہم سب بھول رہے تھے۔ یہ بات کسی عام لڑکی نے نہیں کہی تھی۔ مسٹرفریڈ کی بیٹی نے کہی تھی۔ وہ بیٹی جس نے آج تک جو کام کیا تھا عجیب کیا تھا۔ شاید اُس کی زندگی کا مقصد ہی دوسروں کو حیران اور ششدر کرنا تھا۔ وہ انوکھی تھی اور اُس کے ہر کام میں انوکھا پن تھا..... اور پھر ایک روز وہ اپنی زندگی کا سب سے انوکھا کام بھی کر گئی۔ وہ ”سبز پری“ جس کے لیے لکھ پتی نوجوانوں کے رشتے قطار باندھے کھڑے تھے اس نے ڈلبوزی کے ایک مقامی نوجوان سے کورٹ میرج کی اور اُسی کالج میں جا کر آباد ہو گئی جہاں سے اُس کی انوکھی محبت کا آغاز ہوا تھا۔

میں اُسی کالج کے پچھواڑے میں رہتا تھا اور گلزار کی شادی کے بعد بھی قریباً ایک سال رہا لیکن شادی کے بعد میں نے مس جین کو کبھی نہیں دیکھا۔ وہ سات پردوں میں رہتی تھی۔ اُس نے ماضی سے ہر ناٹھ توڑ لیا تھا۔ نہ کسی سے ملتی تھی نہ کوئی اُس سے ملنے آتا تھا۔ صرف مسٹرفریڈ کی ”چھ گز“ لمبی کار کبھی کبھی کالج کے دروازے پر کھڑی نظر آتی تھی۔ وہ بھی جس طرح خاموشی سے آتے تھے اُسی طرح خاموشی سے چلے جاتے تھے۔ مس جین نے اپنا مذہب تبدیل نہیں کیا تھا لیکن ذہنی طور پر وہ بالکل بدل چکی تھی اور گلزار بتاتا تھا کہ اتوار کو اپنی عبادت کرنے کی بجائے وہ نماز پڑھتی ہے۔ گلزار اُس سے بہت خوش تھا اور اُسے پختہ یقین تھا کہ ایک روز وہ اپنی رضا و رغبت سے کلمہ بھی پڑھ لے گی۔

مجھے ڈرتا تھا کہ کہیں گلزار کی یہ خوشیاں عارضی ثابت نہ ہوں..... یہ نہ ہو کہ امیر زادی کی آنکھوں سے وقتی محبت کی پٹی اُترے اور وہ چیخ مار کر اپنی دنیا میں لوٹ جائے۔ مگر میرے یہ تمام اندیشے اور اندازے الٹ ثابت ہوئے۔ گلزار نے والے وقت کے ساتھ جین خود کو نئے ماحول میں ڈھالتی چلی گئی۔

پہلے وہ گلزار کے گھر والوں سے علیحدہ رہنا چاہتی تھی پھر اُس نے انہیں بھی ڈلبوزی میں

کو پرتھی پال کی نیچر (خصلت) کا بھی معلوم تھا۔ ہم کو معلوم تھا وہ گلزار سے بہت بری طرح پیش آئے گا اور یہ بھی کوئی بڑا بات نہیں کہ اُس کا دماغ ٹھکانے لگاتے لگاتے اُسے جان سے ہی مار ڈالے۔ وہ بہت ہی سخت آدمی ہے۔ ہمارا فکر مندی بڑھتا جا رہا تھا، پھر گاڈ نے ہمارا مدد کیا۔ ہم صبح ایئر پورٹ جانے کے لیے پرتھی پال کی گاڑی لے کر نکلا تو تھوڑا آگے جا کر گلزار نے ہمارا راستہ روک لیا۔ ہم نے اُسے اپنے ساتھ سوار کیا اور پریمیا کے فلیٹ پر لے گئے۔ ہم نے اُسے فلیٹ میں ہی رکھا اور اب تک وہ وہیں ہے.....“

مس جین کی روداد حیران کن تھی۔ وہ عجیب و غریب لڑکی تھی اور اُس نے عجیب و غریب کام کیا تھا۔ شاید وہ ٹھیک کہہ رہی تھی کہ قدرت نے اُسے سزا دی ہے اور وہ ایک ایسے شخص کی محبت میں گرفتار ہو گئی ہے جس سے محبت کرنے کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔

میں نے اُس سے پوچھا۔ ”اگر تمہاری یہ ساری باتیں درست ہیں تو پھر چوکیدار کیکر سنگھ کا بیان کس خانے میں فٹ ہوتا ہے؟ کیا تم اُس رات کسی شخص کے ساتھ فیکٹری میں نہیں گئی تھیں؟“

وہ بولی۔ ”ہاں..... ہم گیا تھا لیکن ہمارے ساتھ اُس وقت گلزار نہیں چوکیدار مہابت خان تھا۔ وہی مہابت خان جس نے ایک روز پہلے گلزار کو مارا پیٹا تھا اور ذلیل کیا تھا۔ یہ بڑا بد بخت چوکیدار ہے۔ اس نے ڈلبوزی میں بھی ایک مزدور کو بہت مارا تھا اور اس کا کپڑا اٹھا کر اُس کا مرغانا دیا تھا۔ ہم کو اس بد بخت پر بہت غصہ تھا۔ ہم اور پریمیا اس کا گاڑی میں ڈال کر فیکٹری لے گیا۔ ہمارا ارادہ اُسے پرتھی پال کے حوالے کرنے کا تھا لیکن وہ فیکٹری میں نہیں تھا۔ ہم نے خود ہی مہابت خان کا مرمت کیا اور جب اُس کی حالت بہت برا ہو گیا تو اُسے ایک انڈرویئر میں فیکٹری سے بھاگ دیا..... ہم نے کسی کا مرڈ نہیں کیا انسپکٹر اور نہ ہی ہم ایسا کر سکتے ہیں۔“ وہ ایک بار پھر سسکنے لگی۔

مس جین کی نشاندہی پر گلزار کو پریمیا کے فلیٹ سے برآمد کر لیا گیا۔ وہ ہشاش بشاش اور صحت مند تھا۔ اس ڈیڑھ مہینے کے عرصے میں اُسے نہ صرف لباس پہننے کا سلیقہ آ گیا تھا بلکہ وہ اپنی گفتگو میں کہیں کہیں انگریزی کے لفظ بھی ٹھونک دیتا تھا۔

اُس نے تھانے میں آ کر اپنا جو طویل بیان قلمبند کر لیا اس میں واضح طور پر کہا کہ وہ کسی کی جس بے جا میں نہیں تھا۔ اس نے علیحدگی میں مجھے جو باتیں بتائیں وہ خاصی اہم تھیں۔ اُس نے انکشاف کیا کہ میم صاحبہ اور ان کے منگیتر پرتھی پال کے تعلقات کئی ماہ سے خراب تھے اور اب وہ مزید خراب ہو گئے ہیں۔ پرتھی پال کی نظر میم صاحبہ کی دولت و جائیداد پر تھی اور

بلا لیا۔ گلزار نے بتایا کہ اُس نے مغربی لباس بالکل چھوڑ دیا ہے اور مقامی رواج کے مطابق کپڑے پہنتی ہے۔ پھر گلزار کا پہلا بچہ پیدا ہوا تو اس کا نام جینی نے اپنی مرضی سے رحمان رکھا۔ یہ درحقیقت اسلام کی طرف اُس کا سفر تھا۔ آخر ایک روز یہ سفر مکمل ہوا۔ شام کا وقت تھا..... گلزار بھاگتا ہوا تھانے میں داخل ہوا۔ اُس نے مجھے بے تکلفی سے بازوؤں میں بھینچ لیا اور لرزتی سرگوشی میں بولا۔ ”لالہ..... لالہ جین مسلمان ہو گئی ہے۔“

بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے
سچ کہا ہے کسی نے کہ برا شخص جب دل کی گہرائی سے اچھا بنتا ہے تو اچھوں اچھوں کو پیچھے چھوڑ دیتا ہے۔

☆=====☆=====☆

صغرا

زیادہ سے زیادہ دولت کے حصول کی ہر انسان کو خواہش ہوتی ہے۔ کچھ لوگ اس خواہش کو پورا کرنے کے لیے ہر حد سے گزر جاتے ہیں۔ ایسے دو دولت مندوں کی ہوس زر کی کہانی جو ایک غریب کو اچانک مل جانے والی دولت اس سے ہتھینا نا چاہتے تھے۔ اس کشمکش سے ایک جذبات کو ہلا دینے والی کہانی نے جنم لیا۔

رہی ہوئی تھی۔ وہ دوپہر کے بعد نرنجن کے گھر آتی تھی۔ اس وقت نرنجن عموماً کام پر ہوتا تھا۔ نکرانی صغراں جھاڑ پونچھ کرتی تھی، کپڑے دھوتی تھی اور نرنجن کا کھانا وغیرہ پکا کر اور گھر کو تالا لگا کر واپس چلی جاتی تھی۔ اس تالے کی دو چابیاں تھیں ایک نرنجن کے پاس اور دوسری صغراں کے پاس رہتی تھی۔

قتل کے روز بھی حسب معمول صغراں نرنجن کا کھانا وغیرہ پکا کر چلی گئی تھی۔ رات کو کسی وقت نرنجن آیا اور پیٹ پوجا کر کے سو گیا۔ صبح سویرے ساتھ والے گاؤں سے ایک شخص اُسے ملے آیا۔ وہ کافی دیر دروازہ کھٹکھٹاتا رہا۔ نرنجن کو آوازیں دیتا رہا لیکن اندر خاموشی کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ آخر ایک پڑوسی چھت پر سے نرنجن کے گھر میں گھسا اور اُس نے نرنجن کی خون میں لت پت لاش دریافت کی۔

میں نے بڑی احتیاط سے جائے وقوعہ کا معائنہ کیا۔ کمرے میں دھینگا منشتی کے آثار بالکل صاف نظر آتے تھے۔ دو یا دو سے زیادہ افراد میں زبردست کھینچا تانی ہوئی تھی۔ کئی چیزیں ادھر ادھر بکھری ہوئی تھیں۔ ان میں ریزگاری بھی تھی، جو قاتل یا مقتول کی جیبوں سے نکل کر فرش پر بکھر گئی تھی۔ میں نے ضروری شہادتیں اکٹھی کرنے کے بعد لاش پوسٹ مارٹم کے لیے انشوا دی اور گواہوں کے بیان قلمبند کرنے میں مصروف ہو گیا۔

سب سے پہلے پڑوسی چانن دین کا بیان لیا گیا۔ اُس نے دعویٰ کیا کہ رات کے کسی حصے میں اُن کے گھر کے کسی فرد کو کوئی آواز وغیرہ سنائی نہیں دی۔ اُس نے بتایا کہ نوکرانی صغراں روز کی طرح آئی تھی اور کام کر کے چلی گئی تھی۔ اس کے بعد نرنجن کے سوا اور کوئی گھر میں نہیں آیا۔ اگر رات نو بجے کے بعد آیا ہو تو وہ کچھ کہہ نہیں سکتے۔ چانن دین کی باتوں سے معلوم ہوا کہ مقتول نرنجن بیٹی کے بوجھ سے فارغ ہو کر اپنی شادی کرنے کا ارادہ رکھتا تھا اور اُس نے ایک دو بندوں کو کہہ بھی رکھا تھا کہ وہ اُس کے لیے کوئی مناسب رشتہ ڈھونڈیں۔ یہ بڑا اہم نکتہ تھا۔ میں نے اس بارے چانن دین سے کرید کرید کر سوال پوچھے۔ ان سوالوں کے جواب میں پتہ چلا کہ نرنجن کے دونوں بیٹے باپ سے صلح کرنا چاہتے تھے لیکن وہ جان بوجھ کر ان سے صلح نہیں کرتا تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ بیٹے اُس کی دولت پر رال نکار رہے ہیں۔ وہ کہتا تھا کہ اگر واگرو نے مجھے دیا ہے تو میں اُسے اپنی ذات پر خرچ کروں گا۔ آخری عمر میں وہ بیٹوں اور بہوؤں کا محتاج نہیں ہونا چاہتا تھا اس لیے گھر بسانے کے لیے رشتہ ڈھونڈ رہا تھا۔ بیٹے اور خاص طور پر بڑا بیٹا اس شادی کے خلاف تھا۔ وہ ایک دو مرتبہ باپ کے گھر آ کر اُس سے لڑ بھی چکا تھا۔ میں نے چانن دین سے ایک اور اہم سوال پوچھا۔ میں نے کہا: ”چانن! تم

لاش بالکل سیدھی پڑی تھی۔ سینے پر دو زخم تھے۔ ایک گردن کے قریب ہنسی کے جڑ میں، دوسرا دل سے ذرا نیچے۔ یہ کافی گہرا زخم تھا اور کسی بھی تنومند شخص کی جان لے سکتا تھا لیکن یہ زخم لگا کر بھی قاتل کی تسلی نہیں ہوئی تھی اور اُس نے مقتول کے بال مٹھی میں جکڑ کر اُس کی شدہ رگ کاٹ دی تھی۔ فرش پر نیلی دری بچھی ہوئی تھی۔ اس پر جہاں خون کے بہت سے دھبے تھے وہاں مقتول کے سر کے کچھ سفیدی مائل بال بھی بکھرے ہوئے تھے۔ یہ واردات امرتسر کے ایک مضافاتی قصبہ ڈھاب نہال سنگھ میں ہوئی۔ قصبہ کا نام کافی طویل تھا اس لیے لوگ اسے صرف ”ڈھاب“ ہی کہتے تھے۔ ڈھاب امرتسر سے قریباً تیس میل کے فاصلے پر تھا۔ یہاں سے ایک کچی سڑک گزرتی تھی۔ قصبہ کا چوہدری شام سنگھ کافی خوشحال شخص تھا۔ ارد گرد کے دیہات میں اُس کی دوستیاں بھی بہت تھیں اور دشمنیاں بھی۔ ہلاک ہونے والے شخص کا شام سنگھ سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اس شخص کا نام نرنجن سنگھ تھا۔ عمر قریباً پینتیس برس تھی۔ کچھ عرصہ پہلے تک نرنجن سنگھ قصبہ میں معمولی دکان کرتا تھا لیکن پھر اچانک اُس کے پاس بے آگئے۔ اُس نے نہ صرف جھوٹی سی حویلی خرید لی بلکہ اُسے ٹھیک ٹھاک طرح سجا بنا بھی لایا۔ اب وہ پچھلے پانچ چھ مہینے سے اپنے اس نئے مکان میں رہتا تھا اور شہر جا کر آڑھت بھی کرتا تھا۔ یہ بھی پتہ چلا کہ تین مہینے پہلے اُس نے اپنی اکلوتی بیٹی کی شادی بڑے ٹھاٹ باٹ سے کی تھی۔

نرنجن کا قتل اُس کے نئے مکان میں ہی ہوا تھا۔ اُس کے دو بیٹے تھے اور دونوں بیٹے رہتے تھے۔ باپ سے اُن کا ملنا جلنا نہیں تھا اور باپ کے پاس پیسہ آنے کے بعد بھی وہ اُن سے دور ہی رہے تھے۔ بیوی تین سال پہلے مر چکی تھی۔ ایک بیٹی تھی جسے نرنجن نے بیاہ دیا تھا۔ اب وہ گھر میں اکیلا ہی رہتا تھا۔ گھر کا کام کاج پہلے تو بیٹی کرتی تھی اب اس نے ایک نوکرانی

نے ابھی بتایا ہے کہ چھ مہینے پہلے تک نرنجن قصبے میں کریمانے کی دکان کرتا تھا۔ پھر واہگرو نے اُسے پیسہ دیا اور وہ ٹھاٹس باٹس سے رہنے لگا۔ واہگرو چھپر پھاڑ کر تو نہیں دیتا، آخر کوئی حیل بہانہ ہوتا ہے..... نرنجن اس بارے میں کیا کہتا تھا؟“

چانن بولا۔ ”وہ تو شروع سے یہی کہتا رہا ہے جی کہ شہر میں اُس نے آڑھت سے نفی کمایا ہے۔ چائے کی کھلی پتی کا کوئی زبردست سودا مار لیا تھا اُس نے۔ دو دن بعد چائے کا بھار آسمان پر چڑھ گیا۔ ایک ہی دن میں نرنجن نے ہزاروں کمال لیے۔“

میں نے کہا۔ ”یہ تو نرنجن کا بیان ہوا۔ کیا اس بیان پر تمہیں اور قصبے والوں کو بھی یقین ہے؟“

چانن دین گڑ بڑا سا گیا۔ قریب بیٹھا ایک محلے دار بولا۔ ”تھانیدار صیب سچی بات یہ ہے کہ اس بارے میں کسی کو بھی ٹھیک طرح پتہ نہیں۔ کوئی کہتا ہے نرنجن نے چائے میں نفع کمایا ہے، کوئی کہتا ہے اُس نے امرتسر میں جوا کھلیا ہے اور کچھ کا خیال ہے کہ اُسے کوئی گھڑا اثر ملا ہے۔“

”گھڑا ملنے“ سے مطلب اُن دنوں یہ لیا جاتا تھا کہ کسی کو زمین میں دبائے ہوئے پیسے یا زیورات وغیرہ ملے ہیں۔ اُن دنوں آج کی طرح بینک اور فنانس کے ادارے تو تھے نہیں اور دیہات میں تو کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایک چھوٹی سی پرچی کے بدلے کسی کو اپنی پونجی دی جاسکتی ہے۔ اور بعض لوگ تو ایسے بھی ہوتے تھے کہ بیوی بچوں کو بھی اپنی جمع پونجی سے بے خبر رکھتے تھے۔ زیادہ تر چاندی کے روپے اور اشرفیاں وغیرہ ہوتی تھیں۔ انہیں گھرے میں بند کر کے گھر میں یا گھر سے باہر کہیں چھپا دیا جاتا تھا۔ کئی دفعہ ایسا ہوتا تھا کہ چھپانے والا مرجاتا اور یہ دولت کسی کے کام نہ آتی..... یا پھر مدتوں بعد کسی اجنبی کے کام آجاتی۔ قصبے میں بھی یہ ہوا سی اڑی ہوئی تھی کہ نرنجن کو کہیں سے کوئی گھڑا مل گیا ہے۔

میرا دھیان رہ رہ کر نوکرانی صغراں کی طرف جارہا تھا۔ اُس سے ابھی تک ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ شام کو ضروری کارروائی سے فارغ ہونے کے بعد میں نے بلال شاہ سے کہا کہ ”صغراں اور اُس کے خاوند کو ذرا خاموشی کے ساتھ تھانے لے آئے۔“

میری بات سن کر بلال شاہ بولا۔ ”آپ نے میرے دل کی بات کی ہے جی.....“

صغراں نامی لڑکی کچھ مشکوک سی ہے۔

میں نے کہا۔ ”ابھی تمہیں یہاں آئے جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے ہیں اور لوگوں کے گھروں میں جھانکنا شروع کر دیا ہے تم نے۔“

بولا۔ ”خان صاحب! چم کسی کو پیارا نہیں ہوتا۔ سب کو کم ہی پیارا ہوتا ہے۔ لوگوں کی ذمہ دہانہ میرا کام ہے۔ کام نہ کروں گا تو چوتھے دن ہی آپ لال جھنڈی دکھا دیں گے۔“

”اچھا..... اچھا چلو بتاؤ کیا شک ہے تمہیں؟“ میں نے اُس کی لمبی چوڑی تقریر سے ڈر کر کہا۔

وہ بولا۔ ”کچھ لوگ کہتے ہیں جی کہ نرنجن کے ساتھ صغراں کا کوئی ناٹکا تھا۔ نرنجن، صغراں اور اُس کے خاوند پر بڑا مہربان تھا۔ صغراں نت نئے کپڑے پہنتی تھی اور نرنجن کے گھر میں اُسے کھانے پینے کی کھلی چھٹی تھی۔“

میں نے بلال سے پوچھا۔ ”یہ صغراں شکل و صورت سے کیسی ہے؟“

وہ بولا۔ ”شکل و صورت تو میں نے ابھی نہیں دیکھی، بس اُس کی باتیں ہی سنی ہیں۔“

میں نے کہا۔ ”کیا زبردست مخبری کر رہے ہو۔ بندے کو ابھی دیکھا نہیں اور شک پہلے ہو گیا اُس پر..... چلو جاؤ..... لے کر آؤ میاں بیوی کو یہاں۔“

بلال شاہ گیا اور آدھ پون گھنٹے میں دونوں کو لے آیا۔ صغراں کی عمر بائیس تیس سال تھی۔ اس نے ڈیڑھ سال کا ایک گورا چٹا بچہ گود میں اٹھا رکھا تھا۔ وہ خود بھی خوبصورت تھی۔ یہ اور بات ہے کہ غریبی اور بھوک تنگ نے اس خوبصورتی کا ستیاناس کر رکھا تھا۔ اُس کا لباس بوسیدہ تھا اور دوپٹے میں بڑے بڑے سوراخ نظر آ رہے تھے۔ کچھ ایسا ہی حال اُس کے خاوند کا بھی تھا۔ اُس کے ایک بازو پر بڑی سی پٹی بندھی ہوئی تھی۔ وہ دونوں سخت خوفزدہ تھے۔ میں نے انہیں بیٹھنے کا حکم دیا۔ لرزتی کانپتی ٹانگوں سے وہ کرسیوں پر ڈھیر ہو گئے۔ صغراں کے خاوند کا نام عزیز تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

”تمہارے ہاتھ میں چوٹ کیسی ہے؟“

کہنے لگا۔ ”خرا دشین میں آگیا تھا جی..... چار جگہ سے ہڈی ٹوٹ گئی ہے۔ دو تین آپریشن ہو چکے ہیں، پر ابھی تک پوری طرح ٹھیک نہیں ہوا بازو۔“

”اپنا خرا د ہے تمہارا؟“

”نہیں جناب۔ ملازمت کرتا ہوں، بیس روپے مہینہ پر۔“

”مالک نے علاج نہیں کروایا تمہارا؟“

”نہیں جناب۔“ جواب دیتے دیتے اُس کی آنکھیں ڈبڈبائیں۔

”اکیلے رہتے ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”پہلے تو اکیلا نہیں تھا جی..... لیکن شادی کے بعد اکیلا ہونا پڑا۔ میں نے..... میں نے

کہ وہ بیوی سے کام کاج کرانے پر راضی نہیں تھا۔ اُس نے آخری وقت تک کوشش کی تھی کہ کسی طرح حالات سنبھل جائیں اور وہ اس بے عزتی سے بچ جائے لیکن وہ جو کہتے ہیں کہ الٹی ہوئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوانے کام کیا۔ ہونی ہو کر رہی تھی اور عزیز کو زہر کا یہ گھونٹ بھرنا ہی پڑا تھا۔

میں نے عزیز سے کہا کہ میں اس کی بیوی سے اکیلے میں دو باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ اُس کے چہرے پر رنگ سا آ کر گزر گیا۔ میری یہ بات اُسے پسند نہیں آئی تھی لیکن انکار بھی کیسے کرتا۔ یہ کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا۔ ایک جیتا جاگتا انسان قتل ہوا تھا۔ اس جرم میں کوئی شخص بھی پھانسی چڑھ سکتا تھا۔ میں نے اُسے تیز نظروں سے دیکھا تو وہ ہونٹ کاٹا ہوا ہار نکل گیا۔ صغراں نے اب دوپٹے سے منہ ڈھانپ لیا۔ صرف آنکھیں اور ناک کا کچھ حصہ نظر آتا رہا۔ میں نے اندھیرے میں تیر چلاتے ہوئے کہا۔ ”سنا ہے تمہارا خاوند پسند نہیں کرتا تھا کہ تم کسی کے گھر میں کام کرو اور وہ اکثر تم سے لڑتا جھگڑتا بھی رہتا ہے۔“

تیر نشا نے پر لگا۔ صغراں لرزاں لرزاں آواز میں بولی۔ ”پسند تو نہ وہ کرتے تھے نہ میں لیکن مجبوری تھی جی۔ گھر میں دو دو دن چولہا نہیں جلتا تھا۔ بچے بھوک سے بلک بلک کر بھوکے سو جائیں تو اُن پر جو گزرتی ہے ماں ہی جانتی ہے۔ میں نے گڈو کے ابا سے ہاتھ جوڑ کر کہا تھا کہ وہ مجھے نرنجن چاچا کے گھر کام کرنے کی اجازت دے دے۔ میں اُن کی اجازت سے ہی گئی تھی۔“

میں نے کہا۔ ”تم نرنجن کو چاچا کہہ رہی ہو مگر لوگ کچھ اور طرح کی باتیں کرتے ہیں۔“ وہ سر تا پا کانپ گئی۔ پھر ذرا سنبھل کر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”جن کے دل کا لے ہوں اُن کے منہ سے ہی ایسی باتیں نکلتی ہیں۔“

میں نے کہا۔ ”تمہارے خاوند کو ان باتوں کا پتہ تھا؟“ وہ رو ہانسی ہو کر بولی۔ ”معلوم نہیں جی۔۔۔۔۔ اگر ایسی باتیں ہوتی تھیں تو ہو سکتا ہے اُن کے کانوں تک بھی پہنچتی ہوں۔“

میں نے کہا۔ ”تم انجان بننے کی کوشش نہ کرو۔ ایسی باتیں ہوتی تھیں اور تمہارے خاوند کے کانوں تک پہنچتی تھیں اور تمہیں بھی سب پتہ تھا۔ اس کے باوجود تم نے نرنجن کے گھر جانا اور وہاں کام کرنا جاری رکھا۔“

وہ رونے لگی۔ ”میں کیا کرتی جی۔ کہاں سے پیٹ بھرتی بچوں کا۔۔۔۔۔ کون تھا مجھے ایک شہ کی روٹی بھی دینے والا۔ ہو سکتا ہے آپ ٹھیک کہتے ہوں۔ میرے خاوند کو لوگوں کی باتوں

اپنی مرضی کی شادی کی تھی۔ ابا اس بات پر سخت ناراض تھا۔ اُس نے کہا کہ میں تمہیں زمین سے عاق کر دوں گا۔ ادھر میں نے نکاح پڑھوایا ادھر اس نے مجھے عاق کر دیا۔ پر بندہ بندہ کرے جی تو سب کچھ کر لیتا ہے۔ میں نے ادھر ادھر سے قرض لے کر دو خرا د مشینیں لگا کر اور دو کاریگر رکھ کر کام شروع کر دیا۔ اللہ نے برکت دی۔ چار سال میں میری پانچ مشینیں ہو گئیں اور میں نے کارخانے کی جگہ بھی خرید لی۔ اللہ کا دیا سب کچھ تھا۔ چھوٹا سا گھر تھا، پتہ تھے، زندگی کی ساری لوازمات پوری ہو رہی تھیں۔ پھر جی ایک دم بُرے دن آ گئے۔ میرے سب سے چھوٹے بیٹے کی گردن میں پھوڑا ہو گیا۔ حکیموں جراحوں نے کہا کہ یہ گھمبیر ہے۔ بہت علاج کرایا۔ امر تر اور لاہور تک گئے۔ پانی کی طرح پیسہ بہایا لیکن کچھ فرق نہیں پڑا۔ دس ماہ کا ہو کر وہ بچہ فوت ہو گیا۔ اُس کی بیماری نے ہمیں ادھ مواء کر ڈالا تھا۔ کاروبار بھی ٹھپ ہو کر رہ گیا تھا۔ اوپر سے قرضے سر چڑھ گئے تھے، مجھے اپنی مشینیں بیچنی پڑیں۔ پھر کارخانے کی چار مرلے کی زمین بھی بیچنی پڑی۔ پھر یہ وقت آیا کہ مجھے اپنے ہی کارخانے میں بیس روپے مہینے کی نوکری کرنی پڑی۔ زندگی کی گاڑی جیسے تیسے چل رہی تھی شاید میں اسی طرح چلاتا رہتا لیکن پھر میرا یہ بازو مشین میں آ گیا۔ نہ صرف ملازمت گئی بلکہ علاج معالجے پر بھی خرچ ہونے لگا۔ تین چار مہینے میں ہم نے گھر کے برتن بیچنے شروع کر دیے۔ جب گھر میں فاقے پڑنے لگے تو مجبوراً میری بیوی کو لوگوں کے ہاں کام کرنا پڑا۔۔۔۔۔ اپنی روئداد سناتے سناتے عزیز کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں اور اس کی بیوی بھی ناک سے سوسوں کی آوازیں نکالنے لگی۔

پولیس کے سامنے پیش ہونے والے لوگ اپنی مجبوری اور تنگی ترشی کی کہانیاں سنانا کرتے ہیں۔ اگر ہر ایک پر رحم کھانا شروع کر دیا جائے تو کبھی کسی واردات کا مجرم نہ بن جائے۔ عزیز نے اپنی بے پناہ غربی کی کہانی سنائی تھی۔ دوسرے لفظوں میں وہ بے پناہ ضرورت مند تھا۔ اور کسی بندے کی ضرورت جتنی بڑی ہوتی ہے اس کے مجرم بننے کا امکان اتنا ہی زیادہ ہوتا ہے۔ صغراں اونچی لمبی ٹھیک ٹھاک رنگ روپ کی مالک تھی۔ اگر تنگ دستی مصیبت کے سائے نہ ہوتے تو وہ جھگمگ کرتی نظر آتی۔ کوئی بھی ضرورت مند مرد اسے کوئی ڈانواں ڈول ہو سکتا تھا اور نرنجن سنگھ بھی ضرورت مند تھا۔ چند سال پہلے اُس کی بیوی فوت ہو چکی تھی۔ وہ گھر میں اکیلا رہتا تھا اور صغراں وہاں کام کاج کرتی تھی۔ ممکن تھا لوگ جو بائہ بنا رہے تھے اُن میں سچائی ہو۔ دوسری طرف عزیز بھی مجھے شکل و صورت سے غیرت مند غصے والا دکھائی دے رہا تھا۔ وہ چوڑی چھاتی والا اونچا لمبا مرد تھا۔ ایک ہاتھ سے بھی کسی گردن دبوچ لیتا تو اُس کے لیے ہلنا مشکل ہو جاتا۔ اُس کی باتوں سے مجھے اندازہ ہو گیا

کا پتہ ہو لیکن وہ کیا کر سکتا تھا۔ اُس نے سارے پاؤں بیل کر رکھ لیے تھے۔ اب وہ مایوس ہو کر بیٹھ گیا تھا۔ اُسے بھی خبر تھی کہ جس دن میں کام پر نہ گئی ساری رات بچے بھوک سے رو رہے گے۔“

میں نے کہا۔ ”تم کہہ رہی ہو کہ تمہارا خاوند مایوس ہو کر بیٹھ گیا تھا۔ کہیں ایسا تو نہیں ہو کر مایوس ہو کر اُس نے نرنجن کو اگلے جہان پہنچا دیا ہو؟ ہو سکتا ہے لوگوں کی باتیں سن کر اُن نے نرنجن کو قتل کرنے کی ٹھان لی ہو۔“

وہ تھر تھر کانپنے لگی۔ ”نہیں تھانیدار جی۔ تم ایسا الزام مت لگاؤ۔ وہ ایسا نہیں کر سکتا۔ اس میں اتنی ہمت نہیں ہے۔ خدا کے لیے اس پر ایسا شک نہ کرو۔“

چند ایک سوالات پوچھنے کے بعد میں نے صفراں کو باہر بھیجا اور عزیز کو بلا لیا۔ میں نے ایک چیز خاص طور پر نوٹ کی۔ اُس کے بازو کی پٹی پر خون کے تازہ دھبے موجود تھے۔ یہ خون باہر سے نہیں لگا تھا۔ اندر سے ہی رس کر باہر آیا تھا۔ میں نے عزیز سے پہلا سوال بازو کے بارے میں ہی پوچھا۔ میں نے کہا۔ ”لگتا ہے تمہاری کلائی دکھ گئی تھی۔“

اُس نے چونک کر بازو کی طرف دیکھا۔ پھر میری بات سمجھتے ہوئے بولا۔ ”ہاں جی۔ کل میرا بڑا بچہ امجد کھیلتا ہوا سیڑھیوں سے پھسل گیا تھا۔ میں نے اُسے سنبھالنے کی کوشش کی تو بازو دکھ گیا۔“

”یہ کتنے بچے کی بات ہے؟“

”کل دو پہر کی۔ صفراں اُس وقت نرنجن سنگھ کے گھر کام کرنے گئی ہوئی تھی۔“

”اچھا۔ کل رات تم کہاں تھے؟“

”میں اپنے گھر پر ہی تھا جی۔ شام کو تھوڑی دیر کے لیے اپنے ایک دوست اشرف کے گھر گیا تھا، پھر واپس آ گیا تھا۔“

”تمہیں معلوم تھا کہ لوگ تمہاری بیوی اور نرنجن کے بارے میں باتیں بناتے ہیں؟“

”بھی نم اُسے نرنجن کے گھر جانے دیتے تھے۔“

میرے سول نے عزیز کا رنگ فق کر دیا۔ چند لمحوں کے لیے اُس سے کوئی جواب نہ نہیں پڑا۔ آخر تھوک نکل کر بولا۔ ”آپ کن باتوں کی بات کر رہے ہیں؟“

”مجھ سے صاف صاف سننا چاہتے ہو؟ تمہیں بتایا تو ہے جو باتیں لوگ بنا رہے تھے۔“

”مجھے کسی بات کا نہیں پتہ جی۔“ وہ لرزتی آواز میں بولا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ میں نے اُس سے چند اور سوال بھی کیے جن کا وہ تسلی بخش جواب نہ دے سکا۔

اُس کا ایک جواب خاص طور سے قابل غور تھا۔ میں نے اس کی بیوی سے پوچھا تھا کہ عزیز اپنے دوست اشرف کے پاس سے رات کتنے بجے گھر آیا تھا۔ بیوی نے کہا تھا کہ وہ عشاء کی اذان سے آدھ پون گھنٹے بعد سو گئی تھی۔ بعد میں عزیز آیا تو وہ غنودگی میں تھی۔ اُسے کچھ پتہ نہیں وہ کتنے بجے آیا تھا۔ دوسری طرف عزیز کہہ رہا تھا کہ وہ شام کے کچھ ہی دیر بعد واپس آ گیا تھا اور بیوی کے ساتھ بیٹھا باتیں کرتا رہا تھا۔ دونوں کے بیانیوں میں نمایاں فرق تھا۔ میں نے اس فرق کو نوٹ کرنے کے بعد میاں بیوی کو واپس بھیج دیا۔ تاہم انہیں ہدایت کر دی کہ وہ مجھے اطلاع دیئے بغیر قصبے سے باہر نہیں جائیں گے، مجھے کسی بھی وقت دوبارہ ان کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔

موتنے سے ملنے والی مختلف اشیاء ایک بڑے رومال میں بندھی میرے سامنے پڑی تھیں۔ ان میں نرنجن سنگھ کے ٹوٹے ہوئے بنوں کے علاوہ اس کی کلائی کی گھڑی بھی تھی۔ دھینگاشتی میں گھڑی کا چین ٹوٹ گیا تھا اور وہ درمی پر گر پڑی تھی۔ اس کے علاوہ موتنے سے کچھ ریز گاری ملی تھی۔ اس ریز گاری پر مجھے خاص طور پر غور کرنا پڑا تھا۔ اس کی وجہ میں آگے چل کر بتاؤں گا۔۔۔۔۔ میں نے صفراں اور عزیز کو واپس تو بھیج دیا تھا لیکن ایسا نہیں کہ مطمئن ہو کر واپس بھیجا ہو۔ خاص طور سے عزیز ہرگز میری تسلی نہیں کر سکا تھا۔ جیسا کہ میں نے بتایا ہے کہ وہ غیرت مند اور اکھڑ قسم کا گھرو تھا۔ بیماری اور بے کاری نے اُسے نڈھال کر رکھا تھا اور نہ ایسے نوجوان ناک پر کبھی نہیں بیٹھنے دیتے۔

یہ بات سوچی جاسکتی تھی کہ اُس نے منصوبہ بنا کر نرنجن کو قتل کر دیا ہو اور جاتے جاتے نرنجن کی جمع پونجی بھی لے اُڑا ہو۔ جہاں تک جمع پونجی کا تعلق ہے ابھی تک پتہ نہیں چل سکا تھا کہ نرنجن کے گھر سے کچھ گیا ہے یا نہیں۔ اور اس کی وجہ یہی تھی کہ کسی کو پتہ ہی نہیں تھا کہ نرنجن کے پاس کیا ہے۔۔۔۔۔ اور اگر ہے تو کہاں رکھا ہوا تھا۔ گھر میں ایک دو الماریاں کھلی ہوئی تھیں مگر ٹھیک سے اندازہ نہیں ہو سکا تھا کہ کمروں کی تلاشی لی گئی ہے یا نہیں۔۔۔۔۔ ہاں قاتل نے عام استعمال کی چیزوں کو ہاتھ نہیں لگایا تھا، یہاں تک کہ نرنجن کی گھڑی بھی موتنے پر ہی پڑی رہی تھی۔ ایک دوسری بات بھی سوچی جاسکتی تھی اور وہ یہ کہ عزیز نے نرنجن کو منصوبہ بنا کر قتل نہ کیا بلکہ فوری طور پر کوئی ایسی بات ہو گئی ہو جس نے اُسے مشتعل کر دیا ہو۔ مثلاً کل ہی نرنجن نے صفراں کے ساتھ کوئی دست درازی کی ہو جس کا بدلہ اُس نے نرنجن پر شب خون مار کر لیا ہو۔ تاہم یہ صرف ایک امکان تھا اور اس جیسے بہت سے امکان موجود تھے۔ نرنجن کے پاس نوٹک ہی دولت کی ریل پیل ہو گئی تھی۔ ممکن تھا اُس کے قتل کا سلسلہ بھی دولت کی اس ریل

دماغ میں ایسی سوچ بھی نہیں آسکتی۔“

میں نے کہا۔ ”جو حلال کی اولاد ماں باپ سے جھگڑ کر گھر چھوڑ سکتی ہے۔ اس سے گالی گلوچ کر سکتی ہے، وہ سب کچھ کر سکتی ہے.....“ روپ سنگھ کو ایک دم چپ لگ گئی۔ میں نے موضوع بدلتے ہوئے پوچھا۔ ”کل رات تم کہاں تھے؟“

”میں لکھن پور اپنے گھر میں تھا۔ میری گھر والی کو بچہ ہوا تھا۔ دوست رشتے دار اکٹھے تھے۔ دس بندے گواہی دے سکتے ہیں کہ میں کل رات دس گیارہ بجے تک اپنے گھر میں ہی تھا۔“

”بہت خوب“ میں نے کہا۔ ”گھر میں بیٹا ہوا تھا۔ جشن منایا جا رہا تھا اور حلال کی اولاد نے باپ کو خبر تک نہیں دی۔“

روپ سنگھ شپٹا کر رہ گیا۔ میں نے اُسی کی بات پر اُس کو پکڑ لیا تھا۔ چند سوال مزید پوچھنے کے بعد میں نے روپ سنگھ کو جانے کی اجازت دے دی، لیکن روپ سنگھ سے میں نے جو آخری سوال کیا وہ بڑا اہم ثابت ہوا۔ اس سوال کے جواب نے مجھے بری طرح چونکا دیا اور میں مجبور ہو گیا کہ روپ سنگھ کو مشکوک افراد کی لسٹ میں شامل کر لوں۔ اصولی طور پر یہ سوال مجھے شروع میں پوچھنا چاہیے تھا لیکن اُس وقت چونکہ یاد نہیں آیا اس لیے میں نے بعد میں پوچھ لیا۔ میں نے پوچھا کہ وہ کیا کام کرتا ہے؟

وہ بولا۔ ”لکھن پور میں موم بتیاں اور اگر بتیاں بنانے کا کام کرتا ہوں۔ ہفتے بعد یہ سامان امرتسر جا کر بیچ آتا ہوں۔“

اب میں آپ کو وہ خاص بات بتاتا ہوں جو موقع سے ملنے والی ریزگاری میں نظر آئی تھی۔ اس ساری ریزگاری سے ملکی سی خوشبو اٹھ رہی تھی جیسے سکوں کو عطر وغیرہ لگایا گیا ہو۔ یہ خوشبو زنجن سنگھ کے لباس میں نہیں تھی، نہ ہی وہ خوشبو وغیرہ لگانے کا شوقین تھا۔ مجھے شبہ تھا کہ یہ ریزگاری مقتول کی جیب سے نہیں قاتل کی جیب سے گری ہے۔ اب روپ سنگھ انکشاف کر رہا تھا کہ وہ اگر بتیوں کا کام کرتا ہے۔ اگر بتیاں اور عطر وغیرہ بنانے والوں کے ہاتھ خوشبوؤں اور مسالوں میں لتھڑے رہتے ہیں اور یہ کوئی بڑی بات نہیں کہ کسی ایسے شخص کی جیب سے دو سکے یا نوٹ گریں اور اُن سے خوشبو آ رہی ہو۔ یہ ویسے تو ایک معمولی سا اشارہ تھا لیکن ایسے اشاروں سے بعض اوقات بڑے بڑے انکشاف ہو جاتے ہیں۔

میں نے رومال میں بندھے ہوئے سکے اپنے سب انکسپٹر اور اے ایس آئی ہری سنگھ کو بھی دکھائے۔ انہوں نے تصدیق کی کہ ریزگاری میں خوشبو ہے اور یہ خوشبو رومال میں بندھی

پیل سے جاڑتا ہو۔ پھر اس کے بیٹوں کا چکر بھی تھا۔ وہ باپ کے سخت خلاف تھے اور اس کی نئی شادی کے پروگرام نے انہیں آگ بگولہ کر رکھا تھا۔ اس کے علاوہ یہ سیدھی سادی ڈیکٹی کی واردات بھی ہو سکتی تھی۔ ہر شخص کو پتہ تھا کہ زنجن سنگھ کے پاس پیسہ ہے اور وہ رات کو گھر میں تنہا ہوتا ہے۔ کوئی بھی وادعا تیا قسمت آزمانے کے لیے اُس کے گھر میں گھس سکتا تھا۔

شام کے بعد زنجن سنگھ کی ارتھی کو آگ لگا دی گئی۔ اس موقع پر زنجن کے تمام رشتہ دار موجود تھے۔ اس کے دونوں بیٹے بھی آئے ہوئے تھے۔ بڑے بیٹے کا نام روپ سنگھ تھا۔ انا روپ والا تو وہ نہیں تھا۔ بس عام سی شکل صورت تھی۔ ناک ذرا پھولی ہوئی تھی جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ جلد طیش میں آ جاتا ہے۔ زنجن سنگھ کی رکیں پوری ہو گئیں تو میں نے روپ سنگھ کو تھانے بلا بھیجا۔ رو رو کر اُس کی آنکھیں سو جی ہوئی تھیں اور وہ چپ چاپ نظر آتا تھا۔ وہ آتے ساتھ ہی کہنے لگا۔

”تھانیدار صاحب! ہمارے باپ کو کسی اور نے نہیں صرف اور صرف عزیزے نے مارا ہے۔ وہ دونوں میاں بیوی ہمارے باپ کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑے ہوئے تھے۔ صغراں عورت نہیں گشتی ہے۔ وہ پہلے میٹھی چھری بن کر ہمارے باپ کو ذبح کرنے کی کوشش کرتی رہی پھر ناکام ہوئی تو عزیزے کے ساتھ مل کر اُس نے سچ مچ باپ کو ذبح کر دیا۔ باپ کو مارنے میں اس نے عزیزے کی پوری پوری مدد کی ہے۔ اُسے یہ بھی معلوم تھا کہ گھر میں نقد پیسہ اور زور وغیرہ کہاں ہے۔ باپ کو مارنے کے بعد وہ سب کچھ وہاں سے نکال کر لے گئی ہے۔ آپ اُن کے گھر کی تلاشی لیں مجھے پورا یقین ہے کہ آپ کو ثبوت مل جائیں گے۔“

میں نے کہا۔ ”روپ سنگھ! ثبوت ڈھونڈنا میرا کام ہے اور وہ میں ڈھونڈ رہا ہوں۔ فی الحال تم سے چند ایک سوال پوچھنے ہیں، اگر اجازت ہو تو۔“

”پوچھئے جناب..... پوچھئے“ وہ گڑبڑا کر بولا۔

میں نے کہا۔ ”سنایہ گیا ہے کہ تم اپنے باپ کی دوسری شادی کے سخت خلاف تھے اور گھر آ کر اُسے دھمکیاں دے چکے تھے کہ اگر اُس نے شادی کی تو اچھا نہیں ہوگا۔“

روپ سنگھ کے چہرے پر ایک دورنگ بدلے۔ پھر وہ سنبھل کر بولا۔ ”اگر آپ یہ سمجھ رہے ہیں کہ باپ کے قتل میں میرا ہاتھ ہے تو سخت غلطی پر ہیں آپ.....“

میں نے اُسے جھانڈا۔ ”تم میری غلطیاں مت نکالو۔ جو میں پوچھ رہا ہوں وہ بتاؤ۔“ اُس نے کہا۔ ”باپ کی دوسری شادی ہمیں پسند نہیں تھی لیکن رب نہ کرے اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ ہم اپنے پیدا کرنے والے کو ہاتھوں سے قتل کر دیتے۔ حلال کی اولاد ہو تو اُس نے

اور کسی چیز میں نہیں۔ لکھن پور کی بنی ہوئی اگر بیتیاں ”ڈھاب“ میں بھی ملتی تھیں۔ بلال شاہ گیا اور کریمانے کی ایک دکان سے اگر بیتیاں لے آیا۔ اگر بیٹیوں کے پیکٹ پر صاف لکھا ہوا تھا ”روپ اگر بتی“، یعنی یہ روپ سنگھ کی بنائی ہوئی اگر بیتیاں تھیں۔ بلال شاہ کے سونگھنے کی حس بڑی تیز تھی (ہر پٹو کی ہوتی ہے) اُسے کہا گیا کہ وہ ریز گاری اور اگر بیٹیوں کی خوشبو کا مقابلہ کرے۔ بلال شاہ کافی دیر ناک سے لگا لگا کر سونگھتا رہا۔ اس کے بعد باری باری سب ہی نے سونگھا سا نکھی کی لیکن کوئی خاص نتیجہ نہیں نکلا۔ کچھ کا کہنا تھا کہ ریز گاری اور اگر بیٹیوں کی خوشبو سو فیصد ایک جیسی ہے۔ کچھ کا خیال تھا کہ بالکل نہیں ملتی اور کچھ کہتے تھے کہ ملتی جلتی ہے۔ میرا اپنا خیال بھی ”ملتی جلتی“ والا تھا۔ بہر حال میرے خیال میں یہی بات بڑی اہم تھی کہ ریز گاری میں سے آنے والی خوشبو سب نے محسوس کی تھی۔ آگے چل کر یہ نکتہ ہمارے لیے کارآمد ثابت ہو سکتا تھا..... اور ثابت ہوا بھی۔

دو روز بعد پوسٹ مارٹم رپورٹ آ گئی۔ اس رپورٹ میں ایک نیا انکشاف یہ ہوا کہ اپنی موت کے وقت مقتول نشے میں تھا۔ یہ چرس، افیم یا شراب وغیرہ کا نشہ نہیں تھا۔ نیند کی گولیوں کا نشہ تھا۔ مقتول کے معدے میں خواب آور دوا کی بڑی مقدار پائی گئی تھی۔ پولیس ایگزامینر کا خیال تھا کہ متوفی کم وبیش چار گولیاں کھائے ہوئے تھا۔ اس رپورٹ نے مجھے الجھن میں ڈال دیا۔ ایک بار پھر میرا دھیان صغراں اور عزیز کی طرف جانے لگا۔ اگر زنجن سنگھ نے نیند کی گولیاں خود نہیں کھائی تھیں تو پھر یہ کام صغراں کے سوا کسی اور کا نہیں تھا۔ زنجن سنگھ نے رات کو صغراں کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا کھایا تھا اور اس کی تصدیق پوسٹ مارٹم رپورٹ سے بھی ہوتی تھی۔ خوراک کے خانے میں صاف طور پر لکھا ہوا تھا رات سات اور نو بجے کے درمیان دال چاول۔ رات آٹھ اور دس بجے کے درمیان دودھ، اسی دوران چند قاشیں خربوزے کی اور ایک سیب۔ ایگزامینر کے خیال میں یہ عین ممکن تھا کہ خواب آور گولیاں سالن یا دودھ میں ملا کر دی گئی ہوں۔

اس رپورٹ کے بعد میں فوراً زنجن سنگھ کے گھر پہنچا۔ وہاں ابھی تک اُس کے دونوں بیٹے اور دیگر عزیز رشتے دار موجود تھے۔ میں نے زنجن کے کمرے کا تالا کھلویا اور وہاں موجود ایک الماری میں زنجن کی ذاتی چیزوں کا اچھی طرح معائنہ کیا۔ اس الماری میں ایک دو دائیں بھی موجود تھیں جن میں کھانسی کا شربت، پیٹ درد کی گولیاں اور پھکی وغیرہ تھی۔ تاہم تلاشی کے باوجود کوئی ایسی دوا نہیں ملی جس سے پتہ چلتا کہ زنجن خواب آور گولیاں استعمال کیا کرتا تھا۔ ہاں ایک پلنگ کے پیچھے سے استعمال شدہ گولیوں کے کاغذ ضرور مل گئے۔ کل تین

میلوں کے کاغذ ملے۔ یعنی پوسٹ مارٹم رپورٹ کچھ اتنی زیادہ غلط نہیں تھی۔
میں نے کسی کو یہ اشارہ دیئے بغیر کہ رپورٹ میں کیا لکھا ہے، گھر والوں سے مختلف سوالات کیے۔ مقصد یہی جانتا تھا کہ زرنجن سنگھ مینڈ کی گولیاں استعمال کرتا تھا یا نہیں۔ بیٹے تو اب زرنجن سے علیحدہ رہتے تھے۔ انہیں کچھ معلوم نہیں تھا۔ ہاں زرنجن کی بیٹی شاردانے روتے ہوئے بتایا کہ اس کے باپو نے کبھی کوئی نشہ نہیں کیا۔ نہ ہی کبھی نشے والی گولیاں کھائیں۔ بہت عرصہ پہلے جب اس کی ماں مری تھی اُس وقت باپو انیم کھا کر سویا کرتا تھا لیکن انیم کی عادت اُسے کبھی نہیں رہی۔ وہ ڈاکٹری دواؤں سے بچنے کی ہر ممکن کوشش کرتا تھا۔ لڑکی نے روتے ہوئے دہائی دی کہ اس کے باپو کو مارنے والی صغراں کیے سوا اور کوئی نہیں۔

بات ایک بار پھر صغراں اور عزیزے پر آ رہی تھی..... دو روز بعد سکھ ڈی ایس پی بارانگہ خود ”ڈھاب“ آدھمکا۔ وہ بڑا تپا ہوا تھا۔ کہنے لگا۔ ”سارا قصبہ دہائی دے رہا ہے، تمہارے پاس ثبوت بھی ہیں۔ پھر تم صغراں اور عزیزے کو گرفتار کیوں نہیں کرتے؟“ اُس کے لہجے سے نفرت جھلک رہی تھی۔ یقینی طور پر وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ میں ملزمان کو مسلمان ہونے کی رعایت دے رہا ہوں۔ میں نے اُس کا شبہ دور کرنے کے لیے اُسی وقت صغراں اور عزیزے کو گرفتار کر لیا اور عزیزے کو حوالات میں اچھی خاصی پھینٹی بھی لگوائی۔ وہ روتا جیختا رہا لیکن اُس نے بتایا کچھ نہیں۔ صغراں بھی بس بڑی بڑی قسمیں ہی کھاتی رہی۔ ان میں سب سے بڑی قسم وہ اپنے بچوں کی کھا رہی تھی۔ جب بھی کوئی ماں اپنے بچے کی قسم کھاتی ہے، میں اندر سے ہل جاتا ہوں۔ میرا جی چاہتا ہے کہ آنکھیں اور کان بند کر کے اُس عورت پر یقین کر لوں اور میں اکثر ایسا کرتا بھی ہوں لیکن اُس وقت کی بات اور تھی۔ میں انسپکٹر تھا اور ایک انسپکٹر کو یہ اختیار ہرگز نہیں ہوتا کہ وہ کسی ملزم کی قسم پر اعتبار کر کے اُسے چھوڑ دے۔ میں بھی عزیزے کو چھوڑ نہیں سکتا تھا۔ ہاں صغراں کے ساتھ رعایت کی جاسکتی تھی۔ وہ تین بچوں کی ماں تھی جن میں سے ایک شیر خوار تھا۔ ویسے بھی موقع سے اُس کی غیر موجودگی ثابت ہوتی تھی..... جب ڈی ایس پی بارانگہ اپنی دہشت پھیلا کر واپس چلا گیا تو میں نے پوچھ گچھ کے بعد صغراں کو خاموشی سے گھر واپس بھیج دیا۔

صغراں کو اس معاملے سے نکالنے کے لیے ضروری تھا کہ خواب آور گولیوں والا معاملہ صاف ہو۔ اگر وہ گولیاں مقتول کو کھانے میں ملا کر دی گئی تھیں تو پھر یہ بات ثابت ہو جاتی تھی کہ یہ قتل پوری منصوبہ بندی سے کیا گیا ہے اور صغراں اس منصوبے کا مرکزی کردار ہے لیکن اگر یہ ثابت ہوتا کہ مقتول نے نہ گولیاں خود خریدی تھیں باسکی ڈاکٹر نے اُسے لکھ کر دی تھیں تو

صغراں کی مشکل آسان ہو جاتی تھی۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ نرنجن سنگھ نے گولیاں کہاں سے خریدی ہوں گی۔ قصبے میں ایک چھوٹی سی دکان تو تھی مگر وہاں ایسی دوائیں نہیں ملتی تھیں۔ یہ گولیاں کچی سڑک کے کنارے ایک قصبے ”رام پورہ“ سے خریدی گئی تھیں یا امرتسر سے۔ امرتسر سے خریدی گئی تھیں تو کھوج لگانا بہت مشکل تھا، دوسری صورت میں کھوج لگ سکتا تھا۔ رام پورہ میں دوائیوں کی ایک بہت ہی بڑی دکان تھی۔ اُس کا مالک لالہ گنپت میراوات تھا۔ بڑا اچھا آدمی تھا۔ وہ تقسیم کے وقت مسلمانوں کو ہندو بلوائیوں کے ہاتھوں سے بچاتے ہوئے قتل ہوا۔ میں نے اپنے اے ایس آئی کو گنپت لالہ کی طرف بھیجا۔ اے ایس آئی کی واپسی کوئی چار گھنٹے بعد ہوئی۔ اُس نے بتایا کہ گنپت لالہ کے بیان کے مطابق قریب ایک ماہ پہلے ڈھاب قصبے کا نرنجن سنگھ اُس کے پاس آیا تھا اور چند دوائیں لے کر گیا تھا۔ اُسے ٹھیک طرح یاد نہیں لیکن شک پڑ رہا تھا کہ وہ کچھ خواب آور گولیاں بھی لے کر گیا تھا۔ میں نے اے ایس آئی کو دوبارہ گنپت لالہ کے پاس بھیجا اور وہ اس بیان کو تحریر کر کے اُس پر گنپت کے دستخط کروا لیا۔ یہ بیان صغراں کے لیے فائدہ مند ثابت ہو سکتا تھا۔ وہ شام کے وقت اپنے خاوند حوالات میں کھانا دینے آئی تو میں باہر برآمدے میں ہی بیٹھا تھا۔ بلال شاہ بھی میرے پار تھا۔ میں نے صغراں کو اپنے پاس بلایا۔ اس نے حسب معمول ایک پرانی چادر سے منہ مر ڈھانپ رکھا تھا۔ شیر خوار بچہ اس کی گود میں تھا اور ایک ہاتھ میں ایک میڑھا میڑھا پرانا سا نفلز کیرتیر تھا۔ میں نے آواز دی تو وہ بری طرح گھبرا گئی۔ اُس کا پاؤں چادر میں الجھا اور دو گرتے گرتے پچی۔ ایسے میں نفلز کیرتیر اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور اس کے چھوٹے چھوٹے ڈبے دور تک لڑھکتے چلے گئے۔ ان ڈبوں سے مونگ کی پتلی سی دال نکلی اور دو ہلکے پھلکی روٹیاں۔ وہ منظر مجھے آج تک یاد ہے۔ بے بسی کی تصویر بنی وہ برآمدے کے درمیان بیٹھی تھی۔ ایک ہاتھ سے روتے بچے کو سنبھالا ہوا تھا، دوسرے سے نفلز کیرتیر کے ڈبے اٹھ رہی تھی۔ بے بسی والا چاری کی تصویر تھی یہ عورت..... لوگ حوالات میں اپنے قیدیوں کے لیے مرغن کھانے لے کر آتے ہیں لیکن وہ مشکل سے دال روٹی کا انتظام ہی کر سکتی تھی اور اب دال روٹی بھی بچہ چور ہے کے بکھر گئی تھی۔ میں نے اپنے کانشیل کو اشارہ کیا کہ وہ عورت کو مدد کرے لیکن کانشیل سے پہلے ہی بلال شاہ لپک کر وہاں پہنچ گیا اور برتن سمیٹنے میں صغراں کی مدد کی۔ میں نے صغراں کو پاس بلا کر ملائمت سے گفتگو کی اور اُسے تسلی دی کہ کسی ٹھوس ثبوت کے بغیر میں اُسے ہرگز گرفتار نہیں کروں گا اور جب تک اُس کا خاوند حوالات میں ہے وہ روک ٹوک اُس سے ملنے آسکتی ہے۔ وہ منٹیں کرنے لگی کہ اس کے خاوند کو کچھ نہ کہا جائے۔

پہلے ہی بیماری کاٹ رہا ہے اور اُس میں اور تکلیف سہنے کی ہمت نہیں۔ میں نے کہا۔ ”تم بے فکر ہو۔ اگر وہ تعاون کرتا رہا تو اُسے ہاتھ بھی نہیں لگایا جائے گا۔“ کچھ دیر بعد صغراں خاوند کو روٹی دے کر چلی گئی تو بلال شاہ غمگین سامیرے پاس آ بیٹھا۔ کہنے لگا۔ ”خان صاحب! مجھے بڑا ترس آرہا ہے جی اس بے چاری پر۔ کچھ کریں اس کے لیے.....؟“

میں نے کہا۔ ”ہم کیا کر سکتے ہیں۔ ہم قانون کے دائرے میں پابند ہیں۔ اس سے باہر نہیں نکل سکتے۔“

”میرا یہ مطلب نہیں ہے جی۔“ وہ بولا۔ ”کوئی مالی امداد دینی چاہیے۔ مجھے پتہ چلا ہے بڑی مشکل سے گزر ہو رہی ہے ان لوگوں کی۔ گھر میں فاقہ رہتا ہے اور بچے روتے رہتے ہیں۔“

میں نے کہا۔ ”کیا یہ عورت مدد قبول کرے گی۔ مجھے تو نہیں لگتا کہ ایسا کرے گی۔“ وہ بولا۔ ”میرا بھی یہی خیال ہے..... لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ ہم کچھ کریں ہی نہ۔“ پھر سوچ کر کہنے لگا۔ ”میں اسے کہیں کسی گھر میں ملازم نہ رکھوا دوں۔“

”لیکن وہ ملازمت کرے گی کیسے؟“ میں نے پوچھا۔ ”پہلے تو عزیز گھر میں رہتا تھا اور بچے سنبھال لیتا تھا۔ اب وہ تین بچوں کو گھسیتی ہوئی کہاں ماری ماری پھرے گی؟“ ابھی ہم یہ باتیں کر رہے تھے کہ سات آٹھ زخمی افراد تھانے میں گھس آئے۔ کسی کا دانت ٹوٹا ہوا تھا، کسی کا سر پھٹا ہوا تھا اور کسی کے کپڑے تار تار ہو رہے تھے۔ دیہاتی تھانوں میں ایسے منظر اکثر دیکھنے میں آتے ہیں۔ دو گروہ کسی بات پر آپس میں ڈانگو ڈانگی ہو جاتے ہیں اور پھر زخمی حالت میں تھانے پر چڑھنے پہنچ جاتے ہیں۔ یہ بھی ایک ایسی ہی واردات تھی۔ نواحی گاؤں چک مستریاں میں دو پارٹیاں پانی کے جھگڑے پر لڑ پڑی تھیں۔ ایک بندہ شدید زخمی حالت میں ہسپتال پہنچایا گیا تھا اور اُس کے بچنے کی امید کم ہی تھی..... میں اس معاملے سے نبٹنے میں مصروف تھا۔ تھوڑی دیر بعد دوسری پارٹی کے لوگ بھی پہنچ گئے اور تھانے میں اچھی خاصی رونق ہو گئی۔ اسی دوران ہمارے قصبے یعنی ڈھاب کا سابق نمبردار لہنا سنگھ بھی تھانے آ پہنچا۔ اُس نے چادر کی بکل مار رکھی تھی اور اندازہ ہو رہا تھا کہ بکل کے نیچے ریوا لور بھی ہے۔ وہ اجازت لے کر میرے پاس اندر کمرے میں آیا اور کہنے لگا۔ ”نواز صاحب! مجھے آپ سے ایک بڑی ضروری بات کرنی ہے۔ مجھے صرف تین چار منٹ کا وقت دے دیں۔“ میں نے سمجھا کہ شاید وہ اسی لڑائی کے سلسلے میں کچھ کہنا چاہتا ہے لیکن میرے پوچھنے پر

اُس نے بتایا کہ نہیں یہ کوئی اور بات ہے۔ میں نے کہا۔ ”اچھا..... تم پانچ دس منٹ باہر بیٹھو میں ابھی فارغ ہو کر تمہیں بلاتا ہوں۔“

بادلِ نخواستہ لہنا سنگھ باہر چلا گیا۔ میں ایک بار پھر سے اپنے کام میں لگ گیا۔ باتوں پر گرما گرمی میں پتہ ہی نہیں چلا اور ڈیڑھ گھنٹہ گزر گیا۔ اچانک مجھے لہنا سنگھ کا خیال آیا۔ میر نے اپنے سنتری سے پوچھا۔ ”نمبردار باہر بیٹھا ہے یا چلا گیا؟“

وہ بولا۔ ”جناب! ابھی کچھ دیر پہلے اٹھ کر گئے ہیں۔ کہتے تھے میں ابھی گھر سے چکر اُکراتا ہوں۔“

میں ایک بار پھر راضی نامہ کرانے کے چکر میں پڑ گیا۔ ہم نو بجے کے قریب فارغ ہوئے۔ میں نے سنتری سے پوچھا۔ ”نمبردار آیا ہے؟“ سنتری نے انکار میں جواب دیا میں نے اس کے گھر بندہ بھیجا۔ معلوم ہوا وہ گھر میں بھی نہیں ہے۔ شام کے بعد وہ گھر گیا؟ نہیں تھا۔ میرا ماتھا ٹھنکا کوئی گز بڑ نظر آرہی تھی۔ بہر حال اب رات ہو چکی تھی۔ صبح ہی دیکھا جاسکتا تھا۔

اگلے روز علی الصبح چار بجے کے قریب نمبردار کا بھائی اور بیٹا تھانے پہنچ گئے۔ میں تھا۔ میں ہی سوتا تھا۔ مجھے جگا کر بتایا گیا کہ نمبردار لہنا سنگھ کا پتہ نہیں چل رہا۔

اُس کے چھوٹے بھائی بلراج نے کہا۔ ”ہم تو ہر جگہ دیکھ چکے ہیں جی..... رام پورہ تک بندے دوڑائے ہیں۔ بر کہیں سے کھوج نہیں ملا۔“

میں نے پوچھا۔ ”کہیں امرتسر تو نہیں چلا گیا؟“ بلراج بولا۔ ”سوال ہی نہیں پیدا ہوتا جی..... وہ تو گھر میں بھر جائی سے کہہ کر گئے تھے

میں ابھی واپس آ کر روٹی کھاتا ہوں۔ امرتسر تو دور کی بات ہے انہوں نے قصبے سے باہر جانا ہو تو روٹی شوق سے کھا کر جاتے۔“

میں نے پوچھا۔ ”کسی سے تازہ تازہ لڑائی جھگڑا تو نہیں ہوا؟“ لہنا سنگھ کا بیٹا بولا۔ ”جھگڑا تو ہے جی..... اور سارا قصبہ جانتا ہے ہو سکتا ہے اڑتی اڑتی

بات آپ تک بھی پہنچی ہو۔ رب نہ کرے باپو نہ ملا تو ہمارا پرچہ صرف اور صرف چوہدریوں ہوگا۔“

لہنا سنگھ کے بیٹے نے درست ہی کہا تھا۔ نمبردار لہنا سنگھ اور چوہدری شام سنگھ جھگڑے کی بہنک میرے کانوں میں بھی پڑ چکی تھی۔ دونوں گہرے یار تھے۔ اکٹھے کھاتے پیتے اور موج اڑاتے تھے۔ مگر چند ماہ پہلے کسی طوائف کی وجہ سے اُن کا جھگڑا ہو گیا تھا۔ طوائف

بازی اس علاقے کے چوہدریوں اور وڈیروں میں عام تھی۔ آئے دن حویلیوں میں مچرے ہوتے رہتے تھے۔ شام سنگھ لاہور کی ایک نوخیز طوائف کی ”نتھ اُتروائی“ کے لیے اُسے اپنے ڈیرے پر لایا تھا..... نتھ اُتروائی سے مطلب وہ رقم ہوتی ہے جو ایک طوائف پہلی بار کسی مرد کے ساتھ جانے کے لیے وصول کرتی ہے۔ یہ رقم سینکڑوں میں نہیں ہوتی۔ ہزاروں اور لاکھوں میں ہوتی ہے۔ آج کل کا لاکھ تب کا سینکڑا تھا اور شام سنگھ اُس نئی نوکیلی لڑکی کو پورے پانچ سو میں ”ڈھاب“ لایا تھا۔ وہ پڑھی لکھی اور نخرے والی تھی۔ ابھی وہ صرف دو ہی روز شام سنگھ کے پاس رہی تھی کہ ایک دن لہنا سنگھ ریکی تانگے پر سوار نشے میں ڈھت شام سنگھ کے ڈیرے پر پہنچ گیا۔ شام سنگھ اُس وقت کہیں گیا ہوا تھا۔ چم چم کرتی نوخیز طوائف کو دیکھ کر لہنا سنگھ کے منہ میں پانی بھر آیا۔ وہ نشے میں ڈھت تھا اور اُس کے ساتھی بھی ٹن ہو رہے تھے۔ وہ سب کے سب ”ست سری اکال“ بول کے لڑکی پر چڑھ دوڑے۔

دو تین گھنٹے بعد جب شام سنگھ بن سنور کر گھر سے ڈیرے پر واپس آیا تو اجڑی بچڑی، کچلی سی طوائف شہر واپس جانے کے لیے سامان باندھ چکی تھی۔ شام سنگھ نے بہت ہاتھ پاؤں جوڑے لیکن وہ اپنے ارادے پر قائم رہی۔ اس نے کہا۔ ”جو میرے ساتھ ہوا ہے اُس کے بعد میں ایک بل بھی یہاں نہیں رہوں گی۔“ غصے میں بھری ہوئی وہ اپنے نوکر کے ساتھ لاہور واپس چلی گئی..... بعد میں شام سنگھ اُسے منانے کے لیے لاہور گیا..... طوائف نے لہنے کے خلاف اُس کے خوب کان بھرے اور اُسے بھڑکا کر آگ بگولہ کر دیا۔ شام سنگھ ”ڈھاب“ واپس آیا تو لہنا سنگھ سے اُس کی لڑائی ہو گئی۔ اس واقعے کو اب دس بارہ ہفتے ہو چکے تھے لیکن لہنا سنگھ اور شام سنگھ کے درمیان پیدا ہونے والی کشیدگی میں اضافہ ہی ہوا تھا۔ اور اب آنا فانا لہنا گم ہو گیا تھا۔ میں نے بلراج سنگھ کے اصرار پر چوہدریوں کے خلاف کچی رپورٹ درج کر لی اور اسے ایس آئی کو بھیجا کہ وہ چوہدری شام سنگھ کو تھانے بلا لائے۔ اے ایس آئی حکم کی تعمیل میں روانہ ہو گیا۔ اسی دوران لہنا سنگھ کے دورشتے دار بھاگے ہوئے آئے۔ انہوں نے بتایا کہ چوہدری شام سنگھ نے لہنا سنگھ کو قتل کر دیا ہے یا شاید بد زخمی حالت کر کے اغوا کر لیا ہے۔ وہ سخت گھبرائے ہوئے تھے۔ میں نے تفصیل پوچھی تو ایک شخص کہنے لگا۔

”جناب! ہم ابھی اپنی آنکھوں سے خون کے دھبے دیکھ کر آئے ہیں۔ موقع پر لہنا سنگھ کی ایک جوتی بھی پڑی ہے۔ آپ خود موقع ملاحظہ کر سکتے ہیں۔ ہم نے ابھی تک کوئی چیز چھپڑی نہیں ہے۔“

میں نے پوچھا۔ ”کہاں دیکھتے ہیں خون کے دھبے؟“

لہنا سنگھ کا ایک بیٹا روتے ہوئے بولا۔ ”اپنی حویلی کے پچھواڑے۔“

میں لہنا سنگھ کے عزیزوں کے ساتھ فوراً موقع کی طرف روانہ ہوا۔ سابق نمبر دار لہنا سنگھ کی حویلی تھانے سے بمشکل تین فرلانگ کے فاصلے پر تھی۔ حویلی کی پچھلی طرف کھیت تھے اور کھیتوں کے ساتھ ساتھ ایک چھوٹی سی پگڈنڈی حویلی کے ایک بگلی دروازے تک جاتی تھی..... تھانے سے واپس حویلی آتے ہوئے اگر لہنا سنگھ سامنے والے دروازے سے حویلی میں داخل ہوتا تو اُسے کافی لمبا چکر پڑتا تھا اس نے پگڈنڈی والا مختصر راستہ اختیار کیا تھا اور یہیں کسی سے اُس کی مڈبھیڑ ہو گئی تھی۔ بگلی دروازے سے قریباً پچاس قدم دور گچی زمین پر خون کے دو تین بڑے دھبے موجود تھے۔ اس کے علاوہ لہنا سنگھ کی جوتی پڑی تھی اور دھینگا مٹی کے آثار بھی صاف نظر آرہے تھے۔ خون اتنا زیادہ نہیں تھا کہ لہنا سنگھ کو ”مقتول“ خیال کر لیا جاتا۔ یوں لگتا تھا وہ زخمی ہوا ہے اور زخمی کرنے والے اسے کچھ دور تک گھسیٹ کر اور پھر اٹھا کر لے گئے ہیں۔

موقعے کا اچھی طرح معائنہ کرنے اور ایک دو بیان لینے کے بعد ہم تھانے واپس آ گئے۔ یہاں چوہدری شام سنگھ پورے ٹہکے کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ کوئی ایک فٹ اونچا رنگین شملہ، ٹاس کا کھڑکتا ہوا کرتا اور ویسا ہی کلف لگا تہ بند۔ چوہدری کی آنکھیں نسواری تھیں اور اُن میں ”عیش پرستی“ کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔

موجھیں مروڑ کر کہنے لگا۔ ”نواز خان صیب! مجھ کو جنگی طراں پتہ تھا کہ آپ نے مجھ کو تھانے بلانا ہے۔ لہنا سنگھ جیسے منحوس بندے کی یاری کا کچھ انعام تو ملنا چاہیے تھا ناں ہم کو بھی.....“

میں نے دوسروں کو بھیج کر شام سنگھ سے اکیلے میں بات چیت کرنا مناسب سمجھی۔ سب باہر چلے گئے تو میں نے کہا۔ ”لمبے چکروں میں پڑنا ٹھیک نہیں۔ اگر لہنا سنگھ تیرے پاس ہے تو اُسے برا دکر اُدے۔ میں کوئی کیس نہیں بناؤں گا۔ اگر بنانا ہی پڑا تو تیرے ایک دو کارندوں کے خلاف بنا کر معاملہ رفع دفع کر دوں گا۔“

وہ مسکرانے لگا۔ ”نواز صیب! ہم کیسوں سے ڈرنے والے نہیں ہیں۔ آپ کو پتہ ہی ہے ایک دو مہینے پچھری کا منہ نہ دیکھیں تو گواچے گواچے پھرتے ہیں۔ باقی جہاں تک لہنا گنگہ کی بات ہے، مجھے اس کا کچھ پتہ نہیں۔ میں نے ایک ہفتہ پہلے رام پورہ کے رستے میں اس کی شکل دیکھی تھی۔ شام تک کئی بنے بنائے کام بگڑ گئے تھے۔ واہگرو بچائے ایسے نموسوں سے۔“

میں نے شام گھگھ کو کریدنے کی کوشش کی لیکن اُس نے پروں پر پانی نہیں پڑنے دیا۔
مجھے اُس کی باتوں سے جرم کی بو آ رہی تھی۔ میں نے اندھیرے میں تیر چلاتے ہوئے
کہا: ”شاید تمہیں ایک بات معلوم نہیں شام گھگھ..... غائب ہونے سے تھوڑی دیر پہلے لہنا گھگھ
میرے پاس تھانے آیا تھا۔“ میرے اس فقرے نے شام کے سر پر بم کے دھماکے کا کام کیا۔
یوں لگا جیسے اُس کا کوئی اندرونی خدشہ ایک دم سچ نکل آیا ہو۔ میں گہری نظروں سے اُس کا
جاڑہ لے رہا تھا۔ اُسے بدحواس دیکھ کر میں نے ایک اور چوٹ لگائی: ”چھپانے سے کوئی
فائدہ نہیں چوہدری..... اگر چاہتے ہو کہ میں تعاون کروں تو تم بھی میرے ساتھ تعاون کرو۔“
چوہدری نے سنبھیلنے کی کوشش کی، لیکن پھر بھی سنبھل نہیں سکا۔ وہ بڑبولا اور باتونی سا
ٹھنکنا تھا۔ ایسے بندے کی زبان سے جلدی میں اکثر غیر ضروری بات نکل جاتی ہے۔ یہاں
بھی ایسا ہی ہوا۔ وہ تیزی سے بولا: ”مجھ کو پتہ نہیں جی کہ لہنا گھگھ نے آپ کے کیا کان بھرے
ہیں..... اور وہ چندراتو.....“ کچھ کہتے کہتے وہ ایک دم چپ ہو گیا۔ ہونٹ یوں مضبوطی سے
بند کر لیے جیسے کسی بڑی غلطی کا احساس ہو گیا ہو۔

”کیا جندرا؟“ میں نے پوچھا۔

”کیا جندرا؟“ میں نے پوچھا۔

”کچھ نہیں جی..... اس لہنا سنگھ کی زبان نہیں ہے۔ سمجھیں کتنی کی بوٹی رکھی ہے منہ کے اندر۔ اگر آپ نے اُس کی باتوں پر اعتبار کرنا ہے تو پھر ابھی میرے خلاف 302 کا پرچہ کاٹ دیں۔“ وہ ابھی تک جھلایا ہوا تھا جیسے زبان کے پھسل جانے پر خود کو کوس رہا ہو..... وہ تیزی سے باتیں کرنے لگا۔ جیسے اس کوشش میں کہ میرے دماغ سے ”جندرے“ والی بات نکل جائے۔ موقع کی نزاکت دیکھ کر میں نے یہی ظاہر کیا کہ میرا ذہن اُس طرف سے ہٹ گیا ہے۔ ناٹم ضائع کرنے کی بجائے میں نے بات کا رخ موڑ دیا اور طوائف والے چکر کے بارے میں کچھ بات چیت کر کے اُسے رخصت کر دیا..... وہ اطمینان کے ساتھ واپس چلا گیا کہ میرا شک رفع ہو چکا ہے لیکن اصل شک تو اب شروع ہوا تھا۔ چوہدری کی اپنی باتیں تو اُس کے خلاف جال بن رہی تھیں۔ مجھے یقین سا ہونے لگا تھا کہ لہنا سنگھ نے شام سنگھ کی ریکمیل کو تہس نہس کر کے جس دشمنی کی بنیاد ڈالی تھی وہی دشمنی اس کی گمشدگی کا سبب بنی ہے۔ زن کے جھگڑے کا زہر بڑا خطرناک ہوتا ہے اور اس وقت یہی زہر شام سنگھ اور لہنا سنگھ کی گول میں دوڑ رہا تھا۔

میں نے لہنا سنگھ کے عزیزوں کو تسلی دی اور اُن سے قسم لی کہ وہ کوئی دنگا فساد نہیں کریں گے۔ لہنا سنگھ کے بھائی نے کہا: ”ہم نے کبھی دنگا فساد کیا ہی نہیں جی..... یہ کام چوہدریوں کی

طرف سے ہی شروع ہوا تھا۔ اب آپ کہتے ہیں تو جناب ہم گھر سے ہی باہر نہیں نکلیں گے۔ ہم نے دشمنی نہیں پالنی۔ ہمیں صرف اپنا بھائی چاہیے۔“

میں نے کہا۔ ”بھائی تمہیں مل جائے گا۔۔۔۔۔ یہ میرا وعدہ ہے تم سے۔“

لہنا سنگھ کے عزیز واپس چلے گئے۔۔۔۔۔ میں نے کارروائی ڈالنے کے لیے اور چوہدریوں کو یہ بتانے کے لیے کہ میں اب اُن پر شبہ نہیں کر رہا چند ایک اوباش افراد کو تھانے میں بند کیا اور اُن کی چھتروں وغیرہ کی۔ اس چھتروں سے یہ فائدہ ہوا کہ ایک دو چوریاں پکڑی گئیں اور جیب تراشی کی ایک واردات کا سراغ مل گیا۔ لہنا سنگھ کا پتہ نہ ان لوگوں سے ملتا تھا۔ ملا۔۔۔۔۔ میں نے لہنا سنگھ کے عزیزوں سے وعدہ کیا تھا کہ جلد ہی لہنا سنگھ مل جائے گا لیکن یہ وعدہ نہیں کیا تھا کہ وہ زندہ ملے گا۔ میں کیا کوئی بھی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ لہنا سنگھ کے ساتھ کب بیتی ہے۔۔۔۔۔ ہاں اس بات پر مجھے پورا بھروسہ تھا کہ لہنا کے گم ہونے میں چوہدریوں کا ہاتھ ہے۔ شام تک ایک اور انکشاف ہو گیا اور یہ اس کیس کا سب سے اہم انکشاف تھا۔ میں نے شام سنگھ سے ملاقات کے فوراً بعد اپنے خبر خاص بلال شاہ کو ہدایت کر دی تھی کہ وہ جنڈرا سنگھ یا جنڈرا کمار نامی کسی شخص کا پتہ کرے۔ مجھے یقین تھا کہ جنڈرا کسی ایسے شخص کا نام ہے جس کا تعلق اس کیس سے بہت گہرا ہے۔ اگلے روز صبح سویرے بلال شاہ نے مجھے نہایت چوڑا دینے والی خبر سنائی۔ اس نے بتایا کہ جنڈرا کسی شخص کا نام نہیں بلکہ عرفیت ہے (یعنی عرف ہے) چند روز پہلے قتل ہونے والا نرنجن سنگھ نو جوانی میں پہلوانی بھی کرتا رہا ہے۔ اُسے بعض لوگ جنڈرا پہلوان کہتے تھے کیونکہ اُس کی پکڑ بڑی سخت تھی۔ اب ان واقعات کو زمانہ گزر چکا ہے لیکن بعض پرانے لوگ اب بھی نرنجن کو جنڈرا کہہ کر پکارتے ہیں۔

میں نے بلال شاہ سے پوچھا۔ ”کیا قصبے میں اور کوئی جنڈرا نہیں؟“

بلال شاہ نے کہا۔ ”نہ صرف قصبے میں بلکہ میری معلومات کے مطابق ارد گرد کے

دیہات میں بھی اس نام یا عرف کا کوئی بندہ نہیں۔“

میری رگوں میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ اس کا مطلب تھا نرنجن سنگھ کے قتل اور لہنا سنگھ کی گمشدگی میں گہرا تعلق ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ لہنا سنگھ قتل کی واردات کے بارے میں کچھ جانتا ہو اور اسی لیے اُسے موقع سے غائب کر دیا گیا ہو۔ میں اُس وقت کو کوئے لگا جب خود مجھے کوئی اطلاع پہنچانے کے لیے تھا نہ آیا تھا اور اپنی مصروفیت کی وجہ سے میں نے اُسے باہر بٹھا دیا تھا۔ ممکن ہے کہ میں اُس کی بات سن لیتا تو نہ صرف نرنجن سنگھ کے قتل کا مسئلہ حل ہو جاتا بلکہ خود لہنا بھی بڑی مصیبت سے بچ جاتا۔ اب ذہن میں خود بخود یہ سوال اٹھتا:

تھا کہ کہیں نرنجن سنگھ کو اُس کی حویلی میں جان سے مار دینے والے چوہدری تو نہیں۔ اگر چوہدریوں نے ایسا کیا تھا تو اس کی کیا وجہ تھی۔ نرنجن سنگھ سے چوہدری شام کی دشمنی تھی اور نہ اُس کے کسی بھائی بند کی۔ بلکہ نرنجن سے چوہدریوں کا کوئی خاص تعلق ہی نہیں تھا۔ چوہدریوں زمینداروں کا تعلق واسطہ اپنے جیسے لوگوں سے ہوتا ہے اور نرنجن سنگھ تو چھ مہینے پہلے تک صرف ایک کریمانہ فروش تھا۔ چوہدری شام سنگھ کو کیا ضرورت پڑ گئی تھی اُس کے خون سے ہاتھ رنگنے کی۔ گھوم پھر کر ذہن اُس بات کی طرف جاتا تھا جو شروع سے پردے میں تھی اور ابھی پتہ نہیں کہ تک پردے میں وہی تھی۔ میرا اشارہ اُس خوشحالی کی طرف تھا جو نرنجن سنگھ کے گھر میں اچانک آ گئی تھی اور جس کی وجہ سے کوئی بھی اُس کی جان کا دشمن بن سکتا تھا۔ نرنجن کا کہنا تھا کہ ایک سودے میں اُسے زبردست منافع ہوا ہے اور یہ پیسہ اُسی منافع کی نشانی ہے۔ جب کہ اکثر لوگ اس بات پر یقین نہیں رکھتے تھے۔ ہو سکتا ہے نرنجن کی یہ ”خفیہ خوشحالی“ ہی چوہدری شام سنگھ کے لالچ کا باعث بن گئی ہو اور اُس نے اُسے قتل کر دیا ہو۔ بعد میں لہنا سنگھ کو اس واردات کا پتہ چلا ہو۔ وہ مخبری کرنا چاہتا ہو اور اس مخبری کے ڈر سے چوہدریوں نے اُسے غائب کر دیا ہو۔

اب چوہدری شام وغیرہ کی نگرانی بہت ضروری ہو گئی تھی۔ مگر مسئلہ یہ تھا کہ اس قصبے میں ایک بھی ایسا شخص نہیں تھا جو چوہدری شام کی نگرانی یا اس کے خلاف مخبری کرنے کا خطرہ مول لے سکے۔ بہت گھوم پھر کر میری نگاہ ایک دانی جہانوں پر پڑی۔ جہانوں بڑی صحت مند اور دنگ عورت تھی۔ قصبے کی ہر چار دیواری میں دندناتی ہوئی گھس جاتی تھی۔ چوہدریوں سے اس کی گاڑھی چھتی تھی اور اس حویلی میں ہونے والے سارے بچے اسی کی مدد سے پیدا ہوئے تھے۔ وہ لالچی یا ڈرنے والی عورت نہیں تھی لیکن اُس کی ایک کمزوری میرے ہاتھ آ چکی تھی اور اسی ”کمزوری“ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میں نے اُسے چوہدری کے خلاف مخبری پر راضی کر لیا۔ اس کمزوری کی تفصیل میں گیا تو یہ کہانی طویل ہو جائے گی۔ ویسے بھی یہ ذکر یہاں مناسب نہیں۔ مختصر یہ جان لیں کہ ماضی میں جہانوں ایک ”لڑکے باز“ عورت رہی تھی۔ اُس کے سسرالی گاؤں ”چندر پور“ میں ایسے کئی قصے مشہور تھے جب کہ یہاں ڈھاب میں اُسے سب پاکباز سمجھتے تھے۔ بہر حال میں نے جہانوں کو موت دکھا کر بخار پر راضی کر لیا۔ یعنی وہ چوہدری شام سنگھ پر نگاہ رکھنے کو تیار ہو گئی۔ جہانوں سے میرا رابطہ بلال شاہ کے ذریعے تھا۔ ”سرسے تیسرے روز بلال شاہ نے مجھے آکر بتایا کہ حویلی میں شام سنگھ کا ایک کارندہ جھورا موجود نہیں ہے۔ سنا ہے چوہدری نے اُسے کسی خاص کام سے بھیجا ہوا ہے۔ بلال شاہ نے

کہا۔ ”جہانوں کو شک ہے کہ جھوڑا کسی چکر میں حویلی سے باہر ہے۔“

میں نے بلال شاہ سے کہا کہ وہ جہانوں سے مسلسل رابطہ رکھے اور جو نبی کوئی اہم بات معلوم ہو مجھے اطلاع دی جائے۔ بلال شاہ ان دنوں بہت بڑھ چڑھ کر کام کر رہا تھا۔ عزیز کی بیوی صغراں سے اُسے بہت ہمدردی ہو گئی تھی اور وہ چاہتا تھا کہ وہ اور عزیز کسی طرح اس چکر سے نکل آئیں۔ ویسے تو بلال شاہ ایک ہمدرد بندہ تھا لیکن صغراں سے اُس کی ہمدردی کی وجہ بڑی دلچسپ تھی۔ بلال شاہ کو اس عورت کی شکل و صورت میں اپنی پچھری محبوبہ کی جھک نظر آتی تھی۔ اس محبوبہ کی یاد میں وہ اکثر آئیں بھرتا رہتا تھا۔ غم غلط کرتے کرتے اُس نے گھر میں بچوں کی لائن لگائی تھی مگر غم پھر اپنی جگہ برقرار رہا تھا۔ بلال شاہ کی اُس محبوبہ کا ذکر آپ ایک کہانی میں پڑھ چکے ہیں۔ بلال شاہ کا خیال تھا کہ صغراں کی آنکھوں میں، اُس کے ہونٹوں میں یا اس کے بولنے کے انداز میں کوئی ایسی بات ہے جو اُس کی جان تمنا میں تھی..... اللہ بہتر جانتا ہے۔

چوتھے پانچویں روز مجھے ایک نہایت اہم خبر ملی۔ خبر لانے والا بلال شاہ ہی تھا۔ اُس نے بتایا کہ ابھی دس منٹ پہلے جہانوں اُس کے گھر آئی تھی اور اُس نے اطلاع دی ہے کہ سابق نمبر دار لہنا سنگھ جو ہمدردی شام کے کارندے جھوڑے کے کھوہ یعنی کنویں پر ہے۔ وہ شدید زخمی ہے اور کوئی پتہ نہیں ایک آدھ دن میں پار ہی ہو جائے۔ تفصیل بتاتے ہوئے بلال شاہ نے کہا۔

”کل رات گئے جھوڑا حویلی میں آیا تھا اور بند کمرے میں چوہدری سے دیر تک باتوں میں مصروف رہا تھا۔ وہ واپس جانے لگا تو جہانوں نے دلیری کی اور اپنے بیٹے کو جھوڑے کے پیچھے لگا دیا۔ جھوڑا سیدھا اپنے کھوہ پر گیا۔ یہ کھوہ جھوڑے کے باپ کا تھا۔ اب ایک عرصے سے بند پڑا ہے اور کوئی اس طرف آتا جاتا نہیں۔ یہاں چند کچے کوٹھے بھی بنے ہوئے ہیں۔ جھوڑے نے لہنا سنگھ کو ایک ایسے ہی کوٹھے میں رکھا ہوا ہے۔ وہاں جھوڑے کے علاوہ ایک اور بندہ بھی پہرے پر رہتا ہے۔ اُس کے پاس کچی رائفل ہے اور گولیوں سے بھرا ہوا ایک ٹمبا ہے۔“

جہانوں کے بیٹے نے جان مشکل میں ڈال کر بڑی کارآمد معلومات حاصل کی تھیں۔ ان معلومات سے فائدہ نہ اٹھا سکتے تو یہ ہماری بڑی بد قسمتی تھی۔ میں نے فوراً چھاپہ مار پارٹی ترتیب دی اور ایک ہیڈ کانسٹیبل کو حویلی دوڑایا کہ وہ چوہدری شام سنگھ کو تھانے بلال شاہ چھاپہ مارنے سے پہلے میں شام سنگھ سے بات کرنا چاہتا تھا۔ عین ممکن تھا کہ کھی سیدی لنگھیں

ہے ہی نکل آتا لیکن شام سنگھ قصبے میں نہیں تھا۔ لاہور گیا ہوا تھا۔ شاید اُسی چھک چھلو کی گود میں سر رکھ کر لیٹا ہوگا جو چند ماہ پہلے شام اور لہنے میں اینٹ کتے کا بیر ڈال چکی تھی۔ میں نے کسی دوسرے سے بات کرنا مناسب نہ سمجھی اور اُسی وقت پارٹی کے ساتھ جھوڑے کے کھوہ پر دھاوا بول دیا۔

یہ صبح نو ساڑھے نو کا وقت تھا۔ بڑی گرم چمکیلی دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ لگتا تھا ابھی دوپہر شروع ہوئی ہے۔ کھیت کھلیاں سنسان نظر آرہے تھے۔ کچے راستے کی دھول پھانکتے ہم ایک خشک نالے میں داخل ہوئے اور ایک میل اُسی کے اندر ہی اندر چلتے عین جھوڑے کے ڈیرے پر جا پہنچے۔ ہم نے جو رستہ اختیار کیا وہ طویل ضرور تھا لیکن بالکل محفوظ تھا۔ جھوڑا سنگھ کے فزشتوں کو بھی خبر نہیں ہوئی کہ پولیس اُس کے سر پر پہنچ گئی ہے۔ وہ ایک گھنے پتیل کے نیچے ایک ملنگ نما شخص کے ساتھ بیٹھا سردائی پی رہا تھا۔ سردائی ایک ایسا گھونا ہوتا ہے جس میں جھنگ کے علاوہ بادام اور مغز وغیرہ ملائے جاتے ہیں۔ نشے باز اس غلط فہمی میں مبتلا ہوتے ہیں کہ یہ مشروب گرمیوں میں جگر وغیرہ کو ٹھنڈک پہنچاتا ہے لیکن بعض اوقات یہ مشروب جگر کے ساتھ ساتھ بندے کو بھی ٹھنڈا کر دیتا ہے اور نتیجے میں کفن دفن اور کرم کا انتظام کرنا پڑتا ہے۔ جھوڑے نے ہمیں دیکھتے ہی چھلانگ لگائی اور کوٹھوں کی طرف بھاگا۔ میں نے اُس کی دھوٹی کسی بڑے پرندے کی طرح پھڑپھڑاتے ہوئے دیکھی۔

”رک جاؤ!“ میں نے چلا کر کہا۔ 32 بور کا بھرا ہوا ریوالور میرے ہاتھ میں تھا۔ جھوڑا سنگھ نے میری آواز پر کان نہیں دھرا اور دوڑتا چلا گیا۔ میں نے تاک کر اُس کی ہڈی کو نشانہ بنایا۔ دھماکے کے ساتھ ہی وہ لڑکھڑا کر اوندے منہ دروازے کے پاس گرا اور بت کھول کر جلدی سے اندر گھس گیا۔ اندر سے کنڈی چڑھنے کی آواز ہمیں صاف سنائی دی..... ہم نے تین اطراف سے کوٹھوں کو گھیر لیا اور جھوڑے کو باہر آنے کی وارننگ دی۔ اندر مکمل خاموشی تھی۔ کوئی آہٹ کوئی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ قرب و جوار میں صرف ملنگ کی آواز تھی جو فائرنگ سے ڈر کر زمین پر گر پڑا تھا اور اب جان بخشی کے لیے سب انسپکٹر کی منت مانت کر رہا تھا۔

میرے اشارے پر دو ہیڈ کانسٹیبلوں نے ہوائی فائرنگ کی۔ چند گولیاں بند دروازے پر بھی برسائی گئیں۔ اس کے بعد میں نے بلند آواز میں ایک بار پھر جھوڑے اور اُس کے ساتھی کو باہر آنے کا کہا۔ چند لمحوں بعد دروازہ کھلا اور جھوڑا اپنے ساتھی سمیت ہاتھ اٹھائے باہر نکل آیا۔ اُس کا رنگ مٹی ہو رہا تھا۔ بائیں ہڈی خون سے رنگین تھی۔ میں دو کانسٹیبلوں کے ساتھ

لہنا بولا۔ ”آپ نے بڑا ٹھیک سوال پوچھا ہے جی..... کچی کھری بات یہ ہے کہ چوہدری شام سنگھ کی طرح مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ میں زرنجن کا دھڑن تختہ کر کے اُس سے ٹک چھین لیتا۔ اگر میں زرنجن کو ڈرا دھکا کر حصہ وصول کرنے کی کوشش کرتا تو بات بڑبڑ بھی سکتی تھی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ زرنجن ویسے ہی کہیں غائب ہو جاتا اس لیے میں خاموش رہا۔ مجھے پکا یقین تھا کہ آج نہیں تو کل چوہدری شام سنگھ زرنجن پر ہاتھ ڈالے گا..... اور جب وہ ہاتھ ڈالے گا تو میں بھی اپنا حصہ وصول کر لوں گا۔“

میں نے پوچھا۔ ”تمہارے خیال میں اب وہ ٹل کہاں ہے؟“
لہنا بولا۔ ”شام سنگھ نے اُسے حویلی میں کہیں چھپا رکھا ہوگا۔ ویسے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ معاملہ دیکھ کر اُسے کہیں غائب کر دیا گیا ہو۔“

اب وقت ضائع کرنا مناسب نہیں تھا۔ میں نے لہنا سنگھ سے چند مزید باتیں پوچھ کر گفتگو ختم کی اور فوراً امرتسر سے واپس ڈھاب روانہ ہو گیا۔ ڈھاب پہنچتے ہی ہم نے چوہدری شام کی حویلی کا رخ کیا۔ چوہدری شام اور اُس کا ایک بھائی گرفتار تھے۔ لہذا چوہدریوں کی اکڑوں بھی بہت کم رہ گئی تھی۔ میرے کہنے پر حویلی کی عورتیں پردے میں چلی گئیں اور ہم تلاشی کے لیے اندر گھس گئے۔ قریباً دو گھنٹے تک ہم نے پوری تسلی سے حویلی کے کونے کھدے دیکھے۔ اہل خانہ کی موجودگی میں صندوق الماریوں وغیرہ کے تالے کھولا کر بھی تلاشی لی گئی لیکن کام کی چیز ہاتھ نہیں آئی..... ہم قریباً مایوس ہو چکے تھے جب اچانک ٹل مل گیا۔ اُسے ڈھونڈنے والا میرا ایک مرل سا سپاہی تھا۔ اُسے چاولوں سے بھرے ہوئے ایک ٹکے پر ٹنگ گزرا۔ یہ ٹکا دوسرے برتنوں سے الگ ایک تنگ وتاریک کوٹھڑی میں رکھا تھا۔ اُس نے ہمت کر کے ٹکے کے چاول فرش پر اُلٹے تو نیچے سے سونے کا ٹل نکل آیا۔

ٹل کو دیکھ کر ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ وہ ایک طویل عرصہ زمین میں دفن رہا ہے۔ اُس کے کناروں پر تین طرف گھٹکرو سے بندھے ہوئے تھے۔ ایک طرف کے گھٹکر وگر چکے تھے..... موٹی زنجیر کا اب صرف ایک حلقہ باقی تھا۔ باقی معلوم نہیں یہ کس عبادت گاہ کا گھنٹہ تھا؟ کن کے ہاتھوں نے کس دور میں اُسے بنایا تھا، رکب یہ زمین بُرد ہوا تھا؟ ممکن تھا یہ کسی راجہ مہاراجے کے لاؤ لشکر کا حصہ ہو، کسی ہاتھی کے گلے میں جھولتا یا کسی چلتے پھرتے مندر میں سجایا جاتا ہو..... کسی کو کچھ پتہ نہیں تھا۔ اہم بات صرف ایک ہی تھی اور وہ یہ کہ یہ ٹل سونے کا تھا۔ سونا جس کے بدلے میں روپیہ ملتا ہے اور روپیہ جو اپنی پہچان آپ ہوتا ہے۔ جو کسی کا نہیں ہوتا اور سب کا ہوتا ہے جس کے لیے جان لی بھی جاتی ہے اور دی بھی جاتی ہے۔

تھی۔ زرنجن نے یہ زنجیر لاہور جا کر بیچ دی اور کئی ہزار نقد جیب میں ڈالے۔ قصبے پہنچ کر اُن نے وہ چھوٹی حویلی خریدی اور اُسے اچھی طرح سجا بنالیا۔ اب کریانے کی دکان پر بیٹھنا اُسے اچھا نہیں لگتا تھا۔ اُس نے دکان بیچ دی اور شہر میں آڑھت کرنے لگا۔ آڑھت تو بس ہمارے کی تھی جس کے پاس ڈھائی تین سیر سونا ہو اُسے ہاتھ پاؤں ہلانے کی کیا ضرورت ہوتی ہے۔ کچھ دنوں بعد اُس نے اپنی بیٹی کا بیاہ دھوم دھام سے کیا اور پھر اپنا بڑا ڈھونڈنے کی کوشش کرنے لگا۔

میں نے لہنا سنگھ سے پوچھا۔ ”تمہیں ان ساری باتوں کا کیسے پتہ چلا؟“
اُس نے کراہ کر پہلو کو تھوڑی سی حرکت دی اور بولا۔ ”اُن دنوں شام سنگھ سے میری ان بن نہیں ہوئی تھی۔ وہ اپنی ہر بات مجھے بتا دیا کرتا تھا۔ اُسے اپنے کسی مخبر کے ذریعے یہ پتہ لگ چکا تھا کہ زرنجن سنگھ کے پاس سونے کا ٹل ہے۔ تین سیر سونا کوئی معمولی شے نہیں تھی۔ چوہدری شام کئی بار سوچ چکا تھا کہ اس سونے پر ہاتھ صاف کیا جائے۔ یہاں تک کہ ایک بار اُس نے میرے سامنے ہی زرنجن کو قتل کرنے کی بات کی تھی۔ اُس وقت وہ نشے میں تھا۔ شاید اب وہ بات اُسے یاد بھی نہ ہو لیکن میں کچھ نہیں بھولا..... اب دو ہفتے پہلے جب زرنجن کا قتل ہوا تو میرا دھیان فوراً شام سنگھ کی طرف گیا۔ مجھے یقین تھا زرنجن کو مار کر ٹل غائب کرنے والا چوہدری شام سنگھ کے سوا اور کوئی نہیں..... تھا نیرا صیب! میں نے آپ سے وعدہ کیا تھا کہ جھوٹ نہیں بولوں گا۔ میں اپنا وعدہ نبھا رہا ہوں۔ اب شام سنگھ کو پھانسی کے تختے پر پہنچانا آپ کا کام ہے..... میں نے ایک دن شام سنگھ سے ملاقات کی اور اُسے صاف لفظوں میں کہا کہ بڑ کر تو ت اُس نے کی ہے وہ میری نظر میں ہے۔ اگر وہ چاہتا ہے کہ یہ بات پولیس تک نہ پہنچے تو میرا حصہ مجھے پہنچا دے۔ چوہدری شام اندر سے بہت آگ بگولہ ہوا لیکن اُس نے اپنا حصہ مجھ پر ظاہر نہیں ہونے دیا۔ کہنے لگا کہ وہ ایک دو روز میں جواب دے گا۔ تین چار روز بعد میں نے اُسے پھر پیغام بھیجا۔ میں نے اشاروں کنایوں میں پیغام بھیجا تھا۔ اُس نے بھی اشاروں کنایوں میں جواب دیا کہ ابھی ایک دو روز اور صبر کرو۔ اسی دوران مجھے پتہ چل گیا کہ شام سنگھ کی بیٹھک میں مجھے جان سے مارنے کا پروگرام بن گیا ہے۔ میں نے فوراً اُٹھانے آئے فیصلہ کیا مگر آپ تک پہنچنے سے پہلے ہی مجھے پکڑ لیا گیا۔“

میں نے لہنا سنگھ سے کہا۔ ”لہنا! ایک بات بتاؤ۔ جب تمہیں کئی مہینے پہلے ہی پتہ لگ چکا تھا کہ زرنجن سنگھ کے پاس سونا کا ٹل ہے اور شام سنگھ کی نظر اُس ٹل پر ہے تو تم نے خود اسے حاصل کرنے کی کوشش کیوں نہ کی؟“

میں نے اس خوبی ٹل کو ایک ہمز پوش میں لپیٹا اور احتیاط کے ساتھ اپنے پاس محفوظ کر لیا۔ میرا خیال ہے کہ میں یہاں آپ کو اس ٹل کی قیمت کا تھوڑا سا اندازہ کرادوں گا اگر اس کا وزن ڈھائی سیر بھی مان لیا جاتا (حالانکہ ڈھائی سیر سے کچھ زیادہ تھا) تو آج کل کے حساب سے وہ کم و بیش دس لاکھ روپے کا تھا..... اب سب سے اہم سوال یہ تھا کہ یہ ٹل کس کا اور کہاں سے ملا ہے؟ اور آیا لہنا سنگھ کا یہ بیان درست ہے کہ نرنجن سنگھ کو یہ ٹل کوئی بد نصیب چار پانچ روپے میں بیچ گیا تھا؟ اس سوال کا جواب اسی صورت میں مل سکتا تھا کہ ٹل کی سرعام نمائش کر دی جائے..... کوئی ایسی شے پولیس کے ہاتھ لگ جائے تو پھر اُس کا خدا ہی حافظ ہوتا ہے۔ یہ تو ہزاروں روپے کا سونا تھا۔ دو تین سو کی شے بھی اکثر گھڈے لائن لگ جاتی ہے اور پھر ڈھونڈنے سے بھی اس کا سراغ نہیں ملتا۔ اتنا قیمتی ٹل دیکھ کر میرے عملے میں سے کئی بندوں کے دل کچے کچے ہونے لگے تھے لیکن میری طبیعت کا بھی انہیں پتہ تھا۔ لہذا اپنی نیٹوں کو ٹھیک رکھنے کے سوا اُن کے پاس کوئی چارہ نہیں تھا۔ ٹل کی برآمدگی کا غدو میں درج کی گئی اور پھر اُسے قصبے کے چوراہے میں نمائش کے لیے رکھ دیا گیا۔ اس نمائش کا خاطر خواہ نتیجہ نکلا اور آدھ پون گھنٹے بعد ہی ایک شخص نے اُسے شناخت کر لیا۔ وہ قصبے کا ہی ایک رنگ ساز تھا۔ اُس کی دکان نرنجن سنگھ کی دکان کے پاس ہی تھی۔ وہ کچھ دیر ٹل کو ہاتھ میں لے کر اور اٹ پلٹ کر دیکھتا رہا پھر بولا۔

”تھانیدار صاحب! یہ ٹل تو میں نے عزیزے کے پاس دیکھا تھا۔“

میں بھونچکا رہ گیا۔ ”کس عزیزے کے پاس؟“

”وہی جی صغراں کا خاوند اللہ بخشے چاچے سلطان کا بیٹا۔“ رنگ ساز نے وضاحت کی۔

”کب دیکھا تھا؟“ سب انسپکٹر رشید نے تیزی سے پوچھا۔

وہ دماغ پر زور دینے لگا۔ ”بہی جی بیسا کھی سے ایک ڈیڑھ مہینہ پہلے کی بات ہے..... میں..... نرنجن سنگھ کی دکان پر ہی کھڑا تھا۔ وہاں عزیز اپنے چھوٹے کا کے کو گودی میں اٹھائے ہوئے آیا۔ اُس وقت عزیز کے پاس یہی ٹل تھا۔ اُس وقت ٹل کا رنگ کچھ کالا تھا اور مٹی وغیرہ بھی لگی ہوئی تھی۔ نرنجن نے اُسے جھاڑ کر تر اوز میں ڈالا تھا اور تول کرتین چار روپے کا بتایا تھا..... پھر میری اپنی دکان پر گاہک آگیا اور میں چلا گیا۔ پتہ نہیں بعد میں نرنجن اور عزیزے میں کیا بات ہوئی۔“

یہ ایک سنسنی خیز اطلاع تھی۔ یہ ہزاروں روپے کا ٹل اُس عزیزے کا تھا جس کی بیوی ایک ایک کوڑی کو ترس رہی تھی اور جو خود ٹل کے الزام میں جیل میں بند پڑا تھا۔ عزیزے نے

ٹل کہاں سے حاصل کیا اور وہ کیوں اُس کی اصلیت نہ جان سکا۔ یہ اور اس جیسے بہت سے سوالات ذہن پر یلغار کر رہے تھے۔ ان سوالوں کا جواب اس وقت صرف صغراں دے سکتی تھی۔ میں نے صغراں کی تلاش میں ادھر ادھر نگاہ دوڑائی لیکن وہ مجھے میں نہیں تھی۔ میں نے بلال شاہ سے کہا کہ وہ عزیزے کی بیوی کو فوراً گھر سے بلا کر لائے۔ بلال شاہ قریباً دس منٹ بعد واپس آیا۔ اس نے بتایا کہ عزیزے کی بیوی بچے گھر میں نہیں ہیں۔ دروازے پر تالا لگا ہوا ہے۔ اڑس پڑوس والوں کو بھی کچھ پتہ نہیں کہ وہ کہاں گئے ہیں اور کب آئیں گے۔

یہ صورت حال پریشان کن تھی۔ اس تنگدستی کی حالت میں صغراں کہاں جاسکتی تھی۔ اس کے پاس تو امرتسر پہنچنے کا کرایہ بھی نہیں تھا کہ خاوند سے جیل میں ملاقات کر سکتی۔ ذہن میں کئی غڈ غڈے سر اٹھانے لگے۔ صغراں جیسی عورتیں مایوسی کی حالت میں کبھی کبھار بڑے خطرناک کام کر جاتی ہیں۔ میرے ذہن میں ایک پرانے واقعے کی یاد تازہ ہو گئی۔ مصیبت کی ماری ایک ایسی ہی عورت نے اپنے پانچ بچوں سمیت امرتسر کی نہر میں کود کر خودکشی کر لی تھی۔ تین بچے تو صغراں کے بھی تھے۔ اُس کا خاوند جیل میں تھا اور وہ فاقوں سے لڑ رہی تھی۔ کہیں وہ بھی تو کسی ایسی ہی راہ پر نہیں چل نکلتی تھی..... میں نے اس شخص خیال کو فوراً ذہن سے جھٹک دیا اور بلال شاہ سے کہا کہ ہم ابھی اور اسی وقت امرتسر جا رہے ہیں۔ بلال شاہ تو پہلے ہی سیر سپائے کے لیے تیار رہتا تھا۔ ہم نے سرکاری جیب نکالی اور امرتسر روانہ ہو گئے۔ ایک ہیڈ کانسٹیبل بھی ساتھ تھا اور اس نے سونے کا ٹل ایک کپڑے میں لپیٹ کر گود میں رکھا ہوا تھا..... امرتسر روانہ ہونے سے پہلے میں نے سب انسپکٹر رشید کو ہدایت کر دی تھی کہ وہ صغراں اور اس کے بچوں کا پتہ کرے اور اگر وہ خود گھر واپس آجائیں تو انہیں کہیں جانے نہ دیا جائے۔

ہم امرتسر پہنچے اور وہاں سے جیل آ گئے۔ عزیز جو ڈیشنل ریمانڈ پر جیل میں تھا۔ میں نے اُس سے ملاقات کی اور اُسے کپڑے میں لپیٹا ہوا ٹل دکھایا۔ وہ حیران نظروں سے ٹل کو دیکھتا رہا اور پھر الجھے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”یہ مجھے کیوں دکھا رہے ہیں آپ؟“

میں نے کہا ”چند مہینے پہلے تم نے یہ ٹل نرنجن سنگھ کی یا نہ فروش کو بیچا تھا؟“ وہ اثبات میں کربلانے لگا۔ میں نے پوچھا۔ ”یہ کہاں سے ملا تھا تمہیں؟“

”اپنے گھر سے۔“ اُس نے جواب دیا۔

”کیا یونہی چار پائی پر رکھا مل گیا تھا؟“ میں نے طنز یہ لہجے میں پوچھا۔

اُس نے اپنے زخمی باز کو دوسرے بازو سے سہارا دیا اور زخمی ہوئی آواز میں بولا۔ ”یہ سنا کھی سے پہلے کی بات ہے جی۔ میں نے گھر میں ایک دیوار بنائی تھی۔ دیوار کے لیے بنیاد

کھودی ہوئی تھی۔ رات کو تیز بارش ہوئی اور بنیاد میں کیچڑ سا ہو گیا۔ میرا بڑا لڑکا پانچ سال کا ہے۔ وہ کھیلتا کھیلتا بنیاد میں چلا گیا اور وہاں کیچڑ سے یہ ٹل نکال لایا۔ دھو کر دیکھا تو یہ بیٹل نظر آیا۔ بچے ضد کرنے لگے کہ مٹھائی کھائیں گے۔ میں اسے زنجن کے پاس لے گیا اور چار روپے کی مٹھائی لے کر بچوں کو کھلا دی لیکن..... لیکن آپ مجھ سے یہ سب کیوں پوچھ رہے ہیں؟“

”تھی کوئی بات۔“ میں نے مختصر جواب دیا۔

عزیزے کی آنکھوں میں اب حیرانی اور سنسنی کے طے جلے جذبات تھے۔ کانپنی آواز میں کہنے لگا۔ ”جناب! کہیں یہ ٹل سونے وغیرہ کا تو نہیں؟“

”سونے کا نہیں ہیرے کا ہے۔“ میں نے سرد مہری سے جواب دیا اور اُس کے پاس سے واپس آ گیا۔

صفراں گھر میں نہیں تھی۔ ممکن تھا وہ خاوند سے ملاقات کے لیے جیل کا رخ کرتی۔ میں نے ہیڈ کانسٹیبل کو وہیں چھوڑ دیا اور اُسے ہدایت کی کہ وہ یہاں نگاہ رکھے اور اگر صفراں نظر آئے تو اُسے کہیں جانے نہ دے۔ جیل سے فارغ ہو کر میں نے ہسپتال کا رخ کیا۔ لہنا سنگھ کا حال احوال دریافت کرنا تھا۔ جب میں ہسپتال پہنچا تو لہنا سنگھ کی لاش بڑے دروازے کے قریب رکھی نظر آئی۔ وہ اسٹریچر پر پڑا تھا۔ جسم پر چادر کھینچ دی گئی تھی۔ میں نے اُسے اُس کے اکلوتے پاؤں سے پہچانا۔ ہسپتال پہنچنے کے بعد وہ پانچ روز موت و حیات کی کشمکش میں رہا تھا۔ آخر جان ہار گیا تھا۔

چوہدری شام سنگھ اب دو ہرے قتل کا ملزم تھا۔ لہنا سنگھ کے نزعی بیان اور حویلی سے ٹل کی برآمدگی کے بعد وہ پوری طرح بھنسن گیا تھا۔ بالکل صحیح کہا گیا ہے کہ سونا غارت گر ہوتا ہے۔ زنجن سنگھ کے بعد اب لہنا سنگھ بھی انجام کو پہنچا تھا اور یہ دونوں جاتے جاتے چوہدری شام کو بھی سورگ باشی کرنے کا انتظام کر گئے تھے۔ اُس کہانی والا معاملہ ہو رہا تھا جس میں تین دوستوں کو سونے کی اینٹ ملتی ہے۔ ایک دوست کھانا لینے جاتا ہے تو وہ اُسے قتل کرنے کا پروگرام بنا لیتے ہیں تاکہ اینٹ آدھی تقسیم ہو سکے۔ دوست کو ختم کر کے وہ اُس کا لایا ہوا کھانا کھاتے ہیں تو خود بھی انا لٹہ ہو جاتے ہیں۔

اب پورا نقشہ میری آنکھوں کے سامنے تھا۔ یہ بات بھی سمجھ میں آ گئی تھی کہ زنجن سنگھ صفراں اور اُس کے خاوند پر اتنا مہربان کیوں تھا۔ وہ جس دولت پر عیش کر رہا تھا وہ ایک طرف سے صفراں اور عزیزے ہی کی تھی۔ اُس کے دل میں آیا ہوگا کہ بہتی لنگا سے اگر وہ دونوں بھی

ہاتھ چمپے کر لیں گے تو کیا فرق پڑ جائے گا۔ اُس نے نہ صرف صفراں کو گھر میں نوکری دی بلکہ اس پر مہربانی بھی کرنے لگا۔ گھر میں کھانا زیادہ پکتا تھا اس لیے باقی کھانا صفراں لے جاتی تھی۔ اُس نے صفراں اور اُس کے بچوں کو کپڑے بھی سلوا کر دیئے۔ کسی وقت وہ عزیز کو نقد پیسے بھی دے دیتا تھا۔ صفراں اور عزیز اس سلوک پر خوش تھے۔ انہیں معلوم نہیں تھا کہ جس دریا کے قطرے سے اُن کی زبان گیلی ہو رہی ہے اُس کے سارے پانی پر اُن کا حق ہے۔

دوسری طرف لوگ زنجن سنگھ کے کردار پر شک کرنے لگے۔ خاص طور پر جب زنجن نے یہ کہا کہ وہ دوسری شادی کرے گا تو لوگوں کا دھیان خود بخود صفراں کی طرف چلا گیا۔ حالانکہ وہ زنجن کو چاچا کہتی تھی مگر بولنے والوں کی زبانوں کو کون روک سکتا ہے۔ وہ بولتے رہے اور قصبے میں یہ بات پھیلتی چلی گئی کہ صفراں سکھ ہو جائے گی اور زنجن اُس سے شادی کر لے گا۔

اب مسئلہ صفراں کو ڈھونڈنے کا تھا۔ وہ اپنا کوئی کھوج گھرا چھوڑ کر نہیں گئی تھی۔ سب انکسپکٹر رشید کی جگہ پتہ کر چکا تھا۔ کپور تھلہ اور چندری گڑھ میں بھی عزیزے اور صفراں کے رشتے دار تھے۔ وہاں سے بھی کوئی خیر کی خبر نہیں ملی تھی۔ میں نے ارد گرد کے دیہات میں موجود پولیس کے مخبروں کو ہوشیار کر دیا کہ وہ صفراں اور اُس کے بچوں کو تلاش کریں۔

لہنا سنگھ کے نزعی بیان کے بعد عزیزے کے خلاف درج ہونے والے کیس میں کوئی جان نہیں رہی تھی۔ یہ بات اب ثابت ہو گئی تھی کہ چوہدری شام نے زنجن کو اپنے پالتو غنڈے جھورے کے ہاتھوں مروایا تھا۔ زنجن کے معدے میں خواب آور دوا پائی گئی تھی جو اُسے کسی نے نہیں کھلائی تھی۔ یہ دوا اپنے معدے میں اتارنے والا وہ خود تھا۔ زنجن بیٹی سے محبت کرتا تھا۔ جب بیٹی بیاہ کر شوہر کے گھر چلی گئی تو وہ دکھی رہنے لگا۔ اپنے قتل سے تین چار روز پہلے تو وہ بہت پریشان تھا۔ دراصل اُس کی بیٹی شارداد اٹھ دس روز اُس کے پاس رہ کر سرسرا واپس گئی تھی۔ وہ بہت ادا سی محسوس کر رہا تھا۔ یقینی بات تھی کہ اُس نے پُرسکون نیند کے لیے وہ گولیاں کھالی تھیں۔ اسی رات جھورا بھی اپنے مشن پر پہنچ گیا۔ اُس کا مشن زنجن کو قتل کرنا نہیں صرف ٹل حاصل کرنا تھا۔ وہ ٹل زنجن نے بڑی حفاظت کے ساتھ گھر کی بالائی منزل پر لٹکایا تھا۔ ٹل تلاش کرتے کرتے جب جھورا اس کے کمرے میں پہنچا جہاں زنجن محو خواب تھا تو جھورے کی ٹھوکر سے زنجن کا حقہ گر گیا۔ کھٹکے سے زنجن کی آنکھ کھل گئی۔ دوا کے زیر اثر ہونے کے باوجود اُس نے ہمت کی اور جھورے پر جا پڑا۔ اُس نے جھورے کو اپنے مضبوط بازوؤں میں جکڑ لیا۔ ماضی میں وہ چندرا پہلوان کہلاتا تھا۔ اُس کے دونوں ہاتھ کسی

تالے ہی کی طرح مخالف کو پھانس لیتے تھے اور بے بس کر کے رکھ دیتے تھے۔ جھورے کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ اٹنے لینے کے دینے پڑ رہے تھے۔ ٹل بھی ملا نہیں تھا اور ٹل والے نے اپنا پکڑا تھا کہ چھوڑنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ تین چار منٹ تک جھورے اور نرنجن میں خوب کٹر مکش چلی۔ آخر جھورا اپنی کرپان نکالنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے بے دریغ نرنجن کے سینے پر وار کیے اور جب وہ گر گیا تو چھاتی پر چڑھ کر اُسے ذبح کر ڈالا۔

نرنجن کو موت کے گھاٹ اتارنے کے بعد جھورے کے سامنے کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ وہ پورے گھر میں آزادی سے دندناتا رہا اور آخر بالائی منزل کے ایک کمرے سے ٹل ڈھونڈنے میں کامیاب ہو گیا۔ نرنجن سے ہاتھ پائی کے دوران جھورے کی جیب سے کچھ ریزگاری بھی گری تھی۔ جھورا بہت تیز قسم کا عطر لگا تا اور بہت زیادہ مقدار میں لگا تا تھا۔ اس کے جسم سے عجیب سی بو اٹھتی رہتی تھی جسے وہ عطر میں چھپانے کی کوشش کرتا تھا۔ اس کی جیب سے گرنے والی ریزگاری میں اسی عطر کی خوشبو تھی۔ یوں عزیزے اور صغراں کا اس سارے معاملے سے کوئی تعلق ثابت نہیں ہوتا تھا۔ وہ شروع سے آخر تک بے قصور تھے بلکہ قانونی طور پر دیکھا جائے تو وہ ملزم کی بجائے مدعی تھے۔ مدفون اشیاء کے رائج قانون کے مطابق اگر برآمد ہونے والی چیز کی حیثیت آثار قدیمہ کی نہ ہو اور اس پر کسی کی ملکیت ثابت نہ ہوتی ہو تو وہ اُس شخص کی ملکیت تصور ہوگی جس کی زیر قبضہ اراضی سے وہ برآمد ہوئی ہو۔ اگر آثار قدیمہ کے معاملے میں تھوڑی سی رعایت کردی جاتی تو یہ ڈھائی سیر پکا سونا عزیزے اور صغراں کا تھا۔ نہ جانے کیوں مجھے محسوس ہوا کہ جیسے صغراں کے معصوم بچے نے وہی کام کیا تھا جو سینکڑوں برس پہلے ایک اور بچے نے صحرا میں ایڑی مار کر کیا تھا۔ اُس لقمہ ووق صحرا سے زمزم کا چشمہ پھوٹا تھا اور اس وقت غریبی کی پتی ہوئی دھوپ میں سونے کا ایک ٹل چکا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ اس بچے کے کم عقل ماں باپ خدا کی اس دین کو سمجھ نہیں سکے تھے اور انہوں نے دہلیز پر آئی ہوئی خوشحالی کو اپنی بے خبری کی بھینٹ چڑھا دیا تھا۔

میں نے صغراں اور اس کے بچوں کو تلاش کرنے کے لیے پورا زور لگا دیا۔ بلال شاہ بھی اس مہم میں پیش پیش تھا۔ چند روز بعد جب عزیز بھی ضمانت پر رہا ہو گیا تو تلاش کی سرگرمی اور بھی بڑھ گئی۔ قریباً دو ہفتے بعد ہمیں صغراں کا معمولی سا سراغ ملا۔ پتہ چلا کہ اُسے قریبی قصبے رام پورہ سے مدن وال کی طرف جاتے دیکھا گیا ہے۔ مدن وال کھتریوں کا ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ ڈھاب سے اُس کا فاصلہ پندرہ میل سے کم نہیں تھا۔ یہ کافی دشوار گزار راستہ تھا۔ ہم گھوڑوں پر سوار مدن وال پہنچے۔ وہاں کے سکھ نمبردار آشو سے ملاقات ہوئی۔ آشونے بنا:

”نرنجن کو موت کے گھاٹ اتارنے کے بعد جھورے کے سامنے کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ وہ پورے گھر میں آزادی سے دندناتا رہا اور آخر بالائی منزل کے ایک کمرے سے ٹل ڈھونڈنے میں کامیاب ہو گیا۔ نرنجن سے ہاتھ پائی کے دوران جھورے کی جیب سے کچھ ریزگاری بھی گری تھی۔ جھورا بہت تیز قسم کا عطر لگا تا اور بہت زیادہ مقدار میں لگا تا تھا۔ اس کے جسم سے عجیب سی بو اٹھتی رہتی تھی جسے وہ عطر میں چھپانے کی کوشش کرتا تھا۔ اس کی جیب سے گرنے والی ریزگاری میں اسی عطر کی خوشبو تھی۔ یوں عزیزے اور صغراں کا اس سارے معاملے سے کوئی تعلق ثابت نہیں ہوتا تھا۔ وہ شروع سے آخر تک بے قصور تھے بلکہ قانونی طور پر دیکھا جائے تو وہ ملزم کی بجائے مدعی تھے۔ مدفون اشیاء کے رائج قانون کے مطابق اگر برآمد ہونے والی چیز کی حیثیت آثار قدیمہ کی نہ ہو اور اس پر کسی کی ملکیت ثابت نہ ہوتی ہو تو وہ اُس شخص کی ملکیت تصور ہوگی جس کی زیر قبضہ اراضی سے وہ برآمد ہوئی ہو۔ اگر آثار قدیمہ کے معاملے میں تھوڑی سی رعایت کردی جاتی تو یہ ڈھائی سیر پکا سونا عزیزے اور صغراں کا تھا۔ نہ جانے کیوں مجھے محسوس ہوا کہ جیسے صغراں کے معصوم بچے نے وہی کام کیا تھا جو سینکڑوں برس پہلے ایک اور بچے نے صحرا میں ایڑی مار کر کیا تھا۔ اُس لقمہ ووق صحرا سے زمزم کا چشمہ پھوٹا تھا اور اس وقت غریبی کی پتی ہوئی دھوپ میں سونے کا ایک ٹل چکا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ اس بچے کے کم عقل ماں باپ خدا کی اس دین کو سمجھ نہیں سکے تھے اور انہوں نے دہلیز پر آئی ہوئی خوشحالی کو اپنی بے خبری کی بھینٹ چڑھا دیا تھا۔“

میں نے صغراں اور اس کے بچوں کو تلاش کرنے کے لیے پورا زور لگا دیا۔ بلال شاہ بھی اس مہم میں پیش پیش تھا۔ چند روز بعد جب عزیز بھی ضمانت پر رہا ہو گیا تو تلاش کی سرگرمی اور بھی بڑھ گئی۔ قریباً دو ہفتے بعد ہمیں صغراں کا معمولی سا سراغ ملا۔ پتہ چلا کہ اُسے قریبی قصبے رام پورہ سے مدن وال کی طرف جاتے دیکھا گیا ہے۔ مدن وال کھتریوں کا ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ ڈھاب سے اُس کا فاصلہ پندرہ میل سے کم نہیں تھا۔ یہ کافی دشوار گزار راستہ تھا۔ ہم گھوڑوں پر سوار مدن وال پہنچے۔ وہاں کے سکھ نمبردار آشو سے ملاقات ہوئی۔ آشونے بنا:

خود ہی تھا۔ میں نے گاؤں والوں سے دیر تک بات چیت کی لیکن صغراں کی اگلی منزل کے بارے میں کوئی نہ بتا سکا۔ صرف ایک شخص نے اتنا اشارہ دیا کہ وہ پیدل امرتسر جانے کا ارادہ رکھتی تھی۔ امرتسر وہاں سے کم و بیش تیس میل دور تھا۔ چلپاتی دھوپ میں معصوم بچوں کے ساتھ اتنا طویل سفر کوئی آسان کام نہیں تھا۔ وہ پیدل چل کر ایک ہفتے سے پہلے امرتسر نہیں پہنچ سکتی تھی۔ اُسے اس ”مدن وال“ گاؤں سے گئے تین روز ہوئے تھے۔ اس کا مطلب تھا اگر واقعی امرتسر کی طرف گئی ہے تو کہیں رام پورہ کے آس پاس ہوگی۔

ہم نے رام پورہ کا رخ کیا۔ راستے میں جگہ جگہ رک کر صغراں کے بارے میں پوچھتے بھی رہے۔ جوں جوں صغراں کے ملنے میں تاخیر ہو رہی تھی، میرے دل میں عجیب سے وسوسے گھر رہے تھے..... اس کی غربت و لاچاری آنکھوں کے سامنے گھومتی تھی اور میں خود کو قصور وار محسوس کرنے لگا۔ اور میں اکیلا قصور وار نہیں تھا اُس بے گناہ عورت کو اس حال تک پہنچانے میں کئی مردوں کا ہاتھ تھا۔ وہ مرد جس نے صغراں کو اپنی بہو تسلیم نہیں کیا تھا اور نتیجے میں اُسے اپنے شوہر کے ساتھ مل کر نیا گھر بسانا پڑا تھا۔ وہ کارخانے دار جس نے عزیزے کا ہاتھ ٹوٹنے پر اُس کے دوسرے ہاتھ میں بیس روپے تمھائے تھے اور چلتا کیا تھا۔ وہ مرد جنہوں نے زرنجن اور صغراں کے تعلق پر شک کیا تھا اور اس شک کی وجہ سے اُسے زرنجن کی قاتلہ ٹھہرایا تھا۔ اور پھر میں..... جس کے سامنے صغراں نے اپنے بچے کے سر پر ہاتھ رکھ کر اپنی اور شوہر کی بے گناہی کی قسم کھائی تھی مگر میں اُس پر اعتبار نہیں کر سکا تھا اور اب یہ حوالدار شیر سنگھ جسے گیدڑ سنگھ کہنے کو دل چاہ رہا تھا۔ مجھے اُس وقت بھی نوے فیصد یقین تھا کہ وہ بکواس کر رہا ہے۔ یقیناً اُس نے صغراں کے ساتھ کوئی نامناسب سلوک کیا ہے۔

جیسا کہ میں نے بتایا ہے راستے میں جگہ جگہ رک کر ہم صغراں کے بارے میں پوچھتے جا رہے تھے۔ ”باغاں والی“ یا ”بھاگاں والی“ ایک گاؤں کے قریب سے ہمیں پھر صغراں کا سراغ ملا۔ معلوم ہوا کہ صرف ایک روز پہلے ایک خستہ حال عورت اپنے تین بچوں کے ساتھ جامع مسجد کی میزبانی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اُس کا ایک بچہ سخت بیمار تھا اور کھینچ کھینچ کر سانس لے رہا تھا۔ عورت چادر میں منہ چھپائے روتی جا رہی تھی۔ اُس نے بتایا کہ وہ امرتسر جانا چاہتی ہے۔ ایک مقامی شخص فضل دین اپنا ریزہ ہالے کر رام پورہ کی طرف جا رہا تھا۔ اُس نے عورت سے کہا کہ وہ اُسے کچی سڑک پر اتار دے گا۔ ہم نے گاؤں میں فضل دین کو تلاش کر لیا لیکن وہ نہیں ملا۔ معلوم ہوا کہ وہ اس گاؤں کا نہیں۔ بس کبھی کبھار دودھ لے کر آتا ہے اور پھر کئی کئی روز شکل نہیں دکھاتا۔ میں نے ایک حلوائی سے فضل دین کے ٹھکانے کا پتہ کروایا۔

اپنے اے ایس آئی کو وہاں بھیج دیا۔ تھانے سے نکلے ہوئے اب ہمیں بارہ گھنٹے ہو چکے تھے۔ میرا واپس جانا ضروری تھا۔ گھوڑے بھی سارے دن کی بھاگ دوڑ سے نڈھال تھے۔ ڈوبتے سورج کی روشنی میں ہم نے اُن کے رخ موڑے اور دھکی چال چلتے ہوئے واپس ”ڈھاب“ روانہ ہو گئے۔

میں تھانے واپس پہنچا تو علاقے کے چند معتبر افراد وہاں آئے بیٹھے تھے۔ اُن میں ضلع جانیہر کا ایک نامی گرامی زمیندار عباس خان ویرو بھی تھا۔ عباس خان ویرو کی حیثیت جھوٹے مولے کا گیر دار کی تھی۔ شکار وغیرہ کا بے حد شوقین تھا۔ میں ویرو اور اُس کے ساتھیوں کو اپنے دفتر میں دیکھ کر حیران ہوا۔ بہر حال میری یہ حیرانی جلد ہی دور ہو گئی۔ یہ لوگ ایک نہایت ہی خاص مسئلے پر بات کرنے کے لیے میرے دفتر میں آئے تھے اور وہ مسئلہ تھا عزیزے کے مکان اور ارد گرد کے تین چار دوسرے مکان خریدنے کا۔ اُن لوگوں کے لیے یہ بالکل معمولی بات تھی کہ منہ مانگی قیمت پر یہ چند کوٹھے خرید لیتے..... وہ اس زمین پر قسمت آزمائی کرنا چاہتے تھے۔ اُن کی بات سمجھ میں آنے والی تھی۔ اس زمین سے اگر سونے کا ٹل نکلا تھا تو کچھ اور بھی نکل سکتا تھا۔ ممکن تھا یہ ٹل اس سامان کا ایک معمولی حصہ ہو جو یہاں دفن پڑا ہے..... اگر وہاں کھدائی کی جاتی تو یہ بالکل غیر قانونی بات تھی لیکن ایسے غیر قانونی کاموں پر قانون کے منافض کو تیار کرنا ویرو جیسے لوگوں کے بائیں ہاتھ کا کھیل۔ وہ یہ کھیل دکھانے کے لیے اپنی جیبیں نوٹوں سے اور لوڈ رکھتے ہیں۔ خان ویرو کی جیبیں بھی بھری ہوئی تھیں لیکن میں نے اُس کا ہاتھ ان جیبوں تک پہنچنے سے پہلے ہی مفلوج کر دیا۔ میں نے صاف کہہ دیا کہ میں کسی غیر قانونی حرکت کی اجازت نہیں دوں گا چاہے اس کے لیے مجھے کوئی سزا بھی بھگتنا پڑے۔ میرے دونوں لہجے نے عباس خان ویرو اور اُس کے ساتھیوں پر گھڑوں پانی ڈال دیا اور وہ بے نیل مرام واپس چلے گئے۔ اُس سے اگلے روز صغراں بھی مل گئی..... لیکن زندہ نہیں، لاش کی صورت۔ ہاں وہ مر چکی تھی۔ دو برس سے غربت کی چکی میں پس ہوئی عورت مر چکی تھی۔ ایک بدبودار ہسپتال کے جھلے ہوئے وارڈ میں وہ اپنے بیمار بچے کے بستر سے لگی لگی دم توڑ چکی تھی۔ اُس وقت اُس کے باقی دونوں بچے قریب ہی گرد آلود فرش پر سو رہے تھے۔ صغراں کیسے مری؟ اُسے دل کا دورہ پڑا ہوگا۔ دماغ کی کوئی نس پھٹی ہوگی یا سانس رک گئی ہوگی۔ یونہی تو کوئی نہیں مارتا لیکن کچھ لوگ مر بھی جاتے ہیں۔ ایک بادشاہ بھی تو اپنے بیمار جگر گوشے کے گرد بچہ لگاتا ہوا مر گیا تھا۔ مجھے لگا دکھوں کی ماری ہوئی صغراں نے بھی کوئی ایسا ہی عمل کیا ہوگا۔ اور نہ موت کا فرشتہ ایسا بھلکدو تو نہیں تھا کہ بیمار بچے کی جگہ تندرست ماں کی جان لے جاتا۔

صغراں کی لاش ڈھاب پتہنی تو پورا قصبہ اشک بار تھا۔ ان میں سکھ بھی تھے، ہندو بھی اور مسلمان بھی۔ ان سب لوگوں نے مل کر صغراں پر الزامات لگائے تھے اور پھر اُسے فاقوں کی دلدل میں ڈوبنے کے لیے تنہا چھوڑ دیا تھا۔ آج وہ سب مردوزن پشیمان تھے اور عزیزے کو دلا سے دے رہے تھے۔

”چپ کر جاعزیزے! خدا کو یہی منظور تھا۔“

”چپ کر جاعزیزے! وا بگرو کی یہی مرضی تھی۔“

”حوصلہ کر بھائی! بھگوان کی یہی اکشا تھی۔“

اور رونے والا روتا چلا رہا تھا، پکارتا جا رہا تھا۔ ”صغراں آنکھیں کھول..... آنکھیں کھول صغراں دیکھ اب ہم غریب نہیں..... دیکھ ہمارے پاس پیسے ہیں..... اب میں تیرے لیے جوڑیاں بنواؤں گا، تیرے بچوں کے لیے کپڑے سلواؤں گا..... اب مان جا صغراں.....“ اُس کی آواز پھیلتی اور گونجتی چلی جا رہی تھی..... لیکن جواب دینے والا کوئی نہیں تھا۔

باپ، بیٹی اور وہ.....

وہ سال کی سب سے چھوٹی رات کو پیدا ہوئی تھی، اس کی آنکھیں گہری نیلی تھیں۔ اس کے باپ کا دعویٰ تھا کہ وہ بڑی معصوم اور قسمت والی ہے اور اس سے دشمنی کرنے والا کوئی بد قسمت ہی ہو گا..... اور پھر ایسا ہی ہوا، ملزم کا دانتوں سے بھنبھوڑا ہوا زخم زخم وجود میرے سامنے بے جان پڑا تھا۔

چوہدری شام سنگھ اور جمہور اپنے انجام کو پہنچے۔ اپنے دوستا ہیوں سمیت اُن دونوں پر دہرے قتل کے الزامات ثابت ہوئے۔ 9 اکتوبر 1942ء کو علی الصبح پانچ بجے وہ چاروں ڈسٹرکٹ جیل کے احاطے میں پھانسی چڑھا دیے گئے..... عزیزا اپنے تینوں بچوں سمیت ”ڈھاب“ چھوڑ کر چلا گیا۔ اُس کے پاس اب معقول رقم تھی۔ وہ ساری زندگی بیٹھ کر کھا سکتا تھا۔ ڈھائی سیر سونے میں سے گورنمنٹ نے اپنے کچھ محصول وغیرہ کاٹے تھے۔ باقی رقم نقد عزیز کے حوالے کر دی گئی تھی۔ ان واقعات کے قریباً چھ ماہ بعد انتظامیہ کی زیر نگرانی ڈھاب میں تین چار جگہ کھدائی ہوئی لیکن کسی کو کھونا سکہ تک نہیں ملا۔ اگر کچھ ملا تو وہ لکڑی کی چندگی سڑی شہتیریاں تھیں یا مٹی کے برتنوں کے کچھ ٹکڑے تھے۔

ان واقعات کو ایک زمانہ گزر چکا ہے لیکن بلال شاہ کی طرح میری نگاہ میں بھی کبھی کبھی صغراں کا مُردہ چہرہ گھوم جاتا ہے۔ جو صغراں چلی گئی اُسے تو کوئی واپس نہیں لاسکتا تھا لیکن اس کہانی کے کردار آج بھی ہمارے ارد گرد موجود ہیں۔ آپ غور سے دیکھیں۔ کوئی نہ کوئی عزیزا نا کردہ گناہ کی سزا میں جیل بھگت رہا ہو گا۔ کوئی صغراں اپنے بھوکے بچوں کو بہلا بہلا کر سلا رہی ہو گی، کوئی چوہدری شام اپنی حویلی میں بیٹھ کر سازشوں کے جال بن رہا ہو گا..... صغراں کو آج بھی بچایا جاسکتا ہے کیونکہ صغراں آج بھی مشکل میں ہے۔

☆=====☆=====☆

ذہن میں بندھے ہوئے تھے۔ وہ خاصی پریشان نظر آرہی تھی۔ میں نے حیران ہو کر اے ایس آئی سے کہا۔ ”ارے بھئی، یہ تو اپنے ڈیوڈ صاحب کی صاحبزادی ہے۔ تم نے کہاں سے دھر لیا؟“

اب ریٹا کی آنکھوں میں باقاعدہ آنسو تیر رہے تھے۔ اُس نے کہا۔ ”انکل، آپ کا یہ اے ایس آئی نرا جانور ہے۔ بالکل تمیز نہیں ہے اسے۔ میں نے بہت کہا لیکن زبردستی مجھے لے آیا۔“

اس معاملے پر میرا حیران ہونا لازمی تھا۔ میں نے اے ایس آئی کو باہر جانے کا اشارہ کیا۔ پھر ریٹا کو کرسی پر بٹھایا اور جب سے رومال نکال کر دیا تا کہ وہ آنسو پونچھ سکے۔ وہ ذرا پرسکون ہوئی تو میں نے کہا۔

”ہاں اب بتاؤ، کیا بات ہے۔ اتنی رات گئے تم باغ میں کیا کر رہی تھی؟“
ریٹا کی اور میری عمر میں بہت زیادہ فرق نہیں تھا لیکن میں اُس کے والد کا دوست بھی تھا لہذا وہ مجھے انکل ہی کہتی تھی۔ کہنے لگی۔ ”انکل، ہم کالج کی کچھ سہیلیوں نے فلم دیکھنے کا پروگرام بنایا تھا۔ ٹکٹ نہیں ملے اس لیے مجبوراً نوے بارہ کا شو دیکھنے کا فیصلہ کیا۔ پروگرام کے مطابق میں ساڑھے آٹھ بجے باغ میں پہنچ گئی، لیکن اُن میں سے کوئی بھی نہیں آئی۔ میں نے ساڑھے نو بجے تک ”ویٹ“ کیا اور پھر واپس آنے ہی والی تھی کہ آپ کے مہاشے اے ایس آئی صاحب پہنچ گئے اور کہنے لگے۔

”یہاں بچہ پریشی کیا کر رہی ہو..... چلو تھانے.....“
میں نے بہت سمجھایا لیکن وہ تو کسی کو پہچانتا ہی نہیں۔“
میں نے معذرت کرتے ہوئے کہا۔ ”سوری ریٹا۔ نیا آیا ہے..... ورنہ تمہیں پریشانی نہ ہوتی۔ میں ابھی اُس سے کہتا ہوں کہ تم سے معذرت کرے۔“

وہ بولی۔ ”بس انکل..... معذرت کی ضرورت نہیں، میں فوراً گھر جانا چاہتی ہوں۔ پاپا جانی بہت پریشان ہوں گے۔“

میں نے کہا۔ ”کہو تو میں چھوڑ آتا ہوں۔“

وہ جلدی سے اٹھتے ہوئے بولی۔ ”ادو..... میں خود چلی جاؤں گی۔“

میرے کہنے پر اے ایس آئی ایک آٹو رکشالے آیا اور ریٹا اُس پر بیٹھ کر چلی گئی لیکن میں اُس کی طرف سے شک میں مبتلا ہو گیا۔ اُس کی کبھی ہوئی بات پر مجھے کچھ یقین نہیں آ رہا تھا۔ نو جوان لڑکیوں کا دل کرات کو آخری شو دیکھنا کوئی معمولی بات نہیں تھی اور اگر فرض محال

باپ اور بیٹی کی محبت ایک اصول محبت ہے۔ اس محبت کی جوشدت میں نے ریٹا اور اُس کے ڈیڈی میں دیکھی، کہیں نہیں تھی۔ میں اس عیسائی فیملی کو اچھی طرح جانتا تھا۔ امرتسر میں میری رہائش کے قریب ہی ان لوگوں کی کوٹھی تھی۔ ریٹا کے والد ڈیوڈ جیکسن ایک پیمپل کے مالک تھے۔ جوانی میں اُن کا کاروبار زوروں پر تھا۔ لاکھوں میں کھیلتے تھے۔ پھر بیوی مر گئی۔ کاروبار سے اُن کا دل اچاٹ ہو گیا۔ انہوں نے اپنی تمام تر توجہ اور محبت کا مرکز کم سن ریٹا کو بنالیا۔ انہوں نے ماں بن کر اُس کی پرورش کی اور زندگی میں اُسے کوئی کمی نہیں ہونے دی، اب ریٹا ایک اٹھارہ سالہ خوب روڈو شیزہ تھی۔ ڈیوڈ جیکسن کا کاروبار ختم ہو چکا تھا۔ مگر اب بھی اُن کے پاس اتنی دولت تھی کہ نہ صرف ریٹا بلکہ اُس کے ہونے والے بچے بھی آرام و آسائش کی زندگی گزار سکتے تھے۔ میرے سرکاری کوارٹر سے کوئی دو ڈھائی فرلانگ دور کشادہ سڑک پر اُن کی شاندار دو منزلہ کوٹھی تھی۔ اس کوٹھی میں ڈیوڈ صاحب اپنے بوڑھے ہندو ملازم گنگو، بیٹی ریٹا اور ایک سفید کتے کے ساتھ خاموشی اور سکون کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ جب میں اُن کی کوٹھی کے سامنے سے گزرتا تو کبھی کبھار اندر سے پیاؤ بچے کی خوبصورت آواز آتی۔ مجھے معلوم تھا یہ پیاؤ ڈیوڈ صاحب کی بیٹی بجاتی ہے اور وہ کھنٹوں بیٹھ کر سنتے رہتے ہیں۔ فارغ وقت میں یہ ڈیوڈ صاحب کا محبوب مشغلہ تھا۔

یہ ستمبر 1942ء کا واقعہ ہے۔ شاید ستمبر کا آخری ہفتہ تھا۔ رات کے کوئی دس بجے تھے۔ میرا نیا اے ایس آئی مشتاق چوہدری کمرے میں داخل ہوا۔ وہ اُس رات معمول کے گشت پر تھا۔ اُس نے مجھے بتایا کہ باغ رمانند سے اُس نے ایک مشکوک لڑکی پکڑی ہے۔ شاید گھر سے بھاگی ہوئی ہے۔ میں اے ایس آئی کے ساتھ دوسرے کمرے میں پہنچا..... میرے سامنے ریٹا کھڑی تھی۔ اُس نے اسکرٹ پہن رکھا تھا۔ پاؤں میں لمبی جرابیں تھیں اور بال

لیکن زیادہ حیرت کی بات یہ تھی کہ اُس کا بوائے فرینڈ اُس سے کم از کم بارہ سال بڑا تھا۔ میں نے قریب سے گزرتے ہوئے سُرخ رنگ کی گاڑی کا جائزہ لیا۔ وہ ایک ڈاکٹر کی گاڑی تھی۔ اس کا سفید گون اور اسٹیجہ سکوپ پچھلی سیٹ پر بڑا تھا۔ میں نے گاڑی کا نمبر نوٹ کیا اور جانے واپس آ گیا۔

مجھے مسٹر ڈیوڈ سے دلی ہمدردی محسوس ہو رہی تھی۔ اُن کی کُل کائنات ریٹا ہی تھی اور ریٹا جو راستہ اختیار کر رہی تھی وہ کسی طرح پسندیدہ نہیں تھا۔ میں نے رجسٹریشن آفس فون کیا اور گاڑی کا نمبر دے کر انہیں مالک کا نام و پتہ معلوم کرنے کی ہدایت کی۔ اگلے روز مجھے سُرخ کاروائے شخص کے تمام کوائف معلوم ہو گئے۔ وہ شہر کا ایک معروف ڈاکٹر تھا۔ میں نے پہلے بھی اُس کا نام سن رکھا تھا۔ اُس کا پورا نام مکن لال تیواری تھا۔

ڈاکٹر تیواری گورنمنٹ ہسپتال میں انچارج فزیشن تھا۔ اس کے علاوہ اُس کی پریکٹس بھی بہت اچھی چلتی تھی۔ خوب کما رہا تھا اور ابھی مزید ترقی کے امکانات تھے۔ یہ ڈاکٹر تیواری سے ریٹا کی شناسائی کیسے ہوئی؟ اچانک میرا ذہن ڈیوڈ جیکسن کی بیماری کی طرف چلا گیا۔ ڈیوڈ جیکسن بیمار ہو کر اسی ہسپتال میں داخل ہوئے تھے۔ پلک جھپکتے ہی ساری بات میری سمجھ میں آ گئی۔ یقیناً یہ معاملہ اُس ہسپتال سے شروع ہوا تھا۔ ڈیوڈ جیکسن پورے ڈھائی مہینے ہسپتال رہے تھے اور اس دوران زیادہ تر ریٹا ہی اُن کے بستر کے پاس نظر آتی تھی۔ غالباً یہ ڈاکٹر بطور انچارج فزیشن وہاں آتے جاتے تھے اور اس آمد و رفت میں وہ ریٹا کی طرف یا ریٹا اُن کی طرف یا دونوں ایک دوسرے کی طرف مائل ہو گئے۔ معاملہ مندوش تھا۔ ڈاکٹر کی عمر بتاتی تھی کہ وہ شادی شدہ ہوگا۔ اس کے علاوہ وہ دوسرے مذہب کا تھا۔ ریٹا کے ساتھ اُس کا میل جول کی طور مناسب نہیں تھا۔ میں نے سوچا کہ بات بگڑنے سے پہلے مجھے اپنے طور پر ریٹا کو سمجھانا چاہیے۔

☆=====☆=====☆

ایک روز میں مسٹر ڈیوڈ سے ملنے اُن کے گھر جا پہنچا اُس وقت سہ پہر کے ڈھائی بجے تھے۔ مجھے معلوم تھا ڈیوڈ صاحب لُنج کے بعد اور ڈاکٹر کی ہدایت کے باوجود شیریں کا ایک آدھ ہال چڑھا کر گہری نیند سو رہے ہوں گے۔ اور میں چاہتا بھی یہی تھا۔ میں اندر پہنچا تو ریٹا نے میرا استقبال کیا۔ وہ ڈھیلے ڈھالے لباس میں بال کھولے بڑی دلکش نظر آرہی تھی۔ سفید کتا ٹاکی گود میں اٹھکیلیاں کر رہا تھا۔ میرے پوچھنے پر ریٹا نے بتایا کہ پایا آرام کر رہے ہیں۔ کئی دیر ہو گئی ہے میں انہیں جگا دیتی ہوں۔ وہ برآمدے کی طرف بڑھی تو میں نے اُسے

ایسا تھا بھی تو، پھر اس کی سہیلیاں پہنچی کیوں نہیں تھیں۔ ساری نہیں ایک آدھ سہیلی تو آئی اور اے ایس آئی کا کہنا تھا کہ جب اُس نے دیکھا تو وہ اکیلی بیچ پر بیٹھی تھی۔ باغ قریباً خالی ہو چکا تھا اور ایک دو آوارہ لڑکے بھی اُس کے آجوباجو گھوم رہے تھے۔ مجھے شک گزرا کہ وہ کسی سے ”محبت“ وغیرہ کے چکر میں پڑ گئی ہے۔ شاید وہاں بیٹھی اپنے بوائے فرینڈ کا انتظار کر رہی تھی۔ ویسے کر سچین ہونے کے باوجود ریٹا زیادہ آزاد خیال لڑکی نہیں تھی۔ میں اُسے دو تین سال سے اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ ایک ذہین، لائق اور پختہ ذہن کی مالک طالبہ تھی۔ حال ہی میں اُس نے بڑے اچھے نمبروں سے انٹر کیا تھا اور اب پرائیویٹ طور پر بی ایس سی کرنے کا ارادہ رکھتی تھی۔

کالج میں داخلہ اس لیے نہیں لے سکی تھی کہ انہی دنوں اُس کے والد یعنی ڈیوڈ صاحب سخت بیمار ہو گئے تھے۔ انہیں معدے کا السر تھا وہ ہسپتال داخل ہوئے۔ وہاں اُن کے دو آپریشن ہوئے اور وہ کوئی ڈھائی ماہ بستر تک محدود رہے۔ ریٹا کا کردار اور خاص طور پر باپ سے اُس کا والہانہ پیار دیکھتے ہوئے مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ کسی ایسے چکر میں پڑ سکتی ہے لیکن کچھ بھی تھا بہر حال وہ جوان تھی اور جوانی کے اُس مرحلے میں تھی جہاں لڑکی یا لڑکا کتنا بھی پارسا ہو ان کے سوچنے کا انداز بدل جاتا ہے۔

شاید میں ریٹا کے متعلق اس واقعے کو کچھ دن بعد یکسر بھول جاتا لیکن ایک روز ایسا اتفاق ہوا کہ میں نئے سرے سے اس معاملے میں دلچسپی لینے پر مجبور ہو گیا۔ کوئی دس پندرہ روز بعد کی بات ہے۔ سہ پہر کا وقت تھا۔ میں کچھری روڈ سے گزر رہا تھا کہ اچانک میری نظر ریٹا پر پڑی۔ وہ ایک بس سے اتر کر تیز قدموں سے فٹ پاتھ پر چلی جا رہی تھی۔ اُس کا انداز مجھے خواہ مخواہ شبے میں ڈالنے لگا۔ میں اُس وقت سادہ لباس میں تھا لہذا اس بات کا خطرہ نہیں تھا کہ ریٹا مجھے فوراً دیکھ لے گی۔

میں نے اپنا موٹر سائیکل ایک طرف کھڑا کیا اور کچھ فاصلے سے ریٹا کے پیچھے چل دیا۔ وہ کوئی دو فرلانگ چل کر ایک ایرانی ریسٹوران کے سامنے رکی۔ یہ ایک فیشن ایبل ریسٹوران تھا۔ کار پارکنگ میں ایک سُرخ رنگ کی کار کے پاس ایک دراز قد شخص کھڑا تھا۔ اُس کی عمر اٹھائیس تیس سال کے قریب تھی۔ چوڑے شانے، مضبوط جسم اور سُرخ و سپید رنگت۔ وہ ایک وجہہ مرد تھا۔ ریٹا کی طرف دیکھتے ہی وہ مسکرایا۔ پھر دونوں باتیں کرتے ہوئے تیزی سے اندر چلے گئے۔

میرا شک اب یقین میں بدل چکا تھا۔ ریٹا عشق و محبت کے چکر میں پھنسی ہوئی تھی۔

روک لیا۔ ملازم گنگو نے ہمارے لیے لان ہی میں کرسیاں ڈال دیں اور خود چائے بنائے پڑ گیا۔ چند رکی باتوں کے بعد میں جلد ہی اصل موضوع پر آ گیا۔ میں نے ڈھکے چھپے لفظوں میں ریٹا کو بتا دیا کہ میں اُس کی مصروفیات سے آگاہ ہو چکا ہوں۔ اُس کے ہونٹ خشک ہو گئے اور آنکھوں میں پریشانی کروٹیں لینے لگی۔

میں نے کہا۔ ”دیکھو ریٹا! تم مجھے انکل کہتی ہو۔ مجھے بڑا مانتی ہونا؟“ اُس نے سارے سے اقرار میں سر ہلایا۔ میں نے کہا۔ ”یہ راستہ جو تم نے اختیار کیا ہے وہ ٹھیک نہیں۔ اس میں سوائے بدنامی اور جگ ہنسائی کے کچھ تمہارے حصے آنے والا نہیں۔ ذرا سوچو تمہارے بچے جانی بیمار ہیں۔ جب انہیں پتہ چلے گا کہ اُن کی لازلی بیٹی اُن کی بیماری کا فائدہ اٹھا کر یہ کھیل کھیل رہی ہے تو اُن کے دل پر کیا گزرے گی..... میں سمجھتا ہوں ابھی بھی کچھ نہیں بگڑا۔ تم اس راستے سے با آسانی واپس آ سکتی ہو۔ کوئی ایسا راستہ اپناؤ جس میں تمہاری عزت بڑے اور تمہارے پاپا جانی کا نام بھی روشن ہو۔ انہیں تم سے بڑی امیدیں ہیں۔ اس طرح اُن کی آرزوؤں کو خاک میں نہ ملاؤ.....“

ریٹا خاموشی سے میری باتیں سنتی رہی۔ پھر چہرہ ہاتھوں میں چھپا کر سسکیوں سے رونے لگی۔ اُس کے سینے میں جیسے طوفان مچل رہے تھے۔ اس دوران گنگو چائے لے آیا۔ ریٹا نے جلدی جلدی آنسو پونچھ کر چائے بنائی اور خود کو نارمل ظاہر کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ گنگو چلا گیا تو میں نے ریٹا سے پوچھا۔

”کیا میں امید رکھوں کہ تم میری باتوں پر غور کرو گی؟“

ریٹا بے دردی سے اپنا نچلا ہونٹ دانتوں سے کاٹ رہی تھی۔ شاید اُسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ میرے سوال کا کیا جواب دے۔ وہ زبردست الجھن کا شکار نظر آتی تھی۔ دفعتاً برآمدے میں کال بیل کی آواز گونجی۔ گنگو بھاگ کر گیا اور ایک سانولے سے درمیانے قد کے نوجوان کو لے کر اندر آ گیا۔ نوجوان نے چیک دار بوشرٹ اور سفید پتلون پہن رکھی تھی۔ آنکھوں پر سیاہ چشمہ تھا جو اُس نے اندر داخل ہوتے ہی اتار لیا تھا۔ وہ بنگال کا رہنے والا لگتا تھا۔ اُسے دیکھتے ہی ریٹا بری طرح چونک گئی۔ جلدی سے کھڑی ہو کر بولی۔

”آئیے بابو جی، کیسے آنا ہوا؟“

بابو بھائی نے ایک نگاہ غلط مجھ پر ڈالی۔ پھر بولا۔ ”تمہیں بلایا ہے سخت پریشان ہیں۔ آج ہسپتال بھی نہیں گئے۔“

پھر نہ جانے ریٹا نے اُسے کیا اشارہ کیا۔ وہ اچانک خاموش ہو گیا۔ ریٹا اُسے لے کر

بیٹ کی طرف چلی گئی۔ دونوں مدھم لہجے میں کچھ دیر باتیں کرتے رہے۔ پھر ریٹا الجھی ہوئی بیٹ کی طرف آئی۔ کہنے لگی۔ ”انکل مجھے ایک ضروری کام سے جانا ہے۔ میں پاپا جانی کو جگا دیتی ہوں۔ آپ اُن کے پاس بیٹھیں۔“

میں اس کا اشارہ سمجھتے ہوئے بولا۔ ”نہیں بھئی! اب میں بھی جا رہا ہوں۔ ایک دو دن میں پھر آؤں گا۔ میری طرف سے اُن کی خیریت دریافت کرنا۔“

”جینک یو انکل۔“ ریٹا نے افراتفری میں کہا۔ وہ میرے ساتھ گیٹ تک آئی۔ جونہی میں نے اپنے کوارٹر کا رخ کیا وہ بنگالی بابو کے ساتھ ایک سفید کار میں بیٹھ کر روانہ ہو گئی۔ ریٹا نے مجھے کچھ نہیں بتایا تھا لیکن نووارد شخص کی گفتگو سے میں سمجھ گیا تھا کہ وہ ریٹا کے لیے ڈاکٹر تیواری کا پیغام لے کر آیا ہے اور اب ریٹا اُس کی طرف گئی ہے۔ پیغام لانے والے اس شخص کو میں پہلے بھی کہیں دیکھ چکا تھا۔ شاید ہسپتال میں مسٹر ڈیوڈ کے بستر کے پاس۔ یہ شخص پہلی نظر میں مجھے اچھا نہیں لگا تھا۔ اس کی آنکھوں میں عجیب طرح کی مکاری تھی اور زبان فینچی کی طرح چلتی تھی۔

جو تھے پانچویں روز مجھے تھانے کے پتے پر ایک رجسٹرڈ خط ملا۔ عموماً گمنام مخبر ایسے خط بھیجتے ہیں۔ میں نے لفافہ چاک کیا تو یہ ریٹا کا خط نکلا۔ تین چار صفحات پر مشتمل اس خط میں کہیں بھی ریٹا کا نام نہیں تھا تاہم صاف ظاہر تھا کہ یہ ریٹا ہی کی تحریر ہے۔ اُس نے لکھا تھا۔

”انکل! مجھے افسوس ہے پرسوں میں آپ کے سوالوں کا صحیح جواب نہ دے

سکی۔ میں اپنے رویے پر شرمندہ ہوں اور اُن باتوں پر بھی شرمندہ ہوں جو اب آپ سے کرنے جا رہی ہوں۔ پتہ نہیں مجھے ایسی باتیں آپ کو لکھنی چاہئیں یا نہیں لیکن کیا کروں کوئی ایسا ہمدرد بھی تو نظر نہیں آتا۔ جس سے دل کا حال بیان کر سکوں اور جو مجھے کوئی صحیح مشورہ دے سکے۔ ایک دوست انکل کی حیثیت سے میں سب کچھ آپ کو بتا دینا چاہتی ہوں..... انکل میں نے ڈاکٹر تیواری کو سب سے پہلے پاپا جانی کے سر ہانے اُن سے باتیں کرتے دیکھا تھا۔ میں اُن کی شخصیت سے بے حد متاثر بلکہ مجرب ہوئی۔ آنے والے دنوں میں پسندیدگی کا یہ احساس بڑھتا گیا لیکن یہ احساس صرف پسندیدگی تک ہی محدود تھا۔ پھر پاپا جانی کا پہلا آپریشن ہوا۔ بھاگ دوڑ کے اُن دنوں میں ڈاکٹر تیواری نے ہر طرح ہماری مدد کی اور اپنے خلوص سے ہم لوگوں کے دل جیت لیے۔

بعد میں پاپا جانی کا دوسرا آپریشن کرنا پڑا۔ اُن دنوں ہماری پریشانی عروج

پر پہنچ چکی تھی۔ کچھ سمجھ نہیں آتی تھی کیا کریں۔ کچھ عزیزوں کا خیال تھا کہ یہاں علاج ٹھیک نہیں ہو رہا۔ پاپا جانی کو دوسرے ہسپتال شفٹ کیا جائے۔ کچھ کا خیال تھا کہ بیرون ملک لے جایا جائے۔ کچھ کہتے تھے کہ آپریشن کی ضرورت ہی نہیں۔ گھر میں چار دن کھاپی کر بالکل ٹھیک ہو جائیں گے۔ پریشانی اور کشمکش کے اس دور میں ڈاکٹر تیواری نے قدم قدم پر میرا ساتھ دیا..... اپنے گھر کے ذاتی فرد کی طرح پاپا کی دیکھ بھال کی..... ہم دونوں بتدریج ایک دوسرے کے قریب آ گئے..... یہاں میں اپنی غلطی کا اعتراف کرتی ہوں..... مجھے پتہ بھی نہ چلا کہ کب میرے دل میں تیواری صاحب کے لیے جگہ پیدا ہو گئی ہے۔ جان پہچان تو ہو ہی چکی تھی۔ اب دوستی کا آغاز ہوا..... اور یہ دوستی تھوڑے ہی دنوں میں محبت میں بدل گئی۔

پاپا جانی ہسپتال سے فارغ ہو گئے لیکن ڈاکٹر تیواری سے اُن کا دل کچھ ایسا لگا کہ انہوں نے انہیں اپنا مستقل فیملی ڈاکٹر بنا لیا۔ ڈاکٹر تیواری وقتاً فوقتاً ہمارے گھر آنے لگے۔ ہم دونوں جانتے تھے کہ ہم ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں لیکن اظہار تک نوبت نہیں آئی تھی اور شاید کبھی نہ آتی۔ کیونکہ تیواری اس قدر شریف النفس ہیں کہ شاید آپ گمان بھی نہیں کر سکتے۔ اُن کی شائستگی اُن کے جذبے پر ہر وقت حاوی رہتی ہے۔ ایک روز بابو بھائی کی زبانی مجھے پتہ چلا کہ ڈاکٹر صاحب کی ٹرانسفر ہر..... میں ہو رہی ہے۔

شاید آپ بابو بھائی کے بارے میں نہیں جانتے۔ بابو بھائی ڈاکٹر تیواری کے عزیز ترین دوست ہیں اور اسی ہسپتال میں اکاؤنٹس کے شعبے میں ہیں۔ میرے پوچھنے پر انہوں نے بتایا کہ ڈاکٹر تیواری اپنی ڈیوٹی سے بہت لاپرواہی برت رہے ہیں اور ہفتوں تک ہسپتال کا رخ نہیں کرتے۔ اُن کی پریکٹس بھی دن بدن کم ہوتی جا رہی ہے۔ سگریٹ نوشی کے علاوہ شراب نوشی بھی شروع کر دی ہے..... اور ان تمام مشکلات کی وجہ میں ہوں۔ میں بابو بھائی کی اس بات پر حیران رہ گئی۔ بابو بھائی نے کہا۔

”رہا! تم اور صرف تم تیواری کو اس دلدل سے نکال سکتی ہو۔ میں اُس کا دوست ہوں۔ اُس کے دل میں جھانک سکتا ہوں..... وہ تمہاری محبت میں گرفتار ہے۔ وہ تمہیں چاہتا ہے۔ اُس کی چاہت کی وجہ یہ ہے کہ اُس کی زندگی میں ہر

طرف اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ اُس کی بیوی ہرگز اُس کے لائق نہیں۔ وہ ایک مغرور اور بد مزاج عورت ہے۔ وہ تیواری کو گھریلو سکون دے سکتی ہے اور نہ ہی ذہنی خوشی۔ وہ بیوی بچوں میں رہ کر بھی تنہا ہے۔ ازدواجی زندگی کی بچی خوشی سے کوسوں دور ہے۔ اگر تم اُسے سہارا دو تو اُس کی ڈانواں ڈول زندگی بچ سکتی ہے ورنہ آج کا معروف ڈاکٹر کل کا بے کار انسان بن جائے گا اور شاید آئندہ سالوں میں کسی کو اُس کا نام بھی یاد نہ رہے۔“

بابو بھائی کے کہنے پر میں خود ڈاکٹر تیواری کو دیکھنے گئی جو کچھ سنا تھا وہ درست تھا۔ اُن کی حالت دیکھ کر میرے آنسو نکل آئے۔ میں نے اُسی وقت اپنے دل سے عہد کر لیا کہ آج کے بعد کم از کم میری طرف سے ڈاکٹر تیواری کو کوئی دکھ نہ پہنچے گا۔ میں دیر تک اُن کے پاس بیٹھی بائیں کرتی رہی اور جب وہاں سے اٹھی تو، میں سمجھتی ہوں اُن کی زندگی کا رخ بدل چکا تھا۔ بلکہ ہم دونوں کی زندگی کا رخ بدل چکا تھا۔

انگل! میں اعتراف کرتی ہوں کہ وقتاً فوقتاً ڈاکٹر تیواری سے ملتی رہتی ہوں۔ کبھی کبھار وہ پاپا جانی کو دیکھنے آ جاتے ہیں..... میں جانتی ہوں کہ میرے لیے یہ سب کچھ نقصان دہ ہے، لیکن گاڑ جانتا ہے..... میرے بس میں اب کچھ نہیں رہا۔ انگل جب میں یہ الفاظ لکھ رہی ہوں تو میری آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں۔ میں ڈاکٹر تیواری سے محبت کرتی ہوں۔ اتنی زیادہ کہ اب میرا دل کوئی رکاوٹ قبول نہیں کرتا نہ کوئی نقصان مجھے ڈراتا ہے اور نہ کوئی نصیحت مجھ پر اثر کرتی ہے۔

انگل! میں آپ سے معافی مانگتی ہوں جن کا دل کسی نہ کسی طرح میں توڑ رہی ہوں اور جن کی توقعات پر میں پوری نہیں اُتر رہی۔ امید ہے میری مجبوری سمجھ کر آپ مجھے معاف کر دیں گے۔“

رہا کے اس خط نے صورت حال بہت حد تک واضح کر دی۔ ڈاکٹر تیواری واقعی ایک بدکش اور وجہیہ آدمی تھا۔ ایسے لوگوں کے لیے صنفِ نازک کے دل میں گھر کرنا چنداں مشکل نہیں ہوتا لیکن اپنے تئیر نظر کے لیے اُس نے جو شکار منتخب کیا تھا وہ کسی طور مناسب نہیں تھا۔ اٹھارہ انیس برس کی ایک ادھ کھلی کھلی جس کی آنکھوں میں مستقبل کے سہانے خواب تھے۔ جس نے ابھی زندگی کے میدان میں کئی معرکے سر کرنے تھے اور جو ایک بوڑھے باپ کی

بہر حال اس خط سے مجھے یہ بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ مسٹر ڈیوڈ اس معاملے سے بالکل بے خبر نہیں ہیں۔ اُن جیسا جہاندیدہ آدمی بے خبر رہ بھی نہیں سکتا تھا۔ یقیناً یہ ریٹا سے اُن شہید اور غیر مشروط محبت تھی جو انہیں چپ رہنے پر مجبور کر رہی تھی۔ ایک طرح سے یہ اس عیسائی فیملی کا ذاتی معاملہ بن جاتا تھا اور کسی طرح بھی قابل دست اندازی پولیس نہیں تھا۔ میں نے اس بارے میں ایک روز مسٹر ڈیوڈ سے سرسری سی بات کی لیکن جب اندازہ ہوا کہ وہ اس موضوع کو چھیڑنا نہیں چاہتے تو مکمل خاموشی اختیار کر لی۔

☆=====☆

مجھے اس معاملے سے کہیں زیادہ ضروری معاملات درپیش تھے لہذا میرا دھیان پھر کئی ہفتوں تک ریٹا اور مسٹر ڈیوڈ کی طرف نہیں گیا۔ ہاں کبھی کبھار اُڑتی ہوئی سی بات کانوں میں ضرور پڑ جاتی تھی۔ سیکنڈل خوبصورت لڑکی کا ہو تو افواہوں کو عقاب کے پر لگ جاتے ہیں۔ ایسی ہی تیز رفتار افواہیں چاروں طرف گردش کرتی پھرتی تھیں۔ بے ہودہ افسانے گھڑے اور سنائے جا رہے تھے۔ ایک روز میرے ایک حوالدار نے بتایا کہ اُس نے خود اپنی آنکھوں سے ڈاکٹر تیواری کی سُرُخ کار ریلوے لائن کے پار درختوں میں کھڑی دیکھی ہے۔ اُس میں تیواری اور ریٹا موجود تھے۔ جب کچھ لڑکے کار کی طرف گئے تو تیواری کار چلا کر لے گیا۔ چند دن بعد میرے ایک مخبر نے بتایا کہ اُس نے آدھی رات کے وقت تیواری صاحب کو دکھاوا دیا تو سہارا دے کر اپنی کار سے باہر نکال رہے تھے۔ پھر وہ اُسے سہارا دے کر اُس کے گیت تک چھوڑ گئے۔ ریٹا سے چلا نہیں جا رہا تھا وہ بڑی مشکل سے قدم اٹھا رہی تھی۔ ایسی ہی بے شمار الٹ پلٹ باتیں سننے میں آرہی تھیں۔ وہ برسات کے دن تھے ایک روز میں دوتی کے رشتے سے مجبور ہو کر مسٹر ڈیوڈ کے گھر پہنچا۔

انہوں نے حسب معمول بستر پر لیٹے لیٹے نہایت خندہ پیشانی سے میرا استقبال کیا۔ میری نگاہیں شرمندگی سے جھکی ہوئی تھیں لیکن اُن کے چہرے پر خجالت کے کوئی آثار نظر نہیں آتے تھے۔ نہ ہی اُن کے لہجے سے کسی پیشانی کا پتہ چلتا تھا۔ کوئی اور انہیں اس حالت میں دیکھتا تو سمجھتا کہ وہ بالکل نارمل ہیں اور اپنے افسوس ناک حالات پر انہیں کسی قسم کا دکھ نہیں لیکن میں انہیں اچھی طرح جانتا تھا۔ مجھے معلوم تھا وہ بہت گہرے انسان ہیں۔ اُن کے دل میں سمندر بھی ہوتا ہے تو آنکھوں میں قطرہ نہیں آتا تھا۔ انہوں نے حسب معمول ریٹا کو آواز دی۔

”ریٹو، دیکھو یہ کون آیا ہے؟“

اُن کی آواز سن کر ریٹا ایک نیپکین سے ہاتھ صاف کرتی دروازے پر نمودار ہوئی۔ مجھے کچھ کر ایک لمحے کو تنگی۔ پھر ”ہیلو انکل“ کہہ کر مسکراتی ہوئی ہمارے پاس بیٹھ گئی۔ وہ شاید باورچی خانے میں مصروف تھی۔ ماتھے پر پسینہ تھا اور ہاتھوں پر سفید لگا ہوا تھا۔ ڈیوڈ صاحب چاہتے تو ایک چھوڑ دس نوکر رکھ سکتے تھے لیکن گنگو کے سوا اُن کے گھر میں کبھی کوئی ملازم نہیں آیا۔ اس کی وجہ ریٹا ہی تھی۔ وہ گھر کا سارا کام اپنے ہاتھوں سے کرتی تھی۔ خاص طور پر اپنے پاپا جانی کے کسی کام کو تو وہ دوسرے کا ہاتھ نہیں لگنے دیتی تھی۔ کھانے پینے سے لے کر اُن کے اوڑھنے بچھونے اور پہننے اتارنے تک وہ ہر کام خود بخود انجام دیتی تھی۔ شدید بیماری کی حالت میں میں نے اُسے ڈیوڈ صاحب کو بول براز کراتے تک دیکھا تھا۔ کوئی بیٹی اپنے باپ کے اتنا قریب کب ہوگی؟..... اس وقت بھی وہ گھر کے کام کاج سے ہلکان ہو رہی تھی۔ ڈیوڈ صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”ریٹو! ان کو کوئلہ ڈرنک پلاؤ۔ گرم شربت سے تو یہ کوسوں دور بھاگتے ہیں۔ ورنہ ایک آدھ جام ہو جاتا۔“

ریٹا مسکراتی ہوئی ابھی اور باہر چلی گئی۔ میں دیر تک ڈیوڈ صاحب کی خاموش گہری آنکھوں میں دیکھتا رہا۔ آخر میں نے کہا۔ ”ڈیوڈ صاحب! میرے لیے کوئی خدمت ہو تو بتائیں۔“

ڈیوڈ صاحب میرے معنی خیز لہجے کا مقصد سمجھ رہے تھے۔ کہنے لگے۔ ”نو تھینک یو۔ اٹ ازل رائٹ۔“

میں نے کہا۔ ”ڈیوڈ صاحب! یہ پولیس کیس نہیں ہے لیکن ہو بھی سکتا ہے۔ ڈاکٹر کو کوئی حق نہیں پہنچتا کہ وہ اپنے سے بارہ سال چھوٹی ایک لڑکی کو ورغلائے اور اُس کے لیے اور اُس کے والدین کے لیے بدنامی کا باعث بنے۔ خاص طور پر ایسی صورت میں کہ وہ خود شادی شدہ اور دو بچوں کا باپ ہے۔“

ڈیوڈ صاحب نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ ”نواز ڈیئر! تمہاری ہمدردی کا بہت شکریہ۔ میں تو صرف ایک بات جانتا ہوں۔ جو میری ریٹو سے دعا کرے گا وہ کبھی سزا سے نہیں بچے گا۔ تم نے ریٹا کی آنکھیں دیکھی ہیں؟ وہ گہری نیلی ہیں اور وہ سال کی سب سے چھوٹی رات کو پیدا ہوئی تھی یعنی 22 جون کی رات۔ ہمارے بزرگوں کا عقیدہ رہا ہے کہ 22 جون کی رات پیدا ہونے والا بچہ جس کی آنکھیں نیلی ہوں بڑا قسمت والا ہوتا ہے۔ ریٹو بھی

بڑی قسمت والی ہے۔ اس سے دشمنی کرنے والا کوئی بد قسمت ہی ہو سکتا ہے۔“

مجھے معلوم تھا ڈیوڈ صاحب کبھی کبھی مذہبی اور روایتی باتیں بھی کرتے ہیں۔ میں نے کہا۔ ”آپ کا عقیدہ اپنی جگہ ٹھیک ہے لیکن..... ڈیوڈ صاحب یہ ایک کمزور لڑکی کا معاملہ ہے۔ اُسے ہماری مدد اور مشوروں کی ضرورت ہے.....“

اس سے پہلے کہ میں کچھ اور کہتا ریٹا چائے کی ٹرے اٹھائے اندر داخل ہوئی اور ہم خاموش ہو گئے۔ پھر جتنی دیر میں وہاں رہا بس رسی باتیں ہوتی رہیں۔ ان باتوں کے دوران میں نے محسوس کیا کہ بے شک ڈیوڈ صاحب اور ریٹا کے چہروں سے کوئی الجھن ظاہر نہیں ہوئی مگر دلون کی آب و ہوا بدلی بدلی تھی۔ باپ بیٹی کا بے مثال رشتہ اپنی جگہ قائم و دائم تھا لیکن اس رشتے کے خشے پر کوئی دھند سی ضرور چھائی ہوئی تھی۔

میں مسٹر ڈیوڈ سے مل کر واپس آیا تو دل پر ایک بوجھ سا تھا۔ نگاہوں میں مسٹر ڈیوڈ کا باہمت اور مُردار چہرہ گھوم رہا تھا۔ کیسا عجیب باپ تھا وہ؟ بیٹی کی دی ہوئی ندامت کو بھی اُس کا تحفہ سمجھ کر ماتھے پر سجا رہا تھا۔ اُس کے دیئے ہوئے دکھوں کو اُس کی محبت کا ایک حصہ سمجھ رہا تھا۔

پھر مسٹر ڈیوڈ سے اس ملاقات کو پانچ چھ ہفتے گزر گئے۔ ایک روز شام کے وقت میں تھانے پہنچایا تھا کہ ٹیلی فون کی تھنٹی بجنے لگی۔ میرے اے ایس آئی نے ریسپورٹ اٹھایا اور مجھے بتایا کہ میری کال ہے۔ میں نے ریسپورٹ کان سے لگایا تو دوسری طرف سے مسٹر ڈیوڈ کی نہایت گھبرائی ہوئی آواز آئی۔

”ہیلو مسٹر نواز! وہ تھینکس گاڈ۔ خدا کا شکر ہے تم مل گئے مجھے اس وقت تمہاری مدد کی شدید ضرورت ہے پلیز..... کسی طرح ریٹو کرو۔ وہ پستول لے کر گئی ہے۔ وہ کچھ کر بیٹھے گی۔“ فون پر اُن کے ہانپنے کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔

میں نے کہا۔ ”ڈیوڈ صاحب! آپ مجھے اطمینان سے بتائیں، کیا بات ہے؟“ وہ بولے۔ ”میں تمہیں سب کچھ بتا دوں گا نواز خان۔ اس وقت تم اس کو روکو۔ وہ موٹر رکشا پر بیٹھ کر گئی ہے۔ رکشا نمبر 988 ہے۔ وہ ابھی زیادہ دور نہیں گیا ہے..... تم موٹر سائیکل پر جاؤ تو پرل ٹاکیز (سینما) کے آس پاس اُسے پکڑ لو گے۔ پلیز جلدی کرو۔ اُسے ہر صورت میں روکنا ہے۔“

میں نے پوچھا۔ ”اُسے جانا کہاں ہے؟“

وہ تیزی سے بولے۔ ”الیکزانڈر اگر اوٹنڈ۔“

میں سمجھ گیا کہ وہ ڈاکٹر تیواری کی طرف گئی ہے۔ ڈاکٹر تیواری کا کلینک الیگز انڈرا ٹراؤنڈ کے پاس ہی تھا۔ میں نے فون بند کیا اور اپنی موٹر سائیکل کی طرف لپکا۔ چند ہی لمحے بعد میں جی الامکان رفتار سے پرل ٹاکیز کی طرف اڑا جا رہا تھا۔ ذہن میں کئی سوال اُدھم مچا رہے تھے جن میں سب سے اہم یہ تھا کہ ریٹا پستول لے کر تیواری کی طرف کیوں گئی ہے؟ بہر حال اس وقت سب سے اہم مسئلہ ریٹا کو پانے کا تھا۔ موٹر سائیکل سڑک پر اڑی جا رہی تھی اور میری نگاہیں مطلوبہ نمبر کار کشا ڈھونڈ رہی تھیں۔ پرل ٹاکیز سے کوئی ایک فرلانگ آگے میں نے ریٹا کو جا لیا۔ موٹر سائیکل رکشے سے آگے لے جا کر میں نے اُسے روکنے کا اشارہ کیا۔ رکشا رُک گیا۔ مجھے دیکھ کر ریٹا کا رنگ اُڑ گیا۔ وہ اس وقت پتلون قمیص میں ملبوس تھی۔ بال کس کر پیچھے باندھے ہوئے تھے۔ وہ رنج و الم کی تصویر نظر آتی تھی۔ میں نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

”ریٹا، نیچے اترو۔ میں تمہیں واپس لے جانے آیا ہوں۔“

وہ غمی شیرنی کی طرح غرائی۔ ”انکل، آپ لوگ میرے راستے سے ہٹ جائیں۔ میں کسی کے روکنے سے نہیں رکوں گی۔“

اُس کا سنگین لہجہ بتا رہا تھا کہ اُس کے ساتھ کوئی المناک حادثہ ہو چکا ہے اور اب وہ زندگی سے اس قدر بے زار ہے کہ کوئی خطرہ اُس کے لیے خطرہ نہیں رہا۔ اُس کی سُرُخ آنکھوں میں آنسو شعلے کی طرح چمک رہے تھے اور وہ کسی پُر جلال دیوی کی طرح خوبصورت موتی نظر آتی تھی، لیکن کچھ بھی تھا وہ ایک لڑکی تھی اور میں تھا نیدار۔

وہ مجھ سے جیت نہیں سکتی تھی۔ میں نے پلک جھپکتے میں اندازہ لگا لیا کہ یہ گھی سیدھی انگلیوں سے نہیں نکلے گا۔ اگر میں اس سے زیادہ تکرار کرتا تو لوگ اکٹھے ہو سکتے تھے۔ اگر ہم دونوں میں کھینچا تانی ہوتی تو بھرے بازار میں تماشا بن جاتا۔ جتنا زیادہ ہنگامہ ہوتا مسٹر ڈیوڈ کی اتنی بدنامی ہوتی۔ پھر اُس کے پاس بھرا ہوا ریوالتور بھی تھا۔ طیش کے عالم میں وہ کچھ بھی کر سکتی تھی۔ میں نے دوسینڈ کے اندر اندر یہ ساری باتیں سوچیں اور لپک کر رکشے میں سوار ہو گیا۔ دوسرے ہی لمحے میں اُسے کسی چیز کی طرح اپنے بازوؤں میں دبوج چکا تھا۔ وہ مچلی اندر سے چلائی۔

”انکل چھوڑ دیں مجھے، میں کہتی ہوں.....“

اُس کے آخری الفاظ حلق میں گھٹ کر رہ گئے کیونکہ میں نے ایک ہاتھ سے اُس کا منہ نڈر کیا تھا۔ رکشے والا میری آنکھ کے اشارے پر جست لگا کر اگلی سیٹ پر بیٹھا اور پہلے گیر

میں ہی رہتا کوئی بیس میل فی گھنٹہ تک لے گیا۔ مختلف راستوں پر تیز رفتاری سے سفر کرتے ہوئے ہم مسٹر ڈیوڈ کی کوشی کے سامنے رکے۔

مسٹر ڈیوڈ اُس وقت اپنے بیمار جسم کو گھسیٹتے ہوئے ایک تانگے پر سوار ہو رہے تھے۔ ظاہر تھا وہ ریٹا کے پیچھے جا رہے ہیں۔ رکشے میں میرے ساتھ ریٹا کو دیکھ کر وہ تیزی سے نیچے اتر آئے۔ گنگو نے لپک کر گیٹ کھول دیا۔ میں رکشا اندر پورج تک لیتا چلا گیا۔ ریٹا ابھی تک بری طرح مچل رہی تھی اور خود کو چھڑانے کی کوشش میں تھی۔ مجھے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ اُس جیسی سمجھدار اور پڑھی لکھی لڑکی کو آٹھ دس مہینوں میں یہ کیا ہو گیا ہے۔ ایک سال پہلے کی ریٹا اور آج کی ریٹا میں زمین آسمان کا فرق نظر آرہا تھا۔ میں اُسے تقریباً کندھے پر اٹھا کر اندر لایا۔ جونہی اندر پہنچ کر میں نے اُس کے ہونٹوں سے ہاتھ ہٹایا وہ دہانے لگی۔ ”مجھے چھوڑ دیں انکل۔ پاپا جانی آپ بھی چھوڑ دیں مجھے۔ میں اُس کو شوٹ کر دوں گی۔ میں اُس کو زندہ نہیں چھوڑوں گی۔“ صاف طور پر سمجھ آرہی تھی کہ اُس کا اشارہ ڈاکٹر مگن لال تیواری کی طرف ہے۔ وہ اُس کے خون کی پیاسی ہو رہی تھی۔ آج اُس کی معصوم آنکھوں میں حسین خوابوں کی جگہ شعلے رقص کر رہے تھے۔ مسٹر ڈیوڈ رو رہے تھے اور اُسے سنبھالنے کی کوشش کر رہے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ اُسے ایک ننھی سی گڑیا کی طرح اپنی گود میں لے لینا چاہتے ہیں اور یوں اپنے بازوؤں کے گھیرے میں جکڑنا چاہتے ہیں کہ کوئی زندگی بھر اُسے اُن سے جدا نہ کر سکے مگر وہ گڑیا نہیں تھی۔ ایک پھرمی ہوئی لڑکی تھی اور اُن کے بوڑھے بازو کمزور تھے۔ اُن کا بیمار جسم ہانپ رہا تھا وہ بے بسی اور بے چارگی کی مکمل تصویر نظر آرہے تھے۔ میں نے غصے میں بھنا کر ریٹا کو تھپڑ مارا اور وہ چیختی ہوئی اُس بیانو پر جاگری جو کمرے کے وسط میں رکھا تھا۔ ایک پایہ اُس کے سر میں لگا اور تھوڑا سا خون بہہ نکلا۔ وہ جیسے ٹڈھال سی ہو گئی۔ میں اُسے کندھے پر اٹھ کر اُس کے کمرے میں لے آیا۔

مسہری پر لٹایا تو وہ تنکے میں سر چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ مسٹر ڈیوڈ بے قرار رہے۔ مسہری کے چاروں طرف پھر رہے تھے۔ شاید انہیں سمجھ نہیں آرہی تھی کہ بیٹی کا دکھ بانٹنے کے لیے کیا کریں۔ کہاں جائیں۔

میں نے ڈیوڈ صاحب کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور انہیں لے کر کمرے سے باہر آگیا۔ میں نے کہا۔ ”یہ لیجئے ریٹا کا پستول..... اور بہتر ہے کہ فی الحال اُسے اُس کے حال پر رہنے دیا جائے..... غصہ اُتر گیا تو وہ ہماری بات سننے لگی اور اپنی سنائے گی بھی۔ ابھی کچھ کہنا سنا فصول ہے..... لیکن ایک بات یاد رکھیے اُس کے کمرے کو باہر سے کنڈی ضرور لگا دیجئے۔“

ہو پھر کوئی مصیبت پڑ جائے..... اور میں تھانے ہی میں ہوں۔ کوئی مسئلہ ہو تو فوراً مجھے کال کر دیجئے۔ باقی صبح تفصیل سے بات کریں گے۔

ڈیوڈ صاحب نے ایک صوفے پر ڈھیر ہوتے ہوئے کہا۔ ”نہیں نواز خان تھانے مت جاؤ۔ میرا دل گھبرا رہا ہے۔ یہیں میرے پاس بیٹھو۔ مجھے اکیلا مت چھوڑو۔“ ڈیوڈ صاحب کی حالت واقعی قابلِ رحم تھی۔ میں نے اُسی کمرے سے تھانے میں اپنے اے ایس آئی کو ٹیلی فون کر دیا کہ میں مسٹر ڈیوڈ کی کوشی میں ہوں۔ اگر کوئی ضروری کام ہو تو مجھے رینگ کر لینا۔

ریٹا کے کمرے میں اب خاموشی تھی۔ میں نے دے پاؤں جا کر شیشے سے جھانکا۔ وہ ٹڈھال سی پڑی تھی۔ آنکھیں بند تھیں۔ میں نے بہ آہستگی کمرے کے دروازے کو باہر سے منتقل کر دیا۔ تب میں ڈیوڈ صاحب کے پاس آ بیٹھا۔ گنگو گرم چائے ہمارے سامنے رکھ گیا..... میرے کچھ پوچھنے سے پہلے ہی ڈیوڈ صاحب نے سگریٹ کا کش لیتے ہوئے کہا۔

”نواز خان! وہی ہوا جس کا خطرہ تھا۔ ڈاکٹر تیواری غلط آدمی نکلا۔“

میں نے کہا ”غلط سے آپ کا کیا مطلب ہے؟“

ڈیوڈ جیکسن بڑے آزرہ لہجے میں بولے۔ ”وہ شیطان ریٹو کے معصوم دل سے کھیلتا رہا اور جب جی بھر گیا تو دوسری عورتوں کے پیچھے بھاگنے لگا۔ وہ کلی کلی منڈلانے والا بھنورا ہے۔ میری ریٹا اُس بد ذات کی فطرت نہ سمجھ سکی۔“

میں نے کہا۔ ”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟“

وہ بولے۔ ”ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ ڈاکٹر تیواری اب ریٹو کو انور کر رہا ہے۔ وہ اُس کے نازک دل پر اپنی بے رحمی کے چر کے لگا رہا ہے۔ میں حالات کا یہ رخ کئی دن پہلے دیکھ چکا تھا۔ اپنے طور پر میں ریٹو کو سمجھانے کی کوشش کرتا رہا ہوں لیکن وہ لپگی اپنے دل کے ہاتھوں مجبور تھی۔ جھوٹی آس اور امید کی ڈوروں سے بندھی ہوئی تھی۔ کل اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ اُس نے کالج سے آتے ہوئے ڈاکٹر تیواری کو ایک لڑکی کے ساتھ کار میں جاتے ہوئے دیکھا۔ وہ آگ۔ گبولہ گھر پہنچی۔ اُس نے بنگالی کو ٹیلی فون کیا۔ وہی بنگالی جسے سب بابو..... بالو کہتے ہیں۔ جس وقت وہ غصے میں بھری ہوئی بابو کو ٹیلی فون کر رہی تھی۔ میں ساتھ والے کمرے میں موجود تھا۔ ریٹو کا خیال تھا کہ میں سو رہا ہوں لیکن میری ریٹا انکاروں پر لوٹ رہی تھی تو میں کیسے سو سکتا تھا۔ میں جاگ رہا تھا۔ میں نے ریٹو اور بابو کی باتیں سن لیں۔ ریٹو اُسے پوچھ رہی تھی کہ آج سہ پہر ڈاکٹر کے ساتھ کار میں جانے والی لڑکی کون تھی؟ جواب

باتیں کر رہا تھا۔ میز پر ایک دو ڈھائی سال کا بچہ اٹھکیلیوں میں مصروف تھا۔ حالانکہ ہسپتال کے اس حصے میں بچوں کو لانے کی اجازت نہیں تھی لیکن یہ قانون تو بے چارے عام لوگوں کے لیے تھا۔ تیواری جیسے ڈاکٹر صاحبان اور ان کے یاروں دوستوں پر اس قانون کا بھلا کیا اثر ہونا تھا۔

مجھے ذمہ کر بابو ذرا سا گھبرا گیا۔ جیسے کوئی چوری پکڑی گئی ہو۔ شاید وہ ہسپتال کے خرچے پر لمبی لمبی کالیں کرنے کا عادی تھا۔ میں نے درشت لہجے میں پوچھا۔
”ڈاکٹر تیواری کہاں ہے؟“

وہ اپنی گھبراہٹ پر قابو پا کر لا پرواہی سے بولا۔ ”بھئی مجھے تو پتہ نہیں میں تو کل مدراس سے آیا ہوں۔ ابھی تک ان سے ملاقات نہیں ہوئی۔“

میں نے کہا۔ ”میں اُس سے ملنا چاہتا ہوں۔ ضروری کام ہے۔“

وہ رکھائی سے بولا۔ ”آپ نے ان سے وقت لیا ہوا ہے؟“

میں نے کہا۔ ”پولیس کو وقت لینے کی ضرورت نہیں ہوئی اور تم ذرا اپنے لہجے کو درست کر کے بات کرو۔ مجھے لگتا ہے تمہارے دماغ کو کافی خشکی چڑھی ہوئی ہے۔“

میرے اس فقرے پر اُس کی اکڑی ہوئی گردن کچھ اور اکڑ گئی اور وہ بھینسنے کی طرح نتھ پھلا کر بولا۔ ”ایک تو آپ بغیر اجازت کے اندر گھس آئے ہیں۔ دوسرے تیز سکھانے کی باتیں کر رہے ہیں۔ آپ کوئی اکیلے ہی تھانیدار نہیں ہیں اس شہر میں، اپنی عزت اپنے ہاتھ ہوئی ہے۔ ڈاکٹر صاحب اس وقت میننگ میں ہیں۔ براہ مہربانی آپ باہر تشریف رکھیے، جب آئیں گے آپ کو بلا لیا جائے گا۔“

میں نے کہا۔ ”ابھی تو تم کہہ رہے تھے تمہیں ڈاکٹر کا پتہ نہیں اور اب بتا رہے ہو وہ میننگ میں ہیں۔“

وہ انگلی اٹھا کر بولا۔ ”دیکھیں جی! آپ خواہ مخواہ اپنی وردی کا رعب نہ جھاڑیں۔ ہم کوئی چور لٹکے نہیں، باعزت گورنمنٹ ملازم ہیں۔“ اتنے میں شور سن کر ایک نرس اندر آئی۔ بابو اُس سے بولا۔ ”سسر! چوکیدار کو بلاؤ ان صاحب کو میننگ روم میں بٹھائے، خواہ تو وہ دماغ خراب کر رہے ہیں۔“

میرے اندر پہلے ہی لاوا کھول رہا تھا۔ بابو کے فقرے نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ میرا ہنوز زور سے گھوما، چنانچہ کی آواز سے ایک تھپڑ بابو کے گال پر پڑا اور وہ اچھل کر میز پر گر ا۔ ٹلفون سیٹ پھسلتا ہوا پُر شور آواز سے فرش پر جا گرا۔ نرس چیختی ہوئی باہر بھاگی۔ اس سے

میں بابو اُسے ٹالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ پھر دونوں غصے میں بولنے لگے۔ ریٹوبولی ”میں جانتی ہوں وہ کیا کرتا پھر رہا ہے۔ میں نے بہت باتیں سنی ہیں اور سن رہی ہوں۔ تم لوگ جو کچھ کر رہے ہو اچھا نہیں کر رہے۔“ ریٹوبولی تلخ باتوں کے جواب میں بابو نے شاید اُسے کسی برے نام سے پکارا تھا۔ وہ چلا کر بولی ”آوارہ میں نہیں تم ہو۔ دغا بازی بھی تم لوگوں کے حصے میں آئی ہے۔ تم نے قدم قدم پر مجھے دھوکا دیا ہے۔“ دوسری طرف بابو نے رابطہ کاٹ دیا تھا۔ ریٹوبولی کچھ دیر خود ہی چیخ چلا کر چپ ہو گئی۔

آج صبح سے وہ اپنے کمرے میں بند تھی۔ نہ کچھ کھایا پیا تھا نہ کسی سے بات کی تھی۔ مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ خاموشی کسی طوفان کا پیش خیمہ ہے۔ آخر وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ وہ پستول لے کر غصے میں بھری ہوئی نکلی اور ڈاکٹر تیواری کی طرف روانہ ہو گئی۔ وہ میری بیٹی ہے۔ میں اُس کے چہرے سے بھانپ لیتا ہوں کہ اُس کے ارادے کیا ہیں۔ میں نے اُسے روکنے کی بہت کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوا۔ آخر میں نے تمہیں ٹیلی فون کر دیا۔“

مجھے ڈاکٹر تیواری پر رہ رہ کر غصہ آ رہا تھا اور اس سے بھی زیادہ غصہ اُس بنگالی بابو پر تھا۔ واقعات سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ ”بابو“ نامی یہ شخص ڈاکٹر کے دست راست کا کردار ادا کر رہا ہے۔ ایک طرح سے ریٹا کو چھسنانے کا کام بھی اُسی نے کیا تھا۔ اُس نے اپنی باتوں سے ریٹا کے دل میں ڈاکٹر کے لیے ہمدردی پیدا کی اور بعد ازاں اُن کے معاملے کو اگے بڑھانے میں ہر طرح کی مدد کی۔ اب یہی بنگالی بابو ریٹا کی بات سننے کا روادار نہیں تھا۔ میں نے دل میں فیصلہ کیا کہ اس شخص کا مزاج ٹھکانے لگا کر رہوں گا لیکن اس سے پہلے میں ڈاکٹر تیواری سے چند باتیں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے ڈیوڈ صاحب سے اپنے ارادوں کا قطعاً ذکر نہیں کیا۔ مجھے خدشہ تھا کہ وہ مجھے روک دیں گے۔ میں اُن کے پاس بیٹھا ادھر ادھر کی گفتگو کرتا رہا اور جب ریٹا اپنے کمرے میں گہری نیند سو گئی تو میں ڈیوڈ صاحب کی ڈھارس بندھا کر تھانے والیں آ گیا۔

اگلے روز دوپہر کے وقت میں اُس ہسپتال پہنچا جہاں تیواری ملازم تھا۔ اُس کا کمرہ دوسری منزل پر تھا۔ دروازے پر ڈاکٹر مگن لال تیواری کے نام کی پلیٹ لگی ہوئی تھی۔ نام کے نیچے اُس کی ڈگریوں کی فہرست تھی۔

دبلیز پر ایک چوکیدار چوکس کھڑا تھا۔ میں وردی میں تھا اُسے جرات نہیں ہوئی کہ مجھے روک سکے۔ میں دروازہ کھول کر ندنا تا ہوا اندر چلا گیا۔ یہ ایک شاندار کمرہ تھا۔ ڈاکٹر تیواری کی کرسی خالی تھی۔ ہاں میز پر بابو ٹانگیں لٹکائے بیٹھا تھا اور ٹیلی فون پر کسی سے ہنس کر

پہلے کہ ہسپتال کا عملہ اندر پہنچتا اور ”بابو“ کو چھڑاتا میں تھپڑوں اور مکوں سے اُس کی اچھی ناسر تو اضع کر چکا تھا۔

لوگوں نے کھینچ تان کر بمشکل ہم دونوں کو علیحدہ کیا۔ بابو کے ہونٹوں سے خون بہہ رہا تو اور وہ کبھی اردو اور کبھی بنگالی میں مجھے خطرناک نتائج کی دھمکیاں دے رہا تھا۔ بابو کے چند حمایتیوں نے مجھ پر جھپٹنا چاہا لیکن اُس وقت دو سینئر ڈاکٹر وہاں پہنچ گئے۔ اتفاقاً اُن میں سے ایک میرا واقف کار نکلا آیا۔ اُس نے اپنی رعب دار آواز میں ڈانٹ ڈپٹ کر مشتعل افراد کو چپ کرایا اور مجھے اپنے ہمراہ اپنے کمرے میں لے آیا۔ کہنے لگا آپ کو ڈاکٹر کے کمرے میں گھس کر مار پیٹ نہیں کرنی چاہیے تھی۔ خواہ خواہ مصیبت کھڑی ہو جائے گی۔ یہ لوگ تو ذرا ذرا سی بات پر ہڑتال کر دیتے ہیں۔“

میں نے کہا۔ ”اگر آپ قانون کی بات کر رہے ہیں تو قانون مجھے بھی تھوڑا بہت آتا ہے۔ یہ شخص ڈاکٹر کے کمرے میں گھس کر ٹیلی فون کالیں کر رہا تھا اور دو ڈھائی سال کا بچہ ساتھ بٹھا رکھا تھا۔ یہ کہاں کا قانون ہے؟ اس کے علاوہ یہ لوگ مریضوں کے ساتھ جو جو ”قانونی“ کارروائیاں کر رہے ہیں، آپ سنیں تو آپ کے ہوش اُڑ جائیں گے۔“

میرا واقف کار ڈاکٹر کافی بااثر آدمی تھا۔ اُس نے معاملے کو طویل نہیں پکڑنے دیا۔ چار پانچ آدمیوں کو اپنے کمرے میں بلا لیا۔ اُن میں بابو بھی شامل تھا۔ چائے اور بسکٹ وغیرہ منگوائے گئے اور وہیں ہماری صلح کروادی گئی۔ ڈاکٹر تیواری ابھی تک میٹنگ سے فارغ نہیں ہوا تھا، لہذا میں اُس سے ملے بغیر واپس آ گیا۔ واپسی کے وقت بنگالی بابو مجھے قہرناک نظروں سے گھور رہا تھا۔ میرے دل میں بھی اُس کے لیے کچھ کم غصہ موجود نہیں تھا۔ بلکہ یہ غصہ اُس کے غصے سے کہیں زیادہ شدید اور سنگین تھا۔ اس غصے میں ایک بے گناہ لڑکی کی بے چارگی اور بے بسی بھی شامل تھی۔

☆=====☆

تین چار روز تک میں ذہنی کے ایک سنگین کیس میں الجھا رہا اور کسی دوسری طرف دھیان دینے کی بالکل فرصت نہیں ملی۔ چوتھے روز میں علی الصبح تھانے پہنچا تو ایک دھماکہ خیز میری منتظر تھی۔ اے ایس آئی مشتاق چوہدری نے بتایا کہ مسٹر ڈیوڈ جیکسن کے گھر قتل ہو گیا ہے۔ قتل ہونے والا ڈاکٹر مگن لال تیواری ہے۔ اُس کی لاش کوٹھی کے پورچ میں پڑی ہے۔ ایک لخت میری نگاہوں میں ریٹا کا لال بھسوکا چہرہ گھوم گیا۔ اُس کی چیختی ہوئی آواز میرے کانوں میں گونجی۔ ”میں اُسے زندہ نہیں چھوڑوں گی..... میں اُسے شوٹ کر دوں گی۔“

میں فوراً اپنے عملے کے ساتھ موقعہ واردات پر پہنچا۔ ابھی اجالا پوری طرح نہیں پھیلا تھا۔ کوٹھی کے پورچ میں تین چار افراد کھڑے زمین کی طرف دیکھ رہے تھے۔ یہ لوگ مسٹر ڈیوڈ کے پڑوسی تھے۔ خود مسٹر ڈیوڈ لال کی گھاس پر بے قراری سے ٹہل رہے تھے۔

میں لاش کے نزدیک پہنچا۔ مگن لال تیواری جو سفید قمیص اور نیوی بلیو پتلون میں تھا اندھے منہ فرش پر پڑا تھا۔ اُس کی چپک دار ٹائی خون اور مٹی میں لتھڑی ہوئی تھی۔ ایک ہاتھ جسم کے نیچے آگیا تھا جب کہ دوسرا ہاتھ آگے کی طرف پھیلا ہوا تھا۔ اُس کے جسم میں دو موبایاں لگی تھیں۔ ایک گولی بائیں آنکھ ضائع کر کے دماغ میں گھس گئی تھی اور دوسری نے بائیں پہلو میں کوئی چار انچ قطر کا شگاف ڈال دیا تھا۔ ڈاکٹر کی سُرخ گاڑی بھی پاس ہی کھڑی تھی۔ اُس کا اگلا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ یوں لگا تھا ڈاکٹر جونہی گاڑی سے برآمد ہوا اُسے کوٹھی کے

کسی اندرونی کمرے سے شوٹ کر دیا گیا۔ خون اور زخموں کی حالت سے ظاہر تھا کہ یہ واقعہ رات دوسرے پہر کے دوران پیش آیا ہے لیکن اس کی رپورٹ صبح چار بجے کی گئی تھی۔ رپورٹ کرنے والا مسٹر ڈیوڈ کا ایک پڑوسی تھا۔ اُس نے مسٹر ڈیوڈ کی درخواست پر ایسا کیا تھا۔

موقعہ واردات پر ایک اور عبرتناک منظر بھی دیکھا جاسکتا تھا ڈاکٹر کی لاش چونکہ کئی گھنٹے وہاں پڑی رہی تھی لہذا مسٹر ڈیوڈ کا سفید کتا رات بھر اُس کے گرد منڈلاتا رہا تھا اور کبھی کبھی متول کو اپنے انتوں سے بھنبھوٹتا بھی رہا تھا۔ مقتول کی گردن کے پچھلے حصے، اُس کی پشت کے نرم گوشت اور کندھوں پر دانتوں کے نشان اور پنچوں کی گہری خراشیں تھیں۔ سفید قمیص بھی جگہ جگہ سے اڑھڑی ہوئی تھی۔ مجھے مسٹر ڈیوڈ کی بات یاد آئی۔ انہوں نے چند ہفتے پہلے ہی کہا تھا کہ میری بیٹی کو دغا دینے والا اپنی سزا سے نہیں بچ سکے گا..... ایک دکھی باپ کے دل سے نکلی ہوئی بد دعا پوری ہوئی تھی۔ اُس کا زخم زخم جسم میرے سامنے پڑا تھا۔ میں نے وقوعہ کا اچھی طرح جائزہ لیا۔ پھر مسٹر ڈیوڈ سے پوچھا۔

”ڈیوڈ صاحب! ریٹا کہاں ہے؟“

وہ کانپ کر بولے۔ ”اُسے تم نے کیا کہنا ہے؟“

میں نے خشک لہجے میں کہا۔ ”ڈیوڈ صاحب آپ بھی جانتے ہیں میں نے اُس سے کیا کہنا ہے۔ وہ اس کیس میں شامل تفتیش ہے۔“

وہ روہانسی آواز میں بولے۔ ”نواز خان! وہ بے قصور ہے۔ اُس نے کچھ نہیں کیا۔“

اُسٹ جانتا ہے اُس نے کچھ نہیں کیا۔“

میں نے پوچھا۔ ”تو پھر کس نے کیا ہے؟“

وہ گڑبڑا کر بولے۔ ”ہائی گاڈ ہمیں کچھ معلوم نہیں۔ ہم کچھ نہیں جانتے۔ صبح گنگوٹھا نے اُس نے بتایا کہ پورچ میں ایک ڈیڈ باڈی پڑی ہے اور باہر کا گیٹ کھلا ہوا ہے۔ میں گرتا ہوں یہاں پہنچا تو ڈاکٹر تیواری مرا پڑا تھا..... میں نے آوازیں دے کر ریٹا کو جگایا۔ وہ گہری نیند سے اٹھی اور تیواری کو مُردہ دیکھ کر اونچی آواز میں رونے لگی۔ وہ اپنے کمرے میں بیٹھی ابھی تک رو رہی ہے.....“

میں ریٹا کے پاس پہنچا۔ وہ دونوں ہاتھ گود میں رکھے بستر پر خاموش بیٹھی تھی۔ اُس کی آنکھیں رو رو کر سوجی ہوئی تھیں۔ مجھے دیکھ کر وہ ایک بار پھر ہچکیوں سے رونے لگی۔ میں نے ڈیوڈ صاحب سے کہا کہ میں ریٹا سے تنہائی میں چند باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ وہ میری طرف رخ طلب نظروں سے دیکھتے باہر چلے گئے۔ میں نے ریٹا سے کہا۔

”دیکھو ریٹا! بہتر یہی ہے کہ مجھے سب کچھ صاف صاف بتا دو۔ اسی میں ہم سب کی بھلائی ہے۔ یہ کوئی ایسا معاملہ نہیں ہے جو چھپانے سے چھپ سکے گا۔ جھوٹ بولنے سے میری اور تمہاری مشکلات میں اضافے کے سوا اور کچھ نہیں ہوگا۔“

ریٹا نے چہرہ چھپا کر روتے ہوئے کہا۔ ”مجھے کچھ معلوم نہیں انکل..... میں کچھ نہیں جانتی میں نے کسی کو قتل نہیں کیا۔“

میں نے کہا۔ ”ریٹا یہ تو وہ بیان ہے جو تمہارے پاپا جانی نے تمہیں پڑھایا ہے۔ میں وہ بیان چاہتا ہوں جو سچا ہو اور جو تمہارے دل سے نکلے..... کسی سخت گیر پولیس آفیسر کے سامنے سچ بولنے سے بہتر ہے کہ اپنے انکل کے سامنے سچ بول دو.....“

ریٹا روتے ہوئے ایک بار پھر نفی میں سر ہلانے لگی۔ ”نہیں انکل..... میں نے کچھ نہیں کیا۔ میں نے کسی کا خون نہیں کیا.....“

اس دوران میرا اے ایس آئی اجازت لے کر اندر آ گیا۔ اُس نے کچھ کاغذات اور دوسری اشیاء میرے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا۔ ”جناب! یہ چیزیں کار کے ڈیش بورڈ سے لی ہیں۔“

میں نے دیکھا ان اشیاء میں سگریٹ لائٹر، سگریٹ کا پیٹک، دھوپ کی عینک، سنگھی اور کچھ دوسری اشیاء تھیں۔ اس کے علاوہ ایک پتلی سی کتاب بھی تھی۔ اے ایس آئی نے کتاب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”اس میں ایک رقعہ بھی ہے جناب۔ اُس پر ریٹا کا نام لکھا ہوا ہے۔“ میں نے جلدی سے کتاب کھول کر رقعہ نکالا۔ یہ بڑے سائز کی کاپی کا آدھا ورق تھا۔ اُس پر لکھا تھا۔

”آپ شاید مجھ سے ناراض ہیں، لیکن پاپا جانی نے آپ کا کیا بگاڑا ہے۔ وہ بیمار ہیں اور تین چار دن سے آپ کو یاد کر رہے ہیں۔ اپنے قیمتی وقت میں سے چند منٹ نکال کر ایک بار اُن کو دیکھ جائیں، پھر چاہے آئیں، چاہے نہ آئیں۔“

میں نے اے ایس آئی سے پوچھا۔ ”رقعہ کتاب میں تھا؟“

اُس نے کہا۔ ”نہیں جناب! ڈیش بورڈ میں رکھا ہوا تھا۔ کتاب میں تو میں نے ڈالا تھا۔“

میں نے اے ایس آئی کو باہر جانے کا اشارہ کیا اور رقعہ ریٹا کی آنکھوں کے سامنے لہراتے ہوئے کہا۔ ”کیا اب بھی تمہیں انکار ہے کہ تم نے اس رقعے کے ذریعے مقتول کو یہاں بلایا ہے۔“

ریٹا نے ایک نگاہ تحریر پر ڈالی اور پھر بال مٹھیوں میں جکڑ کر نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ”یہ جھوٹ ہے۔ یہ جھوٹ ہے..... میں نے کسی کو رقعہ نہیں لکھا۔“

چند منٹ بعد میں نے ریٹا کو اُس کے حال پر چھوڑ دیا اور عملے کے ساتھ مل کر آلہ قتل کی تلاش شروع کر دی۔ معمولی کوشش کے بعد ہم ایک بیڈروم کی الماری سے ڈبل بیرل بندوق برآمد کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ بارہ بور کی ایسی ہی بندوق سے مقتول پر فائرنگ کی گئی تھی۔ جب ہم نے بندوق برآمد کی تو وہ بکس میں بندھی لیکن بکس کی حالت سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ بہت دیر سے مقفل نہیں ہے۔

اسی دوران مقتول کے کچھ لواحقین بھی روتے پیٹتے پہنچ گئے۔ ان میں مقتول کا والد، اُس کی بیوی اور دوست بھی شامل تھے۔ میں نے لاش پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوا دی اور حاضرین سے بیان لینے شروع کیے۔ میرے نکتہ نظر سے سب سے اہم بیان علاقے کے چوکیدار کا تھا۔ دوسرے نمبر پر اہم بیان ڈاکٹر تیواری کے دوست ”بابو“ کا تھا۔ بابو کا بیان مندرجہ ذیل تھا۔

”ریٹا کل سہ پہر کوئی ساڑھے تین بجے میرے گھر پہنچی تھی۔ اُس نے کہا کہ وہ دو دن سے ڈاکٹر تیواری سے رابطہ کرنے کی کوشش کر رہی ہے لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ اُس نے ایک رقعہ دیتے ہوئے مجھ سے درخواست کی کہ میں یہ ڈاکٹر صاحب تک پہنچا دوں۔ (رقعے کا مضمون وہی تھا جو ہماری نظر سے گزر چکا تھا) میں نے آفس ٹائم کے بعد ڈاکٹر تیواری کو گھر پر فون کیا تو پتہ چلا کہ وہ بیوی بچوں کے ساتھ شادی کے ایک فنکشن میں گئے ہیں اور رات دس بجے تک لوٹیں گے۔ میں نے چونکہ ریٹا سے وعدہ کر رکھا تھا لہذا میں نے سوا دس بجے تیواری کو

دوبارہ رنگ کیا۔ وہ گھر آچکے تھے۔ میں نے انہیں ریٹا کی آمد اور اُس کے پیغام کے بارے بتایا۔ اُن کی آواز سے تھکاوٹ ظاہر ہو رہی تھی مگر کہنے لگے۔ ”اچھا میں کپڑے بدل کر ابھی آتا ہوں۔“ کوئی آدھ گھنٹے بعد اُن کی گاڑی میرے مکان کے سامنے رکی۔ میں نے باہر ہی آکر اُن سے بات چیت کی اور رقعے کے ساتھ ریٹا کا زبانی پیغام بھی انہیں دے دیا۔ وہ زیادہ دیر رکے نہیں اور ریٹا کی طرف چلے آئے۔“

”بابو“ کے اس بیان سے حالات پر کافی روشنی پڑتی تھی۔ علاقے کے پٹھان چوکیدار کا بیان بھی اس بیان کی تصدیق کرتا نظر آتا تھا۔ اُس نے بتایا کہ وہ حسب معمول گشت پر تھا۔ رات سوا گیارہ اور ساڑھے گیارہ کے درمیان ایک سُرخ کار تیزی سے مسٹرڈیوڈ کی رہائش گاہ کی طرف جاتی نظر آئی۔ اس کے بعد کچھ فاصلے سے اُسے دو یا تین فائر کی آواز سنائی دی۔ اس نے سوچا کہ شادیوں کا سیزن ہے۔ شاید کسی شادی والے گھر سے فائرنگ کی گئی تھی۔ اس کے بعد وہ دیر تک سڑک پر ٹھہتا رہا لیکن سُرخ کار دوبارہ نظر نہیں آئی۔ چوکیدار کے بیان کی تصدیق ایک ہمسائے نے بھی کی۔ اُس نے کہا کہ رات کے کسی پہر اُس نے فائرنگ کی آواز سنی تھی لیکن یہ فائرنگ کتنے بجے ہوئی اور کتنے فائر ہوئے وہ اس کے بارے میں کچھ نہ بتا سکا۔

بہر حال اب شک و شبہ کی گنجائش بہت کم رہ گئی تھی۔ حالات اور واقعات صاف طور پر جس کی طرف اشارہ کر رہے تھے وہ ریٹا تھی۔ اُس نے اپنی برادری کا انتقام لیا تھا اور کئی ماہ تک اپنے دل اور جسم سے کھیلنے والے ہر جانی عاشق کو زندگی کی سرحد پار کرادی تھی۔ اب وہ اپنے جرم کو مانتی یا نہ مانتی اس سے کوئی فرق پڑنے والا نہیں تھا۔ وہ انتہائی قدم اٹھا چکی تھی اور اب اُسے انصاف کی انڈھیلتو اور کا سامنا کرنا تھا۔ وقوعہ کے جائزہ سے یہ بات سمجھ میں آتی تھی کہ جس وقت ڈاکٹر تیواری کار لے کر اُن کی کوٹھی پر پہنچا، ریٹا کوٹھی کے ایک اندرونی کمرے میں بھری ہوئی بندوق کے ساتھ موجود تھی۔ پروگرام کے مطابق اُس نے کوٹھی کا بیرونی گیٹ پہلے سے کھول رکھا تھا تا کہ تیواری کو کال نیل بجانے کی زحمت نہ ہو۔ جونہی ڈاکٹر گاڑی سے نکل کر اندرونی حصے کی طرف بڑھا۔ اُس نے اُسے شوٹ کر دیا۔

☆=====☆

ریٹا جوڈیشل رییمانڈ پر جیل پہنچ چکی تھی۔ میں جلد از جلد چالان مکمل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کیس بظاہر صاف تھا لیکن میں اپنے طور پر کوئی گوشہ تاریک جھوٹا نہیں چاہتا تھا۔ یہ عین ممکن تھا کہ ڈاکٹر تیواری کو کسی اور وجہ سے قتل کیا گیا ہو اور قاتل بھی کوئی اور ہو۔ یہ بھی

مکن تھا کہ اُسے کہیں اور سے مار کر مسٹرڈیوڈ کے گھر ڈال دیا گیا ہو آخر اُس کے بہت سے رقبہ اور دشمن موجود تھے۔ کوئی کاروباری رقابت یا گھریلو جھگڑا بھی اس واردات کا سبب ہو سکتا تھا۔ اس کیس کی تفتیش میں دو نکتے ایسے تھے جو مجھے کبھی کبھی سخت الجھن میں ڈال دیتے تھے۔ پہلی بات تو یہ کہ ریٹا اپنے جرم سے انکار کر رہی تھی۔ اُس کے انکار کو ایک عام مجرم کا انکار سمجھ کر نظر انداز نہیں کیا جاسکتا تھا۔ تفتیش کے دوسرے نکتے جب میں اُس سے ملنے جیل پہنچا تو وہ اتنی سلاخوں سے لپٹ کر زور زور سے رونے لگی۔ اُس نے کہا۔ ”انکل! مجھے آپ سے یہ امید نہیں تھی۔ کیا آپ بھی یہ سمجھتے ہیں کہ ریٹا جھوٹ بولتی ہے۔ اب ریٹا مر ہی جائے تو اچھا ہے۔ اب ریٹا کو مر ہی جانا چاہیے۔ مجھے اپنے ہاتھوں سے گولی مار دیں انکل۔ میں ان جیلوں میں سڑنا نہیں چاہتی۔“ اس کے بعد اُس نے کوئی اور بات نہیں کی تھی اور یہی کہتی رہی تھی کہ اگر آپ کے خیال میں میں مجرم ہوں تو پھر مجرم ہی ہوں۔ بس مجھے جلدی سے پھانسی دلواد دیجئے تاکہ میری مشکلوں سے میری اور میرے پاپا جانی کی جان چھوٹ سکے۔

اس کیس کا دوسرا پریشان کن نکتہ یہ تھا کہ مقتول کی کار کے ڈیش بورڈ میں ایک ڈیڑھ سو صفحے کی انگریزی کتاب پائی گئی تھی۔ یہ کتاب ڈاکٹری کے بارے میں تھی اور اسے ڈاکٹر تیواری کے ایک ساتھی ڈاکٹر راجندر پال نے لکھا تھا۔ وقوعہ کے روز ڈاکٹر راجندر پال نے اس کتاب کی ایک کاپی ڈاکٹر تیواری کو دی تھی۔ کتاب کے ایک صفحے پر راجندر پال کے دستخط اور تاریخ بھی درج تھی۔ تفتیش سے ثابت ہوتا تھا کہ وقوعہ کے روز سارا دن ڈاکٹر تیواری اور ڈاکٹر راجندر کی ملاقات نہیں ہوئی، وہ بھی نہیں سکتی تھی۔ کیونکہ ڈاکٹر راجندر پال اپنی کتاب کی رومنائی کے سلسلے میں امرتسر سے باہر گیا ہوا تھا۔ وہ وقوعہ کی رات نو بجے امرتسر واپس آیا تھا۔ اس کا مطلب صاف تھا وہ کتاب مقتول کو اُس وقت دی گئی تھی جب وہ شادی کی تقریب سے واپس آیا اور ”بابو“ سے رقعہ لے کر ریٹا کی طرف روانہ ہوا۔ راستے ہی میں ڈاکٹر راجندر کی کوٹھی پڑتی تھی۔ وہ وہاں تھوڑی دیر کے لیے رک گیا اور ڈاکٹر راجندر نے اُسے کتاب دے دی، جسے اُس نے ڈیش بورڈ میں رکھ دیا۔ اس سے ثابت ہوتا تھا کہ مقتول اپنی زندگی میں جس آخری شخص سے ملا وہ ڈاکٹر راجندر پال تھا۔ میری تفتیش سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ماضی میں ڈاکٹر راجندر اور مقتول میں خاصی کاروباری دشمنی رہی ہے۔ وہ ایک دوسرے کی شکل دیکھنے کے روادار نہیں تھے۔ کوئی ایک ماہ پہلے ہی اُن میں بول چال شروع ہوئی تھی۔ ان حالات میں کسی حد تک ڈاکٹر راجندر پر شبہ کیا جاسکتا تھا۔ اور نہیں بھی کیا جاسکتا تھا۔ مگر ڈاکٹر نے جو بیان دیا تھا وہ اُسے خواہ مخواہ اس کیس میں پھنسا رہا تھا۔ وہ اپنی اس بات پر ڈٹا ہوا تھا

کہ وقوعہ کی رات ڈاکٹر تیواری اُس کے پاس ہرگز نہیں آیا اور نہ ہی اُس تاریخ میں دن کے وقت اُس سے ملاقات ہوئی ہے۔ اس پر میرا سوال تھا کہ پھر کتاب پر دستخط کس کے ہیں؟ اس کا جواب راجندر پال یہ دیتا تھا کہ دستخط کے نیچے اُس نے غلطی سے ایک دن بعد کی تاریخ درج کر دی ہے۔ یہ کتاب اُس نے وقوعہ سے ایک دن پہلے ڈاکٹر تیواری کو دی تھی۔

ان دو نکتوں کے علاوہ مسٹر ڈیوڈ کا بیان بھی مجھے ابھن میں ڈال گیا جو انہوں نے وقوعہ کے دسویں روز مجھے تھانے آکر دیا۔ گلوگیر آواز میں انہوں نے کہا۔

”نواز خان! میں تمہیں کیسے بتاؤں کہ ریٹا نے یہ مرڈر نہیں کیا۔ میں نے اُسے ماں بن کر پالا ہے۔ میں اُس کی ایک ایک ادا کو سمجھتا ہوں۔ وہ مجھ سے جھوٹ نہیں بول سکتی۔ ہم نے زندگی بھر ایک دوسرے سے جھوٹ نہیں بولا اور شاید کبھی نہ بول سکیں گے۔ حالات اُسے مجرم گردان رہے ہیں لیکن وہ مجرم نہیں ہے۔“

میں نے کہا۔ ”ڈیوڈ صاحب! میں یہ کیسے مان لوں۔ میں نے اپنے کانوں سے اُسے قتل کا ارادہ ظاہر کرتے سنا ہے۔ اگر اُس روز ہم اُس سے پستول چھین کر اُسے کمرے میں بند نہ کر دیتے تو کیا وہ تیواری کو شوٹ نہ کر دیتی؟ ضرور کر دیتی اور اُس نے کربھی دیا ہے۔ اُس دن نہ سہی چار دن ٹھہر کر سہی۔“

مسٹر ڈیوڈ نے کراہتے ہوئے کہا۔ ”انسپکٹر نواز! تم اُس روز کی بات دوہرا رہے ہو اور یہ نہیں جانتے اُس کے بعد کیا ہوا تھا۔ تمہیں کچھ معلوم نہیں۔ سنو! میں ریڈو کو مکمل طور پر بند کر چکا تھا۔ میں نے اُس سے کہا تھا ریڈو! تیرے پاپا جانی نے زندگی میں کبھی تجھ سے کچھ نہیں مانگا۔ آج ایک چیز مانگ رہا ہوں۔ دیکھو انکار نہ کرنا۔ مجھے میری ایک برس پہلے کی ریڈو دے دو۔ وہی ہنسی کھیلتی ناچتی گاتی ریڈو۔ جو کچھ بھی ہوا تمہارے دل کے ساتھ یا تمہارے جسم کے ساتھ سب کچھ بھول جاؤ۔ سب کچھ فراموش کر دو۔ آؤ ہم باپ بیٹی ایک نئی زندگی شروع کریں۔ شملے کی برف پوش چوٹیوں پر جو کالج تم نے بڑی چاہت سے بنوایا ہے، ہمارا انتظار کر رہا ہے۔ آؤ اس شہر کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر اُس کالج میں آباد ہو جائیں۔ اُس کی دیواروں میں پناہ لے کر اپنی زندگی کو دکھوں سے دور کر دیں۔ وہ کالج ہمارے زخموں پر مرہم رکھ دے گا اور ہماری کھوئی ہوئی خوشیاں لوٹ آئیں گی۔ وہاں صرف میں ہوں گا، گنگو ہوگا اور ہمارا رچی (کتا) ہوگا۔ ہم تمہارے ہاتھ کے پکے ہوئے کھانے کھائیں گے اور تمہارے سنائے ہوئے لطفوں پر ہنسا کریں گے۔ پھر تم فارغ وقت میں پیانو بجایا کرنا اور میں گھنٹوں بیٹھ کر سنا کروں گا۔

میں ریڈو کو بہت دیر تک سمجھا تا رہا اور آخر دھیرے دھیرے اُس کی آنکھوں سے غیض و غضب کی سُرخ چھٹ گئی۔ اُس کی نیلی پتلیوں میں امید کی روشن کرنیں چمکنے لگیں۔ آخر وہ بھل کر مجھ سے چٹ گئی۔ اتنا روئی کہ اُس کے آنسوؤں سے میری قمیص بھیگ گئی۔ ہچکیوں اور سسکیوں کے درمیان کہنے لگی۔ ”پاپا جانی! میرا دل مر چکا ہے لیکن میں آپ کی خاطر زندہ رہوں گی۔ ساری دنیا کو انکار کر دیتی لیکن آپ کو انکار نہیں کروں گی۔ آپ کی بات نہیں ٹالوں گی۔ سب کچھ بھول جاؤں گی۔ جو بھول سکتی ہوں وہ بھی اور جو نہیں بھول سکتی وہ بھی۔“

میں نے اُسے اپنی گود میں سمیٹ لیا اور دیر تک دلاسا دیتا رہا۔ اُسے سمجھا تا رہا کہ جو کچھ ہوا اُس میں اُس کا کوئی قصور نہیں۔ میری تربیت میں ہی کوئی کمی رہ گئی تھی۔ وہ سسک سسک کر میری گود میں ہی سو گئی۔ اگلے روز ہم نے شملے جانے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ میں سارا سامان بندھوا چکا تھا۔ ٹکٹ بھی لے چکا تھا کہ روانگی سے ایک رات پہلے تیواری قتل ہو گیا۔ میں ایک باپ ہوں میری بات غور سے سنو نواز خان۔ میں پھر تم سے کہہ رہا ہوں میری ریڈو نے قتل نہیں کیا۔ اگر یہ بات جھوٹ ہے تو پھر دنیا میں کہیں سچ نہیں ہے اور کل کا سورج کبھی طلوع نہیں ہوگا۔“

ریٹا کا بیار اور بوڑھا باپ آنسو پونچھتا اور لڑکھڑاتا ہوا تھانے سے باہر چلا گیا اور میری الجھن کو کچھ اور الجھا گیا۔ میں ایک روشن کمرے میں بیٹھا تھا لیکن میرے چاروں طرف اندھیرا تھا۔ کوئی راستہ بھائی نہیں دیتا تھا۔ میں کرسی کی پشت سے ٹیک لگائے سوچتا رہا۔ اور سوچتا رہا۔ دو روز بعد مجھے ہر صورت چالان مکمل کر کے دینا تھا اور اگر ایک بار تیرے کمان سے نکل جاتا تو اُسے واپس لانا خاصا مشکل تھا۔ سوچتے سوچتے میرے ذہن میں اچانک ایک بات آئی۔ میں نے میز کی دراز کھول کر کاغذات کے اندر سے وہ رقعہ نکالا جو ریٹا نے ڈاکٹر تیواری کو گھر بلانے کے لیے لکھا تھا اور جس کے بارے میں مجھے ایک سو دس فیصد یقین تھا کہ یہ ریٹا کا ہی تحریر کردہ ہے۔ جیسا کہ میں نے بتایا ہے یہ بڑی کاپی کا قریباً آدھا صفحہ تھا لیکن ایک عجیب سی بات تھی کاغذ کا یہ ٹکڑا صفحے کے درمیان سے نکالا گیا تھا۔ یعنی یہ اوپر نیچے سے پھنسا ہوا تھا۔ نہ ورق کا بالائی حاشیہ نظر آتا تھا اور نہ نیچے والا کنارہ موجود تھا۔ دفعتاً مجھے ٹک ہونے لگا کہ اس ٹکڑے کو کسی بڑے خط کے درمیان سے نکالا گیا ہے۔ یہ خیال ذہن میں کوندتے ہی میں اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا اور موٹر سائیکل لے کر آندھی و طوفان کی طرح جیل خانے کی طرف لپکا۔ کوئی آدھ گھنٹے بعد میں لاک آپ میں ریٹا کے سامنے کھڑا تھا۔ وہ بے حد کزور اور افسردہ نظر آ رہی تھی اور پہلے کی طرح کچھ بھی بتانے کے موڈ میں نہیں تھی۔ میں نے

میں سر رکھے لیٹی تھی۔ اُس کے بالائی جسم پر کوئی لباس نہیں تھا۔ دونوں کے چہرے آتش دان کی روشنی میں جھلکتے تھے۔ مجھے دیکھ کر لڑکی کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ وہ میز پوش سے جسم ڈھانپتی ہوئی دوسرے کمرے میں بھاگ گئی۔ ”بابو“ کچھ دیر ہکا بکا میری طرف دیکھتا رہا۔ ایک لمحے کے لیے اُس کے چہرے پر سخت طیش نظر آیا مگر پھر فوراً ہی اُس نے خود پر قابو پایا۔ شاید ہسپتال کے کمرے والی پٹائی اُسے یاد آگئی تھی۔ اُنھ کو خوش اخلاقی سے بولا۔

”آئیے..... آئیے انسپکٹر صاحب! آپ نے کیوں تکلیف کی۔ مجھے فون کر دیا ہوتا میں حاضر ہو جاتا۔“

میں نے کہا۔ ”آپ ”مصرف“ آدمی ہیں میں نے سوچا خود ہی نیاز حاصل کر آتا ہوں۔“

وہ مجھے صوفے پر بٹھاتا ہوا بولا۔ ”فرمائیے میں کیا خدمت کر سکتا ہوں۔ میرا خیال ہے آپ تیواری کیس کے سلسلے میں آئے ہوں گے۔“

میں نے کہا۔ ”آپ کا اندازہ درست ہے۔“

وہ اچانک ہی خود پر رقت طاری کرتے ہوئے بولا۔ ”انسپکٹر اس سلسلے میں میں ہر وقت اور ہر جگہ حاضر ہوں۔ جب تک تیواری صاحب کے قاتل زندہ ہیں میں نہ مَر دوں میں ہوں نہ زندوں میں..... آپ دیکھ ہی رہے ہیں، میں نے خود کو کس طرح شراب میں غرق کر رکھا ہے۔ یہ غم تو شاید میری جان ہی لے لے گا۔“ وہ باقاعدہ آنسوؤں سے رونے لگا تھا۔

میں نے کہا۔ ”ہاں مجھے بھی لگتا ہے اب آپ مشکل سے ہی بچیں گے.....“ وہ ناک سے ٹوں ٹوں کی آواز نکال رہا تھا۔ چونک کر میری طرف دیکھنے لگا۔ میں نے کہا۔ ”لگتا ہے تیواری آپ جیسے دوست سے بچھڑ کر ہلکان ہو رہا ہے، آپ کو اپنے پاس بلا کر ہی چھوڑے گا..... ویسے بائی دی وے وہ گمن کہاں ہے جس سے آپ نے اپنی دوستی کو ”امر“ کیا تھا۔“

”بابو“ اب پوری طرح چونک گیا تھا۔ کہنے لگا۔ ”کیا باتیں کر رہے ہو انسپکٹر، مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہی۔“

میں نے کہا۔ ”اپنے گھر میں کسی مجرم کو کچھ سمجھ نہیں آتی۔ سمجھ والا خانہ تو تھانے جا کر کھلتا ہے۔“

وہ چلا کر بولا۔ ”کہیں..... کہیں تم مجھے تیواری کیس میں تو ملوث نہیں کر رہے۔“

میں نے اطمینان سے سگریٹ سلگایا اور صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر کہا۔ ”میں نہیں ملوث نہیں کر رہا کیوں کہ ملوث ہونے کا کام تم آج سے دس روز پیشتر کر چکے

اُسے پیار سے سمجھاتے ہوئے کہا۔ ”رینا! اگر تم پولیس کے ساتھ تعاون نہیں کرو گی تو کون لوگوں کو فائدہ ہوگا؟ اُن لوگوں کو فائدہ ہوگا جو تمہیں پھانسی کے پھندے تک پہنچانا چاہتے ہیں اور تمہارے پاپا کو خودکشی پر مجبور کرنا چاہتے ہیں..... دیکھو اس رقعے کو..... یہ تحریر تمہاری ہتھ پناں ہے۔“

رینا نے ایک نگاہ غلط انداز تحریر پر ڈالی۔ کچھ دیر خالی نگاہوں سے اُسے دیکھتے رہی پھر یکایک اُس کے چہرے پر تاثرات نمودار ہونے لگے۔ اُس کی آنکھوں میں چمک آئی۔ ہونٹ کپکپائے اور اُس نے لپک کر رقعہ میرے ہاتھ سے لے لیا۔ پھر تیزی سے بولی۔ ”یہ میری ہی تحریر ہے لیکن یہ مکمل خط نہیں، خط کا ایک حصہ ہے۔ اوہ مائی گاڈ یہ خط تو میں نے کوئی پانچ ماہ پہلے لکھا تھا.....“ رینا نے لرزاں لہجے میں اور بھی بہت کچھ کہا مگر اُس کے یہی تین چار فقرے میری تفتیش کی گاڑی پٹری پر چڑھانے کے لیے کافی تھے۔ میں نے اُس کی ڈھارس بندھانے کے لیے ایک دو باتیں کی اور اُس سے رخصت لے کر فوراً ہر آ گیا۔

اب آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ میرا رخ کس شخص کی طرف تھا..... جی ہاں ڈاکٹر تیواری کے ”پیارے دوست“ بنگالی بابو کی طرف۔ اُس وقت شام ہو چکی تھی اور سرما کی ٹھٹھری ہوئی تاریکی قدم قدم شہر کے گلی کوچوں میں اتر رہی تھی۔

میں نے منہ سرا اچھی طرح گرم مفلر میں لپیٹ رکھا تھا۔ الیگز انڈرا گراؤنڈ کے بالمقابل پہنچ کر میں نے موٹر سائیکل ایک ذیلی سڑک پر کھڑی کی۔ یہاں سے کچھ فاصلے پر ”بابو“ کی کوٹھی نظر آ رہی تھی۔ ابھی میں موٹر سائیکل سے اترنے کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ کوٹھی کے گیٹ سے ایک ٹیکسی کار برآمد ہوئی۔ کار میرے قریب سے گزری تو اُس میں دو عورتیں نظر آئیں۔ اُن میں سے ایک ادھیڑ عمر تھی اور دوسری جوان۔ میں نے فوری فیصلہ کیا اور موٹر سائیکل دوبارہ اشارت کر کے ٹیکسی کے پیچھے چل دیا۔

☆=====☆

کوئی دو گھنٹے بعد جب رات کے ساڑھے آٹھ بجے تھے اور ایک نہایت سرد ہوا گلی کوچوں کو ویران کر رہی تھی، میں نے اپنے ٹھنڈے ہوئے ہاتھ اور روٹ کی جیبوں سے نکال کر بنگالی بابو کے دروازے پر لگی کال بیل کا بٹن دبایا۔ چند لمحے بعد ایک چرسی سے ملازم نے دروازہ کھولا۔ اس سے بیشتر کہ وہ مجھ سے کوئی سوال جواب کرتا میں اُسے دھکیلتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔ برآمدے سے گزر کر میں نے ایک بند دروازے کو کھولا تو سامنے بنگالی بابو ایک جے سجائے کمرے میں بیٹھا نظر آیا۔ وہ نشے میں مدھوش تھا۔ ایک نوخیز بازاری لڑکی اُس کی گود

ہو..... آج سے دس روز پہلے دسمبر کی نو تاریخ کو بروز اتوار رات گیارہ بج کر بیس منٹ پر تم نے اپنے چہیتے دوست مگن لال تیواری کو شوٹ کیا ہے۔“

یہ فقرہ ”بابو“ کے سر پر ہائیڈروجن بم کا دھماکہ تھا۔ وہ سکتے کے عالم میں میری طرف دیکھتا چلا گیا۔ میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”پورن بھگت عرف بنگالی بابو اب سے دو گھنٹے قبل تمہاری ماما اور بہن یہاں سے نکل کر گئی تھیں۔ میرے حال پر ”مہربانی“ کرتے ہوئے انہوں نے مجھے ساری کہانی سنا دی ہے۔

میرا خیال ہے..... تم بھی سن لو..... آج سے کوئی دو برس پہلے تم کلکتے سے بھاگ کر پنجاب کے اس دور دراز شہر میں آئے تھے۔ تم پر وہاں ایک قتل کا کیس تھا اور تم اتنے خوفزدہ تھے کہ کبھی واپس جانے کا ارادہ نہ رکھتے تھے۔ تم یہاں گورنمنٹ ہسپتال میں ملازم ہو گئے اور اپنی عیاری اور چرب زبانی کی وجہ سے تیزی سے ترقی کرنے لگے۔ تم نے ڈاکٹر تیواری سے دوستی گانگھی اور اُس کی رنگ رلیوں میں اُس کے دست راست بن گئے۔ ڈاکٹر خوبصورت لڑکیوں کا دلدادہ تھا اور تم اُس کے لیے شکاری کے پھندے کا کام کر رہے تھے۔ وہ عورتوں کو تاڑتا تھا اور تم اُس کے لیے راستے ہموار کرتے تھے۔ ایسا کرتے ہوئے تم نے یہ کبھی نہ سوچا کہ کوئی ذات ہمارے اوپر بھی موجود ہے۔ جو ہماری ہر حرکت کو دیکھتی ہے۔ وہ ذات کبھی کبھی گناہ گاروں کو یوں بھی سزا دیتی ہے کہ شکاریوں کے اپنے جال ہی انہیں پھانس لیتے ہیں اور قاتلوں کے خنجر لوٹ کر اُن کے اپنے ہی بدن میں ترازو ہو جاتے ہیں۔

تمہارے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا بنگالی بابو..... کلکتے میں تمہاری ماں اور بہن کو کسی طرح پتہ چلا کہ تم پنجاب کے شہر امرتسر میں موجود ہو۔ وہ محبت کی ماری تمہیں تلاش کرتی ہوئیں ہزاروں میل دور یہاں پہنچیں۔ انہیں تمہارے ٹھکانے کا علم نہیں تھا اور وہ شہر کے گلی کوچوں میں تمہیں ڈھونڈتی پھر رہی تھیں۔ اسی پریشانی اور غریب الوطنی میں تمہاری نوجوان بہن لاجپتی جیسے تم پیار سے لاجو کہا کرتے تھے بیمار ہو گئی۔ تمہاری دکھیری ماں اُسے لے کر ایک ڈاکٹر کے پاس پہنچی۔ اتفاق سے یہ ڈاکٹر تمہارا دوست تیواری ہی تھا۔

یہ کوئی ڈیڑھ ماہ پہلے کی بات ہے۔ تم ان دنوں مدراس گئے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر تیواری تمہاری بہن کا علاج کرنے لگا اور تمہیں تو اچھی طرح معلوم ہی ہے وہ نوجوان اور خوبصورت عورتوں کا علاج کتنی توجہ سے کرتا ہے۔ معلوم ہے ناں تمہیں؟ ہاں تو علاج کے ساتھ ساتھ اُسے تمہاری بے آسرا ماں اور بہن سے ہمدردی بھی ہو گئی۔ اُس نے نہ صرف انہیں کرائے کا ایک مکان لے کر دیا بلکہ وقتاً فوقتاً اُن کی خبر گیری کرنے بھی جانے لگا۔ وہ جانتا تھا کہ ماں بیٹی

کلکتے سے اپنے کسی گمشدہ عزیز کو ڈھونڈنے آئی ہیں جس کا نام پورن بھگت ہے۔ یہ تو اُس کے تصور میں بھی نہ آسکتا تھا کہ یہ پورن بھگت اُس کا ہم پیالہ بابو احمد ہے جو فرضی نام سے یہاں رہ رہا ہے۔

لہذا پورن بھگت صاحب! ایک روز جب تمہاری ماں شہر کی گلیوں میں تمہیں ڈھونڈنے نکلے ہوئی تھی اور تمہاری بہن جو تقریباً تقریباً ریٹائی کی ہم عمر ہے..... گھر میں اکیلی تھی۔ ڈاکٹر نے اُسے اپنی مردانہ وجاہت کے کلوروفارم سے بے ہوش کر کے اُس کی عزت کا آپریشن کر دیا..... بابا..... کتنا اچھا دوست تھا تمہارا؟ تم ڈاکٹر کے قتل سے پانچ چھ روز پہلے مدراس سے واپس آئے۔ تمہیں یہاں کے حالات کا کچھ علم نہیں تھا۔ ایک روز ڈاکٹر نے تمہیں اپنے ”نئے شکار“ کے بارے میں بتایا اور کچھ روپے دیتے ہوئے کہا کہ پندرہ بیس روز کا راشن لڑکی اور اُس کی ماں کے ہاں پہنچا دو۔ تم راشن لے کر خرماں خرماں اپنے یار کا نیا شکار دیکھنے کے لیے پہنچے۔ وہاں اپنی بہن کو دیکھ کر تمہیں جو ”دلی مسرت“ ہوئی ہوگی، میں اچھی طرح جانتا ہوں..... وہ اوپر والا تم جیسے بے ضمیروں کو ایسے ہی خوش کیا کرتا ہے۔ ”جوش اور مسرت“ سے تمہارا سینہ پھٹنے لگا۔ تمہاری باجھوں سے جھاگ بہنے لگا اور کیوں نہ بہتا، تمہاری اپنی بہن کا معاملہ تھا ناں..... تم نے دیواروں سے ٹکریں ماریں اور رو رو کر اپنا گلا بٹھالیا۔

پھر تم سراپا انتقام بن گئے۔ نو دسمبر کی رات تقریباً دس بجے جب تیواری فنکشن سے واپس آیا تو تم نے اُسے ٹیلی فون کر کے اُسی گھر میں بلالیا جہاں تمہاری آبرو باختہ بہن رہتی تھی..... جب ڈاکٹر گھر میں پہنچا تو تم نے اُسے شوٹ کر دیا۔ سارا منصوبہ تم پہلے ہی بنا چکے تھے۔ تم نے فوراً اُسے اپنے ایک دوست کی گاڑی میں ڈالا اور سُرخ گاڑی میں خود بیٹھ گئے۔ ”نوں گاڑیاں تیزی سے مسٹر ڈیوڈ کی کونٹھ کی طرف روانہ ہوئیں۔ مسٹر ڈیوڈ کی کونٹھ وہاں سے صرف تین فرلانگ کے فاصلے پر ہے۔ تم نے بڑی ہوشیاری سے ڈاکٹر کی خونچکاں لاش پورچ میں ڈال دی۔ پھر اُس کی گاڑی کے ڈیش بورڈ میں ریٹا کے ایک پرانے خط کا حصہ رکھ دیا۔ یہ کاغذ ڈاکٹر کی جیب میں اس لیے نہ رکھا گیا کہ کہیں پولیس کے پہنچنے سے پہلے کوئی اسے نکال نہ لے۔ ڈاکٹر کی گاڑی میں خون کی آلائش تک نہ تھی لہذا کسی کے ذہن میں نہیں آیا کہ ڈاکٹر کو کہیں اور سے قتل کر کے یہاں لایا گیا ہے۔

سب سے بڑی ہوشیاری جو تم نے دکھائی اور جس کا میں اعتراف کرتا ہوں، یہ ہے کہ تم قتل کے بعد ڈاکٹر کا خون ضائع نہیں ہونے دیا۔ اُس کا زیادہ تر حصہ تم نے رڑ کے ایک ڈاکٹر کی بیک میں محفوظ کر لیا اور بعد میں یہی خون مسٹر ڈیوڈ کے پورچ میں پھینک دیا..... میرا

خیال ہے مجھے وائسے ہند سے سفارش کرنی چاہئے کہ اس زبردست عیاری پر تمہیں مجرمانہ مہارت کا سب سے بڑا ایوارڈ دیا جائے.....“

میرا آخری فقرہ سننے سے پہلے ہی ”بابو“ اچانک اٹھ کر دروازے کی طرف دوڑ لگا چکا تھا۔ میں نے اُس کے پیچھے لپکنے کی کوشش نہیں کی۔ وجہ یہ نہیں تھی کہ میں اُسے فرار کا موقع دینا چاہتا تھا بلکہ..... دروازے پر میرا عملہ موجود تھا۔ جونہی بابو نے دروازہ کھولا، ایک صحت مند کانٹنیل نے اُسے اپنی ٹھوس توند سے دھکا مارا اور وہ اُلٹ کر کمرے کے وسط میں آن گرا۔

☆=====☆=====☆

پورن بھگت عرف ”بابو“ گرفتار ہوا۔ اُس کی ماں اور بہن واپس مغربی بنگال چلی گئیں۔ ریٹار ہا ہوئی، تیسرے شخص یعنی ڈاکٹر تیواری کے انجام کے بارے میں آپ پڑھ ہی چکے ہیں۔ کسی نے سچ کہا ہے ”ات خدا داویر“۔ ریٹا کی رہائی کے فوراً بعد مسٹر ڈیوڈ اُسے لے کر شملے چلے گئے۔ وہاں اُن کا اپنا کالج نمابنگہ تعمیر ہو چکا تھا۔ میں انہیں خود لاہور انٹرپورٹ چھوڑنے گیا تھا۔ ریٹا قید و بند کی تکلیفوں سے نڈھال تھی۔ اُس کی نقاہت نے مسٹر ڈیوڈ کو اپنی بیماری بھلا ڈالی تھی۔ میں نے دیکھا جہاز کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے انہوں نے ریٹا کو اپنی بانہوں کے حلقے میں یوں چھپا رکھا تھا جیسے کوئی کمزور بوڑھا اپنی زندگی کی آخری پونجی ڈاکوؤں کے نگر سے بچا کر لے جا رہا ہو۔

☆=====☆=====☆

عزت کی بھوکی

غریب عورت خوبصورت ہو، شوہر کمزور اور بے غیرت ہو، گاؤں کا چوہدہری اور علاقے کا تھانیدار عزت کے لیئرے ہوں تو پھر ایسی ہی شرمناک کہانیاں جنم لیتی ہیں..... ایک بے بس و بے کس عورت کا ماجرا، اسے اپنی جان سے زیادہ عزت پیاری تھی۔

وہ بھی کہہ کر گیا تھا۔ اُسے اپنے ایک دوست کے ہاں باغ رمانند جانا تھا۔ ہم رات نو ساڑھے نو بجے تک یہی سمجھتے رہے کہ شاید اُسے وہاں دیر ہوگئی ہے لیکن جب رات دس بجے کے قریب میں باغ رمانند پہنچا تو اُس کے دوست وجے نے بتایا کہ وہ تو دوپہر ساڑھے گیارہ بجے اُن کے گھر آیا تھا اور ایک گھنٹہ ٹھہر کر واپس چلا گیا تھا۔ اس کے بعد ہمیں سخت فکر لاحق ہوئی۔ ہم نے.....“

میں نے پرکاش کی بات کانٹے ہوئے کہا۔ ”ڈھلوں صاحب! آپ تسلی سے بات کریں۔ اس طرح نہ میری سمجھ میں کچھ آئے گا اور نہ آپ ٹھیک طرح بتا پائیں گے۔ سب سے پہلے مجھے یہ بتائیں کہ لڑکے کی عمر کیا ہے؟ وہ کیا کرتا ہے اور گھر میں اُس کے علاوہ اور کون کون افراد رہتے ہیں؟“

پرکاش کی بجائے اُس کی چتی نے گلوگیر لہجے میں کہنا شروع کیا۔

”انسپکٹر صاحب میرا بچہ ڈاکٹر ہے۔ جوان جہان ہے۔ بھگوان جانے کیسا مقدر ہے اُس کا۔ جب سے پیدا ہوا ہے ڈھک دیکھ رہا ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ اپنے پتا سے اُس کی کبھی نہیں بنی۔ کچھ اُس کا بھی دوش ہوتا تھا کچھ یہ بھی طبیعت کے سخت ہیں۔ بہر حال جیسے تیسے کر کے اُس نے تعلیم جاری رکھی اور ایم بی بی ایس کا امتحان پاس کر لیا۔ اُس کی تمنا تھی کہ وہ شہر سے دور کسی گاؤں یا قصبے میں جا کر کلینک کھولے اور غریب لوگوں کی خدمت کرے..... بس اس بات پر پتا سے اُس کا جھگڑا رہتا تھا۔ یہ اُسے سمجھاتے تھے کہ پہلے شہر میں قدم جمالو پھر جوجی چاہے کرنا۔ شہر میں زندگی آسان ہے اور روپیہ زیادہ ہے۔ وہ کہتا تھا کہ گاؤں میں بیماری زیادہ ہے، اس لیے ڈاکٹروں کی ضرورت بھی زیادہ ہے۔ میں نے بھی اپنے طور پر اُسے سمجھانے کی کوشش کی لیکن وہ نہیں مانا۔ پھر ان کو سمجھایا کہ یہ ہی ضد چھوڑ دیں۔ اُسے اپنی کر لینے دیں۔ چار چھ ماہ میں خود ہی گاؤں سے اُکتا جائے گا مگر باپ بیٹا ایک سے بڑھ کر ایک ہیں۔ میں بچکی کے ان دو پائوں میں اناج کی طرح پس رہی ہوں..... کوئی تین ماہ پہلے انٹل نہایت خاموشی کے ساتھ گھر سے چلا گیا۔ وہ ایک خط چھوڑ گیا تھا جس میں اس نے بڑے جذباتی انداز میں لکھا تھا کہ میں اپنی زندگی کی عمارت اپنی مرضی سے اٹھانا چاہتا ہوں۔ فی الحال اس عمارت کی بنیاد رکھنے جا رہا ہوں۔ تھوڑا بہت نقشہ بن گیا تو آپ کو دکھاؤں گا۔ مطلب یہ تھا کہ وہ کلینک کھولنے کا ارادہ کر کے کسی گاؤں کا رخ کر گیا تھا۔ پورے تین ماہ اُس کی طرف سے کوئی خبر نہیں آئی۔ ہم سب انگاروں پر لوٹے رہے۔ اُس کی دو چھوٹی بہنیں تو اُن پر جان چھڑکتی ہیں۔ پورے تین ماہ سب نے کانٹوں پر گزارے۔ تلاش کے باوجود انیل

بلال شاہ اُن دنوں بڑا خوش تھا۔ اُس کی بیوی اپنے نو بچوں کے ساتھ میکے گئی ہوئی تھی۔ جاتے جاتے وہ بلال شاہ کی ساری پریشانیاں اور فکر بھی ساتھ لے گئی تھی۔ لہذا اب شاہ صاحب بڑے مزے میں تھے۔ صبح منہ اندھیرے ”نودس بجے“ اٹھے، پندرہ سولہ پوڑیوں کا ”ہلکا سا“ ناشتہ کیا، پھر بیوی کی جدائی میں دوسیر دی کا ادھر رٹ کا پیا۔ اپنی خشک میوؤں کی دکان کا ایک چکر لگایا۔ ملازم غریب کو ڈانٹا ڈپٹا، پھر ٹہلتے گھومتے تو ند منکاتے تھانے آگئے۔ گپ شپ لگائی۔ دس بارہ بجے گئے چوسے یا چار پانچ گلاس کانچی کے پی کر ”حلق تڑ“ کیا۔ پھر تھانے کے کسی کونے میں چار پائی ڈال کر خرائے لینے لگے۔ اُس وقت بھی بلال شاہ گئے چوسنے کے بعد نشیلی آنکھوں سے ارد گرد دیکھ رہا تھا اور جمائی پر جمائی لے رہا تھا۔ مجھے معلوم تھا وہ سونے کے لیے دو گز زمین ڈھونڈ رہا ہے۔ اسی دوران ایک سائل تھانے میں داخل ہوا۔ اُسے دیکھ کر جہاں میری سستی دور ہوگئی، وہاں بلال شاہ کی نیند بھی بھاگ گئی۔ سائل کے ساتھ ایک خوبصورت عورت بھی تھی۔ عورت کی عمر چالیس بیالیس کے قریب تھی مگر لباس اور حلیے سے جوان لگتی تھی۔ کافی خوبصورت تھی۔ ہلکا سا میک اپ بھی کیا ہوا تھا۔ مرد کی عمر چار پانچ سال زیادہ تھی۔ وہ صاف طور پر اُس کا خاوند دکھائی دیتا تھا۔ دونوں پڑھی لکھی امیر سکھ فیملی کے فرد تھے۔ میں نے انہیں بیٹھنے کے لیے کرسیاں وغیرہ پیش کیں۔ مرد نے اپنا نام پرکاش ڈھلوں بتایا۔ وہ میرے ہی تھانے کے علاقے کا رہائشی تھا۔ شربت اور مرے وغیرہ بنانے کی ایک بڑی فیکٹری اُس کی ملکیت تھی۔ ساتھی عورت شانی کو اُس کی دھرم بتی تھی۔ پرکاش نے اپنا مسئلہ بیان کرتے ہوئے کہا۔

”انسپکٹر صاحب! میرا اکلوتا بیٹا انیل کل سہ پہر سے غائب ہے۔ سہ پہر سے میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ اپنے پروگرام کے مطابق اُسے سہ پہر تین بجے تک گھر آ جانا تھا۔ اپنی ماما

کا کچھ پتہ نہیں چلا۔ آخر رب نے ہماری فریادیں سنیں اور پرسوں منگل کے روز انیل گھر واپس آ گیا۔ سارا گھر دھاڑیں مار مار کر رویا۔ وہ خود بھی رو رہا تھا۔ ہمیں اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ اُس نے بتایا کہ اُس نے کپور تھلہ کے ایک نواحی گاؤں میں کلینک کھول لیا ہے اور اپنے کام سے بہت مطمئن ہے۔ اُس کی خوشی ہماری خوشی تھی۔ ہم نے اُس سے کوئی باز پرس نہیں کی اور کہا کہ وہ جیسے چاہتا ہے کرے۔ اس کے پتانے بھی کہہ دیا کہ ٹھیک ہے بیٹا جیسے تم راضی ہم بھی راضی۔ اگر کلینک کے لیے کوئی رقم وغیرہ کی ضرورت ہو تو میرے اکاؤنٹ سے نکالو۔ اُس نے صرف شکریہ ہی ادا کیا تھا۔ ہم سب محسوس کر رہے تھے کہ وہ ہمارے بھرپور تعاون اور محبت کے باوجود کچھ زیادہ خوش نہیں ہے۔ کوئی پریشانی ضرورت تھی جو وہ ساتھ لے کر آیا تھا اور جو ہر گھڑی اُس کے ساتھ لگی ہوئی تھی۔ کل صبح بھی وہ کچھ بجھا بجھا سا تھا۔ ناشتے کی میز پر بہنیں اُس سے ہنسی مذاق کرتی رہیں لیکن وہ کچھ اور ہی سوچوں میں گم تھا۔ ناشتہ بھی ٹھیک سے نہیں کیا۔ پھر اپنے کمرے میں گھس گیا۔ بہت دیر کاغذوں کو الٹ پلٹ کرتا رہا۔ دس بجے کے قریب میرے پاس آیا۔ کہنے لگا۔ ”ممی! میں وجے کی طرف جا رہا ہوں۔ شاید دوپہر کا کھانا وہیں کھاؤں، چائے پر لوٹ آؤں گا۔“

پھر اُس نے اپنی موٹر سائیکل نکال لی۔ میں نے کہا بھی کہ تمہارے پتا تمہارے لیے گاڑی چھوڑ گئے ہیں۔ مگر اُس نے کہا کہ نہیں میں موٹر سائیکل پر جاؤں گا۔

چائے پر ہم سب اُس کا انتظار کرتے رہے لیکن وہ نہیں آیا۔ وجے کے گھر ٹیلی فون نہیں ہے۔ ہم نے اس کے دفتر بار بار رنگ کیا لیکن وہ وہاں موجود نہیں تھا۔ رات نو بجے تک ہماری پریشانی عروج پر پہنچ گئی۔ انیل کے پتا اُسے ڈھونڈنے نکلے۔ وجے کے گھر سے پتہ چلا کہ وہ تو ساڑھے بارہ ایک بجے ہی چلا گیا تھا۔ اس کے بعد اس کے یاروں دوستوں کے ہاں پتہ کیا گیا۔ کہیں سے سراغ نہیں ملا۔ ساری رات ہم نے اُسے ہسپتالوں، تھانوں اور پارکوں میں ڈھونڈتے ہوئے گزار دی۔ اس کی دونوں بہنیں مسلسل ٹیلی فون سے لگی بیٹھی ہیں لیکن کہیں سے کوئی اچھی خبر نہیں ملی۔.....“

شناختی کور نے اپنی بات ختم کی تو آنسو اُس کے گالوں پر بہہ رہے تھے۔ میں نے پوچھا۔ ”آپ نے اُس کے کمرے کی تلاشی لی۔ ہو سکتا ہے وہ پہلے کی طرح کوئی خط وغیرہ چھوڑ گیا ہو۔“

پرکاش نے کہا۔ ”نہیں انسپکٹر! بہت تلاش کیا مگر کوئی تحریر نہیں ملی۔ صرف اُس کی ڈائری ملی ہے۔ اُس ڈائری میں جا کوٹ نامی ایک گاؤں کا پتہ درج ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ یہ وہی

گاؤں ہے جہاں انیل نے کلینک کھول رکھا ہے۔“

ڈھلوں صاحب نے ایک خوش نما ڈائری میری طرف بڑھا دی۔ اس میں مختلف یادداشتیں، ٹیلی فون نمبر، پتے وغیرہ درج تھے۔ آخری صفحات پر ایک گاؤں کا پتہ درج تھا۔ پنڈاری منو ہر لال، گاؤں جا کوٹ ڈاکھانہ و تحصیل فلاں فلاں..... یہ ایک دور دراز گاؤں تھا۔ میرے اندازے کے مطابق پکی تو پکی کچی سڑک سے بھی کوسوں دور تھا۔ واقعی خدمتِ خلق کے ارادے سے نکلنے والے نوجوان ڈاکٹر کے لیے یہ ایک مثالی گاؤں تھا۔ میں نے کہا۔

”ڈھلوں صاحب آپ کا کیا خیال ہے۔ انیل کے غائب ہونے کا تعلق اس گاؤں سے ہے؟“

پرکاش ڈھلوں نے کہا۔ ”ہم کیا کہہ سکتے ہیں۔ ہمیں تو خود کچھ سمجھ نہیں آئی۔ انیل نے ہمیں تھوڑا بہت بتایا ہوتا تو شاید آج ہم اتنا پریشان نہ ہوتے۔ اُس نے تین دنوں میں ہمیں اس گاؤں کا نام تک نہیں بتایا تھا۔ شاید سمجھتا تھا کہ ہم اُس کی مرضی کے خلاف وہاں پہنچ جائیں گے۔“

میں نے خشک لہجے میں کہا۔ ”ڈھلوں صاحب۔ آپ صرف اُس بات کا جواب دیں جو میں پوچھ رہا ہوں۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ انیل کی کشدگی کا تعلق اس ڈائری پر لکھے ہوئے پتے سے ہو سکتا ہے؟“

شناختی کور بولی۔ ”انسپکٹر صاحب! انیل جب سے آیا تھا پریشان تھا۔ لوگ کہتے ہیں کہ دور دراز دیہات میں شہری ڈاکٹروں کو اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ ہو سکتا ہے گاؤں میں اُس کا کسی سے کوئی تنازعہ وغیرہ ہو گیا ہو..... اُس کے چہرے پر چونوں کے کچھ نشان بھی تھے۔ بتا رہا تھا کہ پھسل کر گر گیا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”ڈھلوں صاحب رپورٹ درج کرنے سے پہلے میں انیل کے دوست وجے سے ملنا چاہوں گا۔“

ڈھلوں صاحب نے اُسی وقت وجے کے دفتر کا ٹیلی فون نمبر جیب سے نکالا اور مجھے تھا دیا۔ میرے تھانے میں ٹیلی فون موجود تھا۔ میں نے بلال شاہ سے کہا کہ اس نمبر پر رنگ کر کے وجے صاحب کو فوراً تھانے بلالو۔ بلال شاہ نے ٹیلی فون کر دیا۔ اس دوران میں میاں بی بی سے مختلف سوالات کر کے اپنی معلومات میں اضافہ کرتا رہا۔ کوئی پون گھنٹے بعد وجے کمار آ گیا۔ اُس کا لباس بتا رہا تھا کہ وہ ایک وکیل ہے اور شاید عدالت میں پیش ہو کر آیا ہے۔ اُس نے بڑے اعتماد کے ساتھ مصافحہ کیا اور میرے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔ میں نے اُس سے

مختلف سوالات کیے۔ اُس نے بتایا کہ کل ایک کیس کے سلسلے میں اُسے فوری طور پر لاہور جانا پڑ گیا۔ رات نو بجے کے قریب واپسی ہوئی۔ میرے ملازم نے بتایا تھا کہ دوپہر آپ کے دوست انیل صاحب آئے تھے۔ کوئی ایک گھنٹہ بیٹھ کر واپس گئے تھے۔ اسی دوران انکل پرکاش خود پہنچ گئے۔ یہ خاصے پریشان تھے اور ان کی زبانی مجھے معلوم ہوا تھا کہ انیل کا پھر کچھ پتہ نہیں چل رہا۔

وکیل وجے سے مجھے کوئی نئی بات معلوم نہ ہو سکی۔ میں کچی رپورٹ درج کر چکا تھا لیکن کچھ دوسرے اہم کیسوں کی وجہ سے میں اس کیس پر زیادہ توجہ نہ دے سکا۔ پھر ایک روز مجھے اس کیس کے بارے میں یکے بعد دیگرے دو اہم خبریں ملیں۔ پہلی خبر ڈھلوں صاحب کی اپنی زبانی تھی۔ وہ اُسی دن جاکوٹ سے واپس لوٹے تھے۔ طویل سفر کی تھکاوٹ اُن کے بشرے سے ظاہر تھی۔ وہ خاصے پریشان دکھائی دیتے تھے۔ انہوں نے کہا۔

”انسپکٹر صاحب! بھگوان کے لیے کچھ کریں۔ میرے بیٹے کو کسی گہری سازش کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ میں جاکوٹ گیا تھا۔ وہاں سے مجھے معلوم ہوا کہ انیل پر ایک لڑکی کو ورغلائے کا الزام ہے۔ کچھ لوگوں نے اُس کا کلیٹک بھی توڑ پھوڑ دیا ہے۔ سنا ہے کہ پچھلے سوموار کو وہ بڑی مشکل سے جان بچا کر جاکوٹ سے بھاگا تھا..... انسپکٹر صاحب! ہم تو تصور بھی نہیں کر سکتے کہ ہمارا انیل ایسا ہو سکتا ہے۔ وہ خوسر اور ضدی ضرور ہے، لیکن ایک اعلیٰ اور شریف گھرانے سے تعلق رکھتا ہے۔ اُس پر سراسر الزام لگایا گیا ہے۔“

میں نے کچھ دیر ڈھلوں صاحب کی باتوں پر غور کیا..... پھر پوچھا۔ ”اب آپ کا کیا خیال ہے۔ انیل کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا ہے؟“

ڈھلوں صاحب بولے۔ ”ہم تو اُسے ڈھونڈ ڈھونڈ کر ہلکان ہو گئے ہیں۔ اُس کی طرف سے بھی کوئی خیر خبر نہیں آئی۔ اب تو یہی سمجھ میں آتا ہے کہ اُس لڑکی کے وارثوں نے اُسے اغوا کر لیا ہے یا پھر.....“ وہ خاموش ہو کر آنسو پینے کی کوشش کرنے لگے۔

میں نے کہا۔ ”جاکوٹ کے چوہدری یاد دوسرے بااثر لوگ کیا کہتے ہیں؟“

ڈھلوں صاحب رندھی ہوئی آواز میں بولے۔ ”مجھے تو لگتا ہے وہ سارا گاؤں گونگا بہرا ہے۔ کسی سے کوئی بات پوچھوں بس ”ہوں ہاں“ میں جواب دے کر چلا جاتا ہے۔ اگر چوہدری سے ملاقات نہ ہوتی تو شاید مجھے کسی بات کا پتہ ہی نہ چلتا۔ چوہدری شکل و صورت سے بھلا مانس آدمی لگتا تھا۔ اُس نے ہی مجھے یہ سب کچھ بتایا۔ رات میں اُن کی حویلی میں مہمان رہا۔ اگلے روز اُس نے مجھے اپنی حفاظت میں گاؤں کی حدود سے باہر نکالا۔ اُس کا

خیال تھا کہ لڑکی کا خاوند یا دوسرے وارث میرے لیے کوئی مصیبت کھڑی کر سکتے ہیں۔“

”لڑکی شادی شدہ ہے؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”جی ہاں۔“ ڈھلوں صاحب بولے۔

”خاوند کیسا آدمی ہے؟“

”لوہار کا کام کرتا ہے۔ سنا ہے کافی غصہ آور ہے۔“

”کیا کوئی پھنے خان قسم کا بندہ ہے؟“

”نہیں..... خود تو پھنے خان نہیں لیکن ایک پھنے خان بندے سے اُس کی دوستی ضرور

ہے۔ میرا مطلب گاؤں کے تھانیدار سے ہے۔ اس تھانیدار سے بھی میری مختصر ملاقات ہوئی۔ بڑا سخت گیر شخص ہے۔ ارد گرد کے دیہات میں اُس نے دہشت بٹھار رکھی ہے۔ کسی کو اونچا سانس لینے نہیں دیتا تھا۔ ویسے تو شاید سب انسپکٹر ہے لیکن ڈی آئی جی کی طرح حکومت کر رہا ہے۔“

”کیا نام ہے اُس کا؟“ میرے اندر تجسس جاگا۔

”نام مجھے معلوم نہیں۔ کالا سا ہندو ہے۔ ماتھے پر تلک لگاتا ہے۔ انسپکٹر صاحب مجھے تو دواش ہو رہا ہے کہ لڑکی کے شوہر نے اُس کے ساتھ مل کر انیل کو اغوا کر لیا ہے۔“

ڈھلوں صاحب کی بات سمجھ میں آرہی تھی۔ یہ عین ممکن تھا کہ انیل کسی قسم کی قانونی چارہ جوئی کے لیے شہر آیا ہو اور اس کے دشمنوں نے اُسے پولیس پکھری تک پہنچنے سے پہلے ہی اٹھالیا ہو۔ اس صورت میں اُس کی زندگی شدید خطرے میں تھی۔ میں نے سوچا کہ ایک پولیس پارٹی کو ڈھلوں صاحب کے ہمراہ اس گاؤں میں بھیجوں تاکہ وہاں کے ٹھیک ٹھیک حالات معلوم ہو سکیں۔ اس کے علاوہ اگر انیل تھانیدار کے پاس جس بے جا میں ہے تو اُسے رہائی دلائی جاسکے۔ میں نے ڈھلوں صاحب سے کچھ مزید معلومات حاصل کی اور انہیں تسلی بخشی دے کر واپس بھیج دیا۔ اُسے اگلے روز مجھے اس کیس کے حوالے سے دوسری اہم خبر ملی۔

ٹہر کے شالی حصے میں ایک گندے نالے سے ایک موٹر سائیکل برآمد ہوا ہے۔ موٹر سائیکل کے بانڈات سے پتہ چلا کہ یہ انیل ڈھلوں کے نام رجسٹرڈ ہے۔ ڈھلوں صاحب نے تھانے نما کر بیٹے کا موٹر سائیکل پہچان لیا اور آنسو بہانے لگے۔ یہ عین ممکن تھا کہ انیل موٹر سائیکل نہایت نالے میں گر گیا ہو یا گرا دیا گیا ہو۔ میں نے فوراً عمل کو ہدایت کی کہ نالے میں لاش ڈش کرائی جائے۔

شام تک ان تھک کوشش کے باوجود کسی لاش کا سراغ نہیں ملا۔ اگلے روز میں نے اپنے

شاہ نے آگے بڑھ کر ایک بھوری بھینس کی دُم کو کھائی پر بل دیا۔ وہ زور سے ڈکرائی اور اچھل کر بلال شاہ کی طرف آئی۔ دوسرے لفظوں میں وہ ”دکھری ٹائپ“ کی بھینس نکلی۔ اُس نے بلال شاہ کی بزرگی کی لحاظ کیے بغیر اُسے دے مکر پر مکر مارنی شروع کر دی۔ بلال شاہ اس مصیبت کے لیے ہرگز تیار نہیں تھا۔ اُس کا سر نیچے اور ٹانگیں اوپر ہو گئیں۔ مجھے خدشہ محسوس ہوا کہ کہیں بھینس اپنی مستی میں اس کے اوپر ہی نہ چڑھ جائے۔ میں نے لپک کر بھینس کی دُم کو مروڑا کہ اصل غلطی تو میری ہی تھی لیکن بھینس نے میری طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ اتنے میں ایک آٹھ دس سالہ ننگ دھڑنگ لڑکا شرواپ سے پانی میں کودا اور اُس نے ڈنڈے مار مار کر بھینس کا رخ موڑا۔ میں نے جا کر بلال شاہ کو تھاما۔ وہ اتنا ڈرا ہوا تھا کہ مجھے بھی بھینس سمجھ کر بدکنے لگا۔ اُس کی ناک سے خون بہہ رہا تھا۔ بھینس کو ایک واہیات گالی دے کر اُس نے نہر میں ادھر ادھر دیکھا۔ جیسے پانی میں اینٹ کا ٹونا ڈھونڈنے کی کوشش کر رہا ہو۔ پھر مایوس ہو کر میرے ساتھ دوسرے کنارے کی طرف چل دیا۔ میں نے اُس کھینچ کر پانی سے نکالا۔ اُس کی لمبل کی قمیص دو تین جگہ سے پھٹ چکی تھی۔ شلوار پر بھی تھوڑا سا خون نظر آ رہا تھا۔ میرا ایک پاؤں کا جوتا پانی کے بہاؤ میں کہیں بہ گیا تھا۔ دوسرا بھی اتار کر میں نے نہر کے ”منہ“ پر دے مارا۔ کچھ دیر حواس درست کرنے کے بعد میں نے بلال شاہ سے کہا۔

”چلو شاہ جی کہیں کوئی اور مصیبت نہ پڑ جائے۔“

بلال شاہ کو لہسی بھی آرہی تھی اور رونا بھی۔ بات تھی بھی اس طرح کی۔ یونہی بیٹھے بٹھائے ہم نے مصیبت گلے ڈال لی تھی۔ وہ ہائے ہائے کرتا ہوا اٹھا اور لنگڑاتا ہوا میرے ساتھ چل دیا۔ کہنے لگا۔

”خان صاحب! آپ کی جوتی کا بہت افسوس ہوا۔ اب ننگے پاؤں جانا پڑے گا۔“ وہ اتنا حواس باختہ تھا کہ ابھی تک اُسے اصل نقصان کا علم نہیں ہوا تھا۔ میں نے کہا۔

”شاہ جی! جوتی کو تو خیر دفع کرو۔ اُس سامان کا کہو، جوتہا رے پاس تھا۔“

”کیا مطلب؟“ بلال شاہ چونکا۔

”سوٹ کیس کہاں ہے؟“ میں نے پوچھا۔

بلال شاہ نے اپنے خالی ہاتھوں کی طرف دیکھا اور اُس کے چہرے پر تاریک سایہ لہرا گیا۔ درحقیقت افریقی میں سوٹ کیس اُس کے ہاتھ سے چھوٹ کر پانی میں بہہ چکا تھا۔ بہاؤ کافی تیز تھا اور بہت کم امکان تھا کہ تلاش کرنے پر ہمیں مل جائے گا، لیکن اگر مل بھی جاتا تو نہ ملنے کے برابر تھا۔ کپڑے، کاغذات وغیرہ سب غارت ہو چکے تھے۔ صورت حال سمجھ میں آئی

سب انسپکٹر کی قیادت میں ایک تفتیشی پارٹی ”جاکوٹ“ روانہ کرنے کی تیاری کر لی۔ سفر لمبا تھا اس لیے میں نے انہیں تفصیل سے ہدایات دیں۔ ابھی میں ہدایات دے ہی رہا تھا کہ سارا پروگرام الٹ پلٹ ہو گیا۔ ایس ایس پی صاحب کا فون آیا اور انہوں نے مجھے فوراً ہیڈ کوارٹر بلایا۔ میرے پہنچنے پر انہوں نے بتایا کہ پرکاش ڈھلوں صاحب اُن کے دوستوں میں شمار ہوتے ہیں لہذا اُن کے بیٹے کی بازیابی کے لیے میں اپنی پوری کوشش کروں۔ اس کے علاوہ یہ بھی چاہتے تھے کہ جاکوٹ کے بددماغ تھانے دار کے بارے میں ٹھیک ٹھیک معلومات فراہم کی جائیں۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں آج ہی ایک سب انسپکٹر کو تفتیشی پارٹی کے ساتھ جاکوٹ روانہ کر رہا ہوں۔ ایس ایس پی صاحب نے خواہش ظاہر کی ہے سب انسپکٹر کی بجائے میں خود اس تفتیش پر جاؤں۔

ایس ایس پی کی بات ماننا میرے لیے ممکن نہیں تھا۔ میں نے چارج اپنے سب انسپکٹر کو دیا اور جاکوٹ روانگی کی تیاری کرنے لگا۔ میں نے سوچا کہ اگر مجھے خود ہی جانا ہے تو پھر زیادہ آدمی ساتھ نہیں لے جاؤں گا۔ بہت ہوا تو بلال شاہ کو ہم سفر بنالوں گا۔ کام کرنے کا میرا ایک اپنا انداز ہے اور قارئین اب تک اس انداز کو سمجھ ہی چکے ہوں گے۔

☆=====☆

وہ اپریل کی ایک چمکیلی دوپہر تھی۔ جالندھر سے کوئی چالیس میل دور ہم ایک چھوٹے سے ریلوے سٹیشن پر اترے۔ یہاں سے ایک خستہ حال تانگے میں بیٹھ کر ہم نے کچے راستے پر کوئی چھ کوس کا فاصلہ طے کیا۔ تانگے نے ہمیں ایک چھوٹی سی نہر کے ویران پل پر اتارا۔ ایسی نہروں کو پنجابی میں ”سو“ کہا جاتا ہے۔ اس سوئے کے ساتھ ساتھ ہم جاکوٹ کی طرف روانہ ہوئے۔ ہم دونوں شلوار قمیص میں تھے۔ ایک سوٹ کیس تھا جسے کبھی میں اور کبھی بلال شاہ اٹھا لیتا تھا۔ سوٹ کیس میں میری دو دریاں، بلال شاہ کا ایک جوڑا اور کچھ کاغذات وغیرہ تھے۔ سہ پہر کے وقت ایک عجیب واقعہ رونما ہوا۔ جاکوٹ کی حدود میں داخل ہونے کے لیے ہمیں ایک نہر پار کرنا تھی۔ یہ نہر سوئے سے کافی بڑی اور گہری بھی تھی۔ پل وہاں سے کافی دور تھا اور ہم میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ پل تک پہنچ سکتے۔ لہذا دیہاتیوں کے عام رواج کے مطابق ہم شلواریں چڑھا کر پانی کے اندر داخل ہو گئے۔ پانی ہماری بگلوں تک پہنچ رہا تھا کچھ کالی بھوری بھینسیں بھی وہاں تیر رہی تھیں۔ غلطی میری ہی تھی۔ میں نے بلال شاہ سے کہا کہ وہ کسی بھینس کی دُم پکڑ کر تو رکھائے۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ بھینس بلال شاہ جیسے بھینسے کو نہر پار کرتی ہے یا نہیں۔ میرے گمان میں بھی نہیں تھا کہ بھینس کے ارادے کیا ہیں۔ جونہی بلال

تو بلال شاہ مز کے نہر کی طرف بھاگا، لیکن میں نے لپک کر اُسے تھام لیا۔ ”اب رہنے دو شاہ جی۔ گاؤں سے اور کپڑے لے لیں گے۔ یہ نہ ہو کہ بھینس ابھی تک غصے میں ہو۔“

بلال شاہ مایوسی سے سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ سوٹ کیس میں اُس کی سوار کا پٹا بھی تھا اور غائب اس پٹے کا اُسے زیادہ دکھ تھا۔ میں بلال شاہ کو دلاسہ دینے کی کوشش کر رہا تھا جب قریب سے دھول اڑتی نظر آئی۔ پھر ایک کھٹارہ سی جیپ گھوں گھوں کرتی ہمارے پاس آ کر رُکی۔ جیپ میں سے ایک کا لے کلوٹے پولیس والے نے چہرہ ابھر نکالا۔ اُس کے ماتھے پر سُرخ اور سفید تلک تھا۔ کانوں میں چھوٹی چھوٹی مرکیاں اور ڈاڑھی بڑھی ہوئی تھی۔ اُسے دیکھتے ہی میں سمجھ گیا کہ دھلوں صاحب نے اسی شخص کا ذکر خیر کیا تھا۔ اُس نے ہمیں سر سے پاؤں تک گھورا پھر مشکوک لہجے میں بڑی بدتمیزی سے بولا۔ ”ابے کہاں سے آت ہو؟“ پھر خود ہی بولا۔ ”لگتا ہے کہیں سے بھاگے ہوئے ہو۔“

میرے دل میں نہ جانے کیا کہ آئی میں نے مسکین لہجے میں کہا۔ ”ندی پار سے آئے ہیں جی۔ شہر جا رہے ہیں روز گار کی تلاش میں۔“

اُس نے بیڑی کا ایک زوردار کش لیا۔ ”حرام جادو۔ روج گار کی تلاش میں یا رسہ گیری کرنے نکلے ہو۔“

بلال شاہ نے بھنا کر کچھ کہنا چاہا مگر میں نے آہستہ سے اُس کا ہاتھ دبا دیا اور اُسی لہجے میں بولا۔ ”نہیں مائی باپ ہم تو سیدھے سادے لوگ ہیں۔ چھوٹے چھوٹے بچے ہیں ہمارے۔“

تھانیدار نے اپنے پیچھے بیٹھے ایک مجرم شخص سے پوچھا۔ ”آخر وکے بچے جانتا ہے ان دونوں دُم چھلوں کو۔“ خیر وکے نفی میں سر ہلایا۔ تھانیدار نے لال پیلی آنکھوں سے ہمیں گھورا پھر کانٹھیل سے بولا۔ ”ذرا اتلاسی لو ان دونوں بھڑووں کی۔“

اپنے لیے بھڑوے کے لقب پر بلال شاہ تملکا کر رہ گیا۔ کانٹھیل نے نیچے اتر کر بڑی بے تکلفی سے ہماری تلاشی لی۔ بلال شاہ کی جیب سے ایک موچنا اور چند روپے کی ریز گاری نکلی۔ میری جیب میں سوائے ایک چابی کے کچھ نہیں تھا اور یہ چابی تھی اُسی ”بے وفا“ سوٹ کیس کی جو ہمارا سب کچھ لے کر نامعلوم سمت روانہ ہو گیا۔ تھانیدار نے چابی کو غور سے دیکھا پھر نظروں کو ترچھا کر کے بڑے ماہرانہ انداز سے مجھے گھورنے لگا۔ گالی دے کر بولا۔ ”ابے لبوترے، یہ ولاتی سوٹ کیس تیری جو روچھ میں لائی تھی کیا؟“

میں نے کہا۔ ”مم..... مائی باپ راستے میں پڑی چمک رہی تھی۔ میں نے اٹھالی۔ مجھے

نہیں معلوم سوٹ کیس کی ہے یا کسی اور شے کی۔“

”ہوں، رستے میں پڑی چمک رہی تھی۔“ اُس نے مضحکہ خیز انداز میں سر اوپر نیچے ہلایا۔ پھر کانٹھیل سے گرج کر بولا۔ ”بٹھان دونوں بھڑووں کو جیپ میں۔ تھانے لے جا کر پوچھوں گا ان سے۔“

میں نے گھبرانے کی اداکاری کی۔ کانٹھیل نے ہمیں دھکیلتے ہوئے جیپ میں بٹھادیا لیکن شرافت ملاحظہ ہو کہ نشستوں پر نہیں بٹھایا نیچے فرش پر جگہ دی۔ بلال شاہ غصے میں بری طرح کھول رہا تھا۔ اگر میں نے منع نہ کیا ہوتا تو وہ اب تک سارا بھانڈا پھوڑ چکا ہوتا۔ دو ہیڈ کانٹھیلوں کے قدموں میں بیٹھے ہوئے ہم نے سفر جاری رکھا۔ وہ دونوں مسلسل بلال شاہ کی پھٹی ہوئی قمیص کو گھور رہے تھے۔ ایک نے مونچھوں کو تاؤ دے کر کہا۔

”موٹے! یہ کہاں سے پھڑوا کے آیا ہے۔“

بلال شاہ کی بجائے میں نے کہا۔ ”جناب! راستے میں ایک مارنے والی بھینس سے ٹاکرا ہو گیا تھا۔ میری جوتی بھی نہر میں چلی گئی۔“

کانٹھیل بولا۔ ”جوتیوں کی تو پروا نہ کرو۔ وہ تو بڑی مل جائیں گی تمہیں۔“

دوسرے کانٹھیل سے آہستہ سے کہا۔ ”اگر کوئی کام دکھایا ہے تو بڑے تھانیدار صاحب کو جج بتا دو۔ ورنہ بہت بری طرح پھنسو گے۔ پانی پلا کر ماریں گے اور اوپر سے چیخنے بھی نہیں دیں گے۔“

دوسرے کانٹھیل نے سرگوشی کی۔ ”اگر گھر میں کوئی جوان بہن یا بیوی ہے تو اُس کا ہی خیال کر لو۔ تھانیدار جی سب کو تھانے بلا لیتے ہیں..... چلو شاباش جج بتا دو کہاں سے لی تھی یہ چابی؟“

اتنے میں جیپ میں ایک دھچکا لگا اور وہ تھوڑی دور چلنے کے بعد ”سنگ“ کرنے کے بعد رُک گئی۔ بڑے تھانیدار صاحب نے جیپ کو ایک بڑی گالی دی۔ ڈرائیور جو ایک احمق کانٹھیل تھا کچھ دیر چابی گھا کر اُسے اشارت کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ پھر مایوسی سے سر ہلانے لگا۔ بڑے تھانیدار نے کہا۔ ”چلو ان دونوں کو اتارو نیچے۔“ اُس کے حکم پر ہمیں نیچے اتار دیا گیا۔ ایک کانٹھیل قریبی کھیت سے ایک اور مزدور کو پکڑ لایا۔ ہم تینوں کو دھکا لگانے پر لگادیا تھا۔ ”وڈا تھانیدار“ اور اُس کے تینوں کانٹھیل بڑے ٹھٹ سے جیپ میں بیٹھ رہے۔ بلال شاہ بار بار غصیلی نظروں سے مجھے گھور رہا تھا۔ میں اُس کے غصے پر اندر ہی اندر ہنس رہا تھا۔ درحقیقت میرا ایسا ڈرامہ کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ ”وڈے تھانیدار“ سے گفتگو کا آغاز

”تھی ٹو نے؟“

میں نے کہا۔ ”مائی باپ! یہ شہر کی طرف میرا دوسرا سفر ہے۔ ایک دفعہ پہلے بھی سال ڈیڑھ سال رہ کے آیا ہوں۔“

وڈے تھانیدار نے آزمائشی طور پر مجھے جیب سے چھیڑ چھاڑ کرنے کی اجازت دے دی۔ میں نے ٹول بکس سے اوزار نکالے۔ بونٹ اٹھا کر دیکھا۔ پلگ چیک کیے۔ پھر نظر بیٹری کے ایک تار پر پڑی۔ وہ بظاہر بیٹری سے جڑا ہوا تھا لیکن اصل میں جل چکا تھا۔ میں نے پلاسٹک چھیل کر نیا تار نکالا اور بیٹری سے لگا دیا۔ جیب اسٹارٹ ہو گئی۔ بیدی بڑا خوش نظر آ رہا تھا۔ اُس نے میرے کندھے پر ایک زوردار دھپ جمایا اور بولا۔

”اے مُسلے تو تو بڑا کایاں نکلا۔ کیا نام ہے تیرا اور کس گاؤں کا ہے تو؟“

میں شیکھر بیدی کی میز کے سامنے چارپائی پر جا بیٹھا اور اُس کے سوالوں کے جواب دینے لگا۔ تھوڑی ہی دیر بعد مجھے شیکھر بیدی کی باتوں سے اندازہ ہو گیا کہ وہ اپنی بڑھی کھوسٹ جیب کے لیے مجھے مستقل طور پر خدمت گار رکھنا چاہتا ہے، بلکہ اُس نے اشاروں اشاروں میں مجھے یہ بھی سمجھا دیا کہ اگر میں نے اس ”خدمت“ سے جان چھڑانے کی کوشش کی تو وہ زبردستی بھی ایسا کر سکتا ہے اور اس زبردستی کے لیے ولایتی صندوق کی چابی بہت کافی تھی۔ غالباً شیکھر بیدی ٹھیک کہہ رہا تھا۔ اُس جیسا شخص اس چابی کے ذریعے کسی شخص کو حوالات میں تو کیا پھانسی کے تختے پر بھی پہنچا سکتا تھا۔ میرا کام خود بخود بنتا جا رہا تھا۔ میں تو آیا ہی اس گاؤں میں رہنے کے لیے تھا۔ اب شیکھر بیدی خود مجھے اس گاؤں میں رکھنے پر تیار ہوا تھا۔ اُس نے کمال مہربانی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”نوازے! تو میری جیب کی ڈرائیوری بھی کرے گا اور اس سارے کام کے لیے میں تجھے پچیس روپے ماہوار پگاردوں گا۔ دس گھی اور مرغی پھیل کھانے کو علیحدہ ملے گا۔ مجھے میں رہے گا۔“

میں نے کہا۔ ”مائی باپ اور میرا بھائی۔“

وہ کچھ دیر ہٹے کٹے بلال شاہ گھوڑ تار ہا اور پھر بولا۔ ”یہ کون سا کام جانت ہے؟“

میں نے بلال شاہ کو شرارت سے دیکھ کر کہا۔ ”مائی باپ! غریب کا بچہ ہے جو کام دے دیں گے کرے گا۔“

بیدی نے کہا۔ ”ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ ابھی اسے اپنے پاس رکھو۔ میں سوچوں گا اس کے لیے۔“

☆=====☆=====☆

میں نے ہنسی مذاق کے موڈ میں کیا تھا اور سوچا تھا کہ تھوڑی دیر میں اُسے حقیقت بتا دوں گا لیکن اب نہ جانے کیوں میرا دل چاہ رہا تھا کہ ہمارے اور ان لوگوں کے درمیان جو پردہ پڑ گیا ہے وہ پڑا ہی رہے۔ اس پردے سے بہت سے فائدے حاصل ہو سکتے تھے..... بلال شاہ کے بار بار گھورنے اور دانت پینے کے باوجود میں نے اپنی خاموشی برقرار رکھی اور گاڑی کو دھکا لگاتا رہا۔ جاکوٹ میں بھی ہم اسی طرح داخل ہوئے۔ جیب کو دیکھتے ہی لوگ سڑک کے کناروں پر ہو جاتے اور ہاتھ اٹھا کر سلا کرتے اور مودب کھڑے رہتے۔ ہم تھانے کے احاطے میں داخل ہوئے تو پسینے سے شرابور ہو رہے تھے۔ کانشیلوں نے کھیت مزدور کو چھٹی دے دی اور ہم دونوں کو ایک جانب چارپائی پر بٹھادیا۔

وڈے تھانیدار نے شاہانہ حکم دیا۔ ”کرم دین اور فضلے کو حاضر کرو۔“

دو سپاہی گئے اور تھوڑی ہی دیر میں کرم دین اور فضلے کو لے کر آ گئے۔ یہ دو میلے کچیل شخص تھے۔ جیسا کہ بعد میں پتہ چلا وہ سائیکل مستری تھے۔ کبھی کبھار ڈیزل انجن وغیرہ بھی ٹھیک کر لیتے تھے۔ وڈے تھانیدار نے انہیں گھور کر دیکھا اور کڑک کر مرغا بننے کا حکم دیا۔ وہ دونوں پہلے تو گھبرائے۔ پھر مثنیٰ انداز میں جھکے اور ٹانگوں کے نیچے سے ہاتھ نکال کر مرغا بن گئے۔ اس اہم کام سے فارغ ہو کر وڈا تھانیدار ہماری طرف متوجہ ہوا۔ پہلے اُس نے کسی اصل مرغے کی طرح ہمارے چاروں طرف چکر لگایا۔ اچھی طرح گھورا، غور کیا پھر بولا۔

”ہاں میرے شہزادو۔ کیا ارادے ہیں؟ سچ سچ بتاؤ ہو یا کان پکڑو ادوں تم کو بھی؟“

میں نے کہا۔ ”مائی باپ! اگر ہمارا قصور ان جیسا ہے تو پھر بے شک کان پکڑو ادیں لیکن اگر.....“

وہ میری بات کاٹ کر بولا۔ ”بھڑو! قصور تو ان کا تمہارے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہے۔ ان سے تو میری گاڑی ٹھیک نہیں ہوئی..... اور تم نے مارا ہے ڈاکہ اور ڈاکہ بھی کوئی چھوٹا موٹا نہیں۔“

تھانیدار کی بات سے میں سمجھ گیا کہ مرغا بننے والوں کا قصور صرف اتنا ہے کہ وڈے تھانیدار کی کھٹارہ جیب ٹھیک کرنے میں کامیاب نہیں ہوئے تھے۔ میں نے ڈاکے والی بات نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ”مائی باپ! اگر آپ کی آگیا ہو تو میں جیب کو ٹھیک کر کے دیکھوں۔“

وڈے تھانیدار نے جس کا اصل نام شیکھر بیدی تھا، ایک قدم پیچھے ہٹ کر مجھے غور سے دیکھا۔ ”اے، تو ابھی تو کہہ رہا تھا روج گار کے لیے شہر جا رہا ہے۔ یہ موٹر مین کی کہاں سے

تھیں۔ شیکھر بیدی کہہ رہا تھا۔ ”بتنی کو پتی کا حکم ماننا چاہیے جو ایسا نہیں کرتی وہ بتنی کہلانے کی حق دار ہی نہیں۔ سوٹ کر دینا چاہیے اُس کو۔“
دوسرے شخص کی آواز آئی۔ ”سرکار، کیسے سمجھاؤں میں اس کو۔ اُسے تو میری عزت ہے عزتی کا پاس ہی نہیں رہا۔“

بیدی بولا۔ ”بھگتو! ایسا کر، اُسے میرے پاس بھیج۔ میں سمجھاؤں گا اس کو۔ دیکھتا ہوں کیسے نہیں مانتی۔ یہ ہم دونوں کی عجت کا سوال ہے۔“
دوسرا شخص جسے بیدی نے بھگتو کہا تھا کچھ دیر خاموش رہا پھر مسکین آواز میں بولا۔
”ٹھیک ہے سرکار، میں آج شام کے بعد اُسے لے کر آؤں گا۔“

اتنے میں ایک کانسیبل آتا دکھائی دیا۔ میں جلدی سے جتن اٹھا کر اندر داخل ہو گیا۔
بیدی خشک لہجے میں بولا۔ ”اوئے نوازے! تجھے تیرے باپ نے تیج نہیں سکھائی۔ افسر کے کمرے میں اس طرح منہ اٹھا کر چلے آتے ہیں؟ آواج کیوں نہیں دی پہلے؟“
میں نے دل ہی دل میں اُس پر لعنت بھیجی۔ پھر شرمندگی سے کہا۔ ”معافی چاہتا ہوں مائی باپ! دراصل یہ پُر زہ تھا، بالکل سیدھا سادا ہے اگر کوئی لوہار یہاں گاؤں میں ہی ڈھال دے تو شہر نہ جانا پڑے گا۔“

بیدی نے کہا۔ ”ابے یہ لوہار تیرے سامنے ہی تو بیٹھا ہے۔ جو چاہے اس سے ڈھلوا لے۔ بڑا خزانہ کارِ گمیر ہے۔ صرف ایک بتنی ہے جو اس کے سانچے میں نہیں ڈھلتی۔“ اب مجھے یقین ہو چکا تھا کہ یہی جولاں کا شوہر ہے۔ میں نے بتنی والی بات نظر انداز کرتے ہوئے پُر زہ بھگتو کو دکھایا اور اُس سے باتیں کرنے لگا۔ میرا مقصد یہی تھا کہ بھگتو کے طور اطوار کا پتہ چلے۔ جلد ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ ایک جاہل سا بزدل شخص ہے اور اُس سے ہرگز توقع نہیں کی جاسکتی کہ اُس نے اپنے طور پر انیل کو کوئی نقصان پہنچایا ہوگا۔

شام تک میں بڑی شدت سے جولاں اور بھگتو کا انتظار کرتا رہا۔ آخر اندھیرا پھیلنا اور خدا خدا کر کے وہ دونوں تھانے کے دروازے پر نظر آئے۔ بھگتو نے سکھوں کا مخصوص لباس پہن رکھا تھا۔ یعنی دھوتی قمیص اور پگڑی۔ جولاں نے بھی لاچا اور لمبی سی ڈوریے والی قمیص پہن رکھی تھی۔ ایک ٹاسے کی چادر سے اُس نے منہ سر لپیٹا ہوا تھا۔ اُسے دیکھ کر ایک سنتری نے ٹھنڈی آہ بھری اور منہ میں گنگٹا نے لگا۔

دین سوئی دی چال میں تن من ساڑ لیا
ٹالی نوں جھما ماریا تے گھوتا پھاڑ لیا

ڈھلوں صاحب نے درست اندازہ لگایا تھا۔ یہ پورا گاؤں وڈے تھانیدار یعنی سرب انسپکٹر شیکھر بیدی کے زیر اثر تھا۔ اُس کی اجازت کے بغیر کوئی چڑیا بھی پر نہیں مار سکتی تھی۔ سیدھے سادے اُن پڑھ لوگ تھے۔ شہروں کی روشنی سے بہت دور تھے۔ لہذا بیدی ہی ان کے لیے سب کچھ تھا۔ میں نے اگلے دو تین روز میں کوشش کی کہ گاؤں کے اندرونی حالات معلوم ہو سکیں لیکن اس کے سوا کچھ پتہ نہ چلا کہ دو ہفتے پہلے گاؤں کی جولاں نامی لڑکی ایک پردیسی ڈاکٹر انیل کے ساتھ پکڑی گئی تھی۔ گاؤں والے ڈاکٹر کا قصہ تمام کر دینا چاہتے تھے مگر وہ جان بچا کر نکل گیا۔ یہ باتیں مجھے تھانے ہی کے ایک کانسیبل سے معلوم ہوئی تھیں۔ صاف طور پر محسوس ہو رہا تھا کہ کانسیبل مجھ پر پورا پورا بھروسہ نہیں کر رہا اور بہت کچھ چھپا رہا ہے۔ عام لوگوں کی طرح اُس کے دل میں بھی ”وڈے تھانیدار“ کا خوف بیٹھا ہوا تھا۔

مجھے ایک شک یہ بھی تھا کہ ہو سکتا ہے مغوی انیل کو تھانے ہی میں قید رکھا گیا ہو۔ میں نے تھانے کی عمارت میں اچھی طرح گھوم پھر کر دیکھا لیکن اُس کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ ایک بار پھر مجھے فکر پڑ گئی کہ کہیں انیل کو ہلاک ہی تو نہیں کر دیا گیا۔ اُسے ہلاک کرنے والا کون ہو سکتا تھا؟ شیکھر بیدی، لڑکی کا شوہر یا کوئی اور؟ گاؤں میں آئے ہوئے مجھے چوتھا روز تھا لیکن میں ابھی تک لڑکی جولاں یا اُس کے شوہر کو نہیں دیکھ سکا تھا۔ مگر پانچویں روز میری یہ مشکل خود بخود آسان ہو گئی۔

میں تھانے کے احاطے میں اُس بڑھی کھوسٹ قریب المرگ جیپ کے پاس چارپائی ڈالے لیٹا تھا کہ بلال شاہ تیز تیز چلتا میری طرف آیا۔ اُس کا حلیہ دیکھنے کے قابل تھا۔ اُس نے صرف ایک بنیان پہن رکھی تھی۔ ایک پھٹی پرانی دھوتی کونگٹ کی طرح کسا ہوا تھا۔ ہاتھ کہیں تک صابن کی جھاگ میں لتھڑے ہوئے تھے۔ دراصل ”وڈے تھانیدار“ نے اُس کی ”غربی“ پر ترس کھاتے ہوئے اُسے تھانے کی لائڈری میں دھوبی لگا دیا تھا۔ اب بے چارہ سارا دن سپاہیوں کی وردیاں اور دھوتیاں گرتے دھوتا رہتا تھا۔ اتنی سخت محنت اوپر سے ایک چنگی نسوار کی نہیں مل رہی تھی۔ برا حال تھا اُس کا۔ میرے پاس آکر اُس نے کہا۔

”خان صاحب! ابھی میں اندر دفتر میں کالو بیدی کے کپڑے لینے گیا تھا۔ وہاں ایک لڑکا بیٹھا ہوا ہے۔ اُس کے لباس اور حلیے سے لگتا ہے کہ لوہار کا کام کرتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہی جولاں کا شوہر ہے۔“ (بلال شاہ وڈے تھانیدار کو کالو بیدی کہتا تھا)

یہ خبر میرے لیے بے حد اہم تھی۔ میں نے یونہی جیپ کا ایک پُر زہ نکالا اور ٹھٹھا ہوا بیدی کے کمرے کی طرف چلا گیا۔ جتن کے دوسری طرف سے باتیں کرنے کی آوازیں آ رہی

میں نے کہا۔ ”سنتری بادشاہ۔ بڑے دل کو لگی ہے تمہارے۔“

وہ بولا۔ ”بھرا جی اے شے ای ایسی ہے۔ جدھروں لنگ جاوے سیاپا پاندی اے (بھائی صاحب! یہ چیز ہی ایسی ہے جہاں سے گزر جائے مصیبت ڈال دیتی ہے)

میں نے کہا۔ ”سنتری بادشاہ یہ ”مصیبت“ تھانے کیا کرنے آئی ہے؟“

سنتری بولا۔ ”افسروں کی باتیں افسر ہی جانیں۔ خیال ہے کہ بھگتو اُسے ڈرانے دھمکانے کے لیے ”وڈے تھانیدار“ کے پاس لایا ہے۔ اُس کے اپنے قابو میں تو رہی نہیں۔ ہو سکتا ہے وڈے تھانیدار کے ڈر سے اپنی حرکتیں چھوڑ دے۔“

”کیسی حرکتیں؟“ میں نے پوچھا۔

سنتری نے لوفروں کی طرح ایک آنکھ دبائی اور بولا۔ ”بھولے بادشاہ وہی

حرکتاں..... بے برکتاں.....“

وڈے تھانیدار کے کمرے میں ہونے والی گفتگو کوئی پون گھنٹہ جاری رہی۔ آدھے گھنٹے تک بھگتو بھی کمرے میں موجود رہا۔ پھر وہ باہر آگیا اور دس پندرہ منٹ تھانیدار اور جولائے کے درمیان تنہائی میں گفتگو ہوئی۔ آخر جولائے بھی باہر نکل آئی اور اپنے شوہر کے ساتھ سر جھکا کر چلتی تھانے کے احاطے سے باہر نکل گئی۔

یہ سارا معاملہ کچھ الجھا ہوا تھا۔ سمجھ نہیں آرہی تھی کہ یہ کیا چکر چل رہا ہے۔ شاید جولائے کا شوہر اور تھانیدار اُسے کسی غیر اخلاقی کام پر مجبور کر رہے تھے۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ غیر اخلاقی کام جولائے خود کر رہی ہو اور وہ اُسے راہ راست پر لانا چاہتے ہوں۔ شادی شدہ ہونے کے باوجود جولائے کا انیل سے کیا تعلق تھا اور گاؤں والے اُسے جھمک چھلو اور فتنہ پرور کیوں سمجھتے تھے؟ ایسے ہی بہت سے سوال میرے ذہن میں سر اٹھارہے تھے۔

☆=====☆=====☆

یہ اگلے روز کی بات ہے۔ علی الصبح بیدی تیز قدموں سے تھانے میں داخل ہوا۔ اُس کے ساتھ ایک اے ایس آئی اور دو رائفل مین بھی تھے۔ میں اس وقت سو رہا تھا۔ بیدی نے چارپائی کو ٹھوکر مار کر مجھے جگایا اور فوراً جیپ نکالنے کا نادر شاہی حکم صادر کیا۔ میں سمجھ گیا کہ کسی مجرم کا پیچھا کرنا ہے۔ جونہی میں نے جیپ شارٹ کی۔ بیدی اچک کر اندر داخل ہو گیا۔ عملے نے بھی اُس کی تقلید کی۔

”ڈیک نالے کی طرف چلو۔“ اُس نے گرج کر کہا۔

میں نے جیپ کا رخ گاؤں کی شمالی جانب ڈیک نالے کی طرف کر دیا۔ قریباً دس منٹ

بعد ہم ڈیک نالے کے کنارے ایک جھوپڑے کے سامنے پہنچے۔ گھاس پھوس اور لکڑی سے بنا ہوا یہ جھوپڑا کسی ملاح کا تھا۔ کنارے پر دو کشتیاں بھی ہلکورے لے رہی تھیں۔ ایک کشتی چھوٹی اور دوسری بڑی تھی۔ جیپ کی کان پھاڑ آواز سن کر ایک اُدھیڑ عمر عورت اور ایک چودہ پندرہ سال کی لڑکی باہر نکل آئی۔ دونوں نے میلے کپلے کپڑے پہن رکھے تھے۔ بیدی کو اپنے سامنے دیکھ کر وہ دونوں تھر تھرا کر پنے لگیں۔ بیدی پھنکارتا ہوا جیپ سے اترا اور پھر اُس نے آگے بڑھ کر اُدھیڑ عمر عورت کو بالوں سے پکڑ لیا اور گھسیٹ کر جیپ کے پاس لے آیا۔ پھر گالیوں کی بو چھاڑ کرتے ہوئے بولا۔

”حرام جادی، سالی! کہاں بھگایا ہے بیٹے کو جلدی بتا۔ ورنہ ابھی پانی میں غوطے دے کر مار دوں گا۔“

عورت نے واسطے دیتے ہوئے کہا کہ اُسے کچھ معلوم نہیں۔ وہ ماں بیٹی تو خود رات سے پریشان ہیں۔ بیدی نے عورت پر تھپڑوں کی بارش کر دی۔ پھر نو عمر لڑکی کو ایک طرف دھکیل کر جھوپڑے میں داخل ہو گیا۔ اُس نے اچھی طرح سے جھوپڑی کی تلاشی لی۔ پھر ماں بیٹی کو جیپ میں بٹھالیا اور انہیں کہا کہ وہ پولیس کو انوپ سنگھ کے ٹھکانے پر لے جائیں ورنہ پولیس انہیں اپنے ٹھکانے پر لے جائے گی اور پھر ان دونوں کے ساتھ جو کچھ ہوگا اُس کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتیں۔ وڈے تھانیدار کی دھمکیوں اور ننگی گالیوں سے گھبرا کر وہ دونوں مہربی طرح رو رہی تھیں۔ تھانیدار انہیں گاہے بگاہے جھانپ رہی رسید کر دیتا تھا۔ اُس نے انہیں مجرموں کی طرح جیپ کے فرش پر بٹھا رکھا تھا۔ اُس کا چنگیز خانی رویہ دیکھ کر میرا خون کھول رہا تھا لیکن اس وقت میں صرف ایک ڈرائیور تھا جو اس علاقے کے بے تاج بادشاہ کو ”قانون سکھا“ کر اپنی عاقبت خراب نہیں کر سکتا تھا۔ تھانیدار اور عملے کی باتوں سے جلد ہی مجھ پر یہ انکشاف ہو گیا کہ بھگتو کی بیوی جولائے رات اپنے ایک پرانے یار کے ساتھ فرار ہو گئی ہے۔ اس شخص کا نام انوپ سنگھ تھا اور اب ہم اُس کی تلاش میں جا رہے تھے۔ دراصل آدھی رات کو بھگتو کے کسی جاننے والے نے اُسے گہری نیند سے جگا کر پوچھا تھا کہ تمہاری بیوی کدھر ہے؟ بھگتو نے کہا تھا گھر میں ہے۔ تم کیوں پوچھ رہے ہو۔ اُس شخص نے کہا تھا ذرا جا کر نوکھو تو سہی۔ بھگتو اندر گیا اور چند ہی لمحوں میں گھبرایا ہوا واپس آگیا تھا..... بتانے والے نے اُسے بتایا تھا کہ وہ انوپ سنگھ کے ساتھ ایک سائڈنی پریشی ہوئی پہاڑ کی طرف یعنی شمال کی طرف جا رہی تھی۔ بھگتو کچھ دیر تو سکتے میں رہا تھا۔ پھر بھاگا بھاگا اپنے خیر خواہ شیکھر بیدی کے پاس پہنچا تھا..... اور اب ہم انوپ سنگھ اور جولائے کی تلاش میں تھے۔ بھگتو بھی ہمارے ساتھ تھا۔ اُس

جار ہے ہیں۔ جونہی وہ ہمارے پاس آیا۔ بلال شاہ نے اٹھ کر ایک زوردار ٹھاپ اُس کے تانبے پر لگائی پھر لنگرائی دے کر اُسے کھیت میں گرا دیا۔ میں بھی لپک کر اُس کے سر پر پہنچ گیا۔ ایک ایک ڈاکے کے چہرے پر بے پناہ خوف نظر آنے لگا۔

میں نے ایک ہاتھ سے اُس کی گردن کو دو بوجا اور غرا کر کہا۔ ”کل تم ڈیک نالے کے کنارے چوہدریوں کے کھیت میں کیا کر رہے تھے.....“

میرے سوال نے اُسے بری طرح بوکھلا دیا۔ ہکلا کر بولا۔ ”چوہدریوں کے کھیت میں..... میں تو نہیں گیا تھا۔“

اُس کا جواب اُس کے حق میں اور بھی برا ثابت ہوا۔ اگر وہ کہہ دیتا کہ میں وہاں پیشاب وغیرہ کرنے کے لیے بیٹھا ہوا تھا تو مجھے الجھن ہو سکتی تھی۔ مگر وہ تو صاف مکر گیا تھا۔ اُس کے انکار نے میرے شک کو مضبوط کر دیا۔ میں نے اُس کا منہ ڈھانپ لیا اور بلال شاہ نے میرے اشارے پر بے دریغ اُس پر ٹھوکروں اور مکوں کی بارش کر دی۔ شاید وہ دھوبی گھاٹ کا سارا غصہ اُس پر اتار دیتا لیکن میں نے اُسے منع کر دیا۔ ڈاکیہ اب بری طرح کراہ رہا تھا۔ میں نے اُسے گریبان سے پکڑ کر جھٹکا دیا اور بتایا کہ ہم ”وڈے تھاندار“ کے بھیجے ہوئے اُس کے پاس آئے ہیں اور اگر اُس نے سچ نہ اگلا تو پھر اُسے تھانے لے جانا پڑے گا اور یوں گاؤں والوں کے سامنے بے عزتی کا سن کر ڈاکیہ کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ وہ احسان مندی کی نظروں سے ہمیں دیکھنے لگا۔ جیسے خاموشی کی زبان میں کہہ رہا ہو، میں کس زبان سے آپ کا شکریہ ادا کروں کہ آپ نے کھیت میں مجھے پھینٹی لگائی اور حشر نشر سے بچایا۔ وہ سمجھ چکا تھا کہ اب بری طرح پھنس چکا ہے اور چھپانے سے کچھ فائدہ نہیں۔ اُس کا رنگ مٹی کی طرح زرد ہو چکا تھا۔

اُس نے اپنا نام زکریا بتایا اور لڑتے کانپتے لہجے میں انکشاف کیا کہ کل وہ ملاح انوپ کا ایک پیغام لے کر اُس کی ماں اور بہن کے پاس آیا تھا..... میرے لیے یہ ایک نہایت اہم خبر تھی۔

اس کا صاف مطلب تھا زکریا، انوپ سنگھ کے ٹھکانے سے آگاہ ہے۔ یہ ہماری بہت بڑی کامیابی تھی۔ میں نے دلی مسرت کو چھپاتے ہوئے پوچھا۔ ”اب انوپ اور جولاں کہاں ہیں؟“

اُس نے ہارے ہوئے انداز میں سر جھکایا اور بولا۔ ”بچی ڈھیری گاؤں میں انوپ کا ایک یار رہتا ہے۔ اس وقت دونوں اُس کے ڈیرے پر ہیں۔“

کے چہرے پر وہی شرمندگی تھی جو ایک بھاگ جانے والی بیوی کے شوہر کا مقدر ہوتی ہے۔ انوپ کی ماں اور بہن کی نشاندہی پر ہم نے کم از کم چار مقامات پر چھاپے مارے لیکن مفرور جوڑے کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ بیدی نے انوپ کے دودوستوں کو شک کے تحت گرفتار کیا۔ ان میں ایک اُسی کی طرح ملاح تھا اور دوسرا ترکھان۔ اُن دونوں کو پیچھے باندھ کر نئے پاؤں دوڑاتا ہوا وہ واپس جا کوٹ آ گیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ انوپ کی ماں اور نو عمر بہن کو بھی تھانے لے جائے گا۔ پھر شاید اُس کے دل میں کچھ رحم آ گیا۔ اُس نے انہیں ڈرا دھمکا کر جھوپڑے میں واپس چھوڑ دیا۔ اور صاف الفاظ میں دھمکی دی کہ اگر اُن دونوں نے فرار ہونے کی کوشش کی تو وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گی۔

جس وقت ہم جھوپڑے سے رخصت ہو رہے تھے اچانک میری نگاہ ایک شخص پر پڑی اور میں بری طرح ٹھنک گیا۔ یہ شخص گاؤں کا ڈاکیہ تھا۔ عمر کوئی پچیس سال رہی ہوگی لیکن سر سے بالکل گنجا تھا۔ شاید کسی بیماری کی وجہ سے ایسا ہو گیا تھا۔ میں نے اُس کا گنجا سر گندم کے ایک کھیت میں سے نکلتے دیکھا۔ ایک لمحے کے لیے اُس نے جھوپڑے کی طرف دیکھا پھر اُس کی نظر پولیس پر پڑی اور وہ پلک جھپکتے میں نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ یہ منظر شاید میرے سوا کوئی بھی نہ دیکھ سکا تھا۔ میرے دل میں ایک شبہ سا سر اٹھانے لگا۔ اگر میں ”وڈے تھاندار“ صاحب کو اس شبے سے آگاہ کر دیتا تو یقیناً وہ ڈاکیہ کو اُسی وقت گرفتار کر لیتا مگر میں اس معاملے کو اپنے طور پر دیکھنا چاہتا تھا۔

شام کا وقت تھا۔ دھوپ گندم کے ادھ پکے کھیتوں کو الوداعی بوسہ دے رہی تھی۔ دور کہیں کسی رہٹ کے چلنے کی صدا پرندوں کی چچہاہٹ میں ڈوب اُبھر رہی تھی۔ بڑا سہانا منظر تھا۔ میں اور بلال شاہ ایک کھیت کے منڈیر پر بیٹھے کسی کا انتظار کر رہے تھے۔ ایسے موسم میں ”انتظار“ کی بات سے شاید آپ سمجھیں گے کہ ہم تپتی کمر اور لال گالوں والی کسی الہڑنیار کا انتظار کر رہے تھے لیکن نہیں..... یہ انتظار ایک ڈاکیہ کا تھا اور ڈاکیہ بھی گنجا پانی، جسے دیکھ کر موسم کی ساری اُمنگ ترنگ رنچو پکڑ ہو جائے۔ ہم دونوں کے منہ میں کیکر کی سواکیں تھیں اور آنکھیں پگڈنڈی پر لگی تھیں..... میں معلوم کر چکا تھا کہ گاؤں سے واپسی پر ڈاکیہ ہر روز اس پگڈنڈی سے گزرتا ہے۔ آخر کار صاحب بہادر جمومتے جھامتے، اچھلتے پھلاکتے اپنی طرف آتے دکھائی دیے۔ بغل میں ڈاک کا بستہ اور کان پر پنسل تھی۔ ٹنڈ کا تانبہ سنہری دھوپ میں آتشیں گولے کی طرح چمک رہا تھا۔ ہمیں دیکھ کر اُس نے سلام کیا۔ اُسے معلوم تھا ہم تھانے کے نئے ملازم ہیں..... لیکن یہ ہرگز معلوم نہیں تھا کہ یہ ”نئے ملازم“ اُس کے ساتھ کیا کرنے

میں نے کہا۔ ”تمہیں اُن دونوں کا پتہ کیسے چلا؟“

وہ بولا۔ ”میں پکی ڈھیری میں ڈاک بانٹنے گیا تھا۔ انوپ نے مجھے دیکھ لیا اور اپنے ساتھ ڈیرے پر لے گیا۔ انوپ کا مجھ پر ایک بہت بڑا احسان ہے جی۔ ایک دفعہ سیلاب میں اُس نے مجھے اور میری ماں کو ڈوبنے سے بچایا تھا۔ جب انوپ نے مجھ سے کہا کہ میری ماں اور بہن کے نام خط لکھو اور اُن تک پہنچا دو تو میں انکار نہ کر سکا۔ کل میں انہیں انوپ کا خط سنانے کے لیے وہاں پہنچا تھا لیکن پولیس کو دیکھ کر گھبرا گیا اور واپس چلا گیا۔“

اب ساری بات سمجھ میں آرہی تھی۔ انوپ نے ماں کو اپنی اچانک گمشدگی کی وجہ بتانے کے لیے ڈاکیز زکریا کو بھیجا تھا۔ مگر وہ میرے ہتھے چڑھ گیا۔ میں نے دیکھا زکریا اب پھوں پھوں کر کے رو رہا تھا۔ اُس نے پھٹی پھٹی آواز میں کہا۔ ”کیسا بد قسمت ہوں میں بھی۔ اپنے محسن کا احسان اتارنے نکلا تھا، اُلٹا اُن کے لیے مصیبت بن گیا۔“

مجھے زکریا کے رونے پر کچھ شک سا ہو رہا تھا۔ یوں لگتا تھا دکھاوے کے لیے رو رہا ہے۔ میں نے پولیس والوں کے خاص انداز میں اچانک اندھیرے میں تیر چھوڑا۔ میں نے کہا۔ ”اُلو کے پٹھے! تیرا کیا خیال ہے کہ انوپ ابھی تک گرفتار نہیں ہوا۔ اُس نے بتا دیا ہے کہ تُو نے اُس سے کتنے پیسے لیے تھے۔“

حیرت انگیز طور پر تیر نشانے پر لگا۔ زکریا کا رنگ فق ہو گیا۔ گڑبڑا کر بولا۔ ”وہ..... وہ تو جی اُس نے اپنی مرضی سے دیئے تھے۔“ میں نے غصے میں دو تین اور ٹھوکریں اُس کی پسلیوں میں لگائیں۔ پھر گریبان سے گھسیٹ کر کھڑا کر دیا۔

کچھ ہی دیر بعد ہم تینوں دو گھوڑوں پر سوار تیزی سے ”پکی ڈھیری“ کی طرف جا رہے تھے۔ گنج زکریا میرے پیچھے بیٹھا ہوا تھا۔ میں راستے میں اُس سے مختلف سوال بھی کرتا جا رہا تھا۔ میں نے پوچھا۔ ”وہ خط کہاں ہے جو انوپ نے اپنی ماں کے لیے لکھوایا تھا؟“ اُس نے جھٹ تھیلے میں سے ایک تہہ شدہ کاغذ نکال کر میری طرف بڑھا دیا۔ صرف چند سطریں لکھی تھیں۔

”ماں! میری طرف سے فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں ایک ضروری کام سے شہر جا رہا ہوں، ایک دو روز میں آ جاؤں گا۔ ہو سکتا ہے تھوڑے دن زیادہ لگ جائیں۔ گھبرانے کی بات نہیں چھوٹی کشتی کی مرمت کروا لیتا..... وغیرہ وغیرہ۔“ خط میں کوئی کام کی بات نہیں تھی۔ میں نے زکریا سے پوچھا۔ ”انوپ نے جس کے پاس پناہ لی ہے وہ کون ہے؟“

اُس نے بتایا کہ اُس کا نام شیرا ہے۔ آج کل جیل کاٹ رہا ہے۔ اُس کا ڈیرہ خالی تھا۔

انوپ نے اُس کے گھر والوں سے ڈیرے کی چابی لے رکھی ہے۔“

میں نے کہا۔ ”انوپ اور جولاں کے تعلقات کے بارے میں تُو کیا جانتا ہے؟“

زکریا وہی کچھ بتا سکا جو اس سے پہلے مجھے معلوم تھا یعنی انوپ اور جولاں کا پرانا دوستانہ تھا..... وغیرہ وغیرہ۔ اُس نے قسمیں کھا کر کہا کہ اس کے علاوہ اُسے کچھ معلوم نہیں۔

زکریا کی باتوں سے مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ انوپ ایک پھنے خان قسم کا شخص ہے۔ اُس کی دوستی بھی جرائم پیشہ لوگوں سے تھی۔ ہو سکتا تھا انیل کی گمشدگی میں اُس کا ہاتھ ہو۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے رقیب تھے۔ ممکن تھا کہ انوپ اُسے راستے سے ہٹانا چاہتا ہو۔ اُس نے خود یا اپنے کسی ساتھی کے ذریعے انیل کو اٹھوایا ہو اور ہو سکتا ہے قتل کر دیا ہو۔ اگر واقعی ایسا ہوا تھا تو پھر لڑکی کا شوہر بھگتو اور تھانیدار بیدی بے قصور ہے۔ مشکل یہ تھی کہ گاؤں میں کوئی شخص مجھے یہ پوری کہانی سنانے پر آمادہ نہیں تھا۔ سب اتنا ہی بتاتے تھے کہ جولاں اچھے کردار کی لڑکی نہیں۔ کئی مردوں سے اُس کے تعلقات رہے ہیں۔ اُس نے ڈاکٹر پر بھی ڈورے ڈالے اور پھر اپنے پرانے آشنا کے ساتھ بھاگ گئی۔ مجھے کوئی ایسا شخص نہیں ملا تھا۔ جس نے تصویر کا دوسرا رخ بھی دکھایا ہو۔

رات کوئی دس بجے ہم پکی ڈھیری کے نواح میں واقع ایک ڈیرے پر پہنچے۔ چاندنی رات تھی۔ درختوں کے درمیان چند کچے پکے کمرے پُراسرار نظر آرہے تھے۔ قریب ہی دو گھوڑے بندھے تھے۔ ایک شخص موٹا کھیس لپیٹے گھوڑوں کے پاس سو رہا تھا۔ مجھے شک گزرا کہ اُس کے تنکے کے نیچے پستول وغیرہ ہے۔ میں نے ایک جھٹکے سے اُس کا تنکہ اٹھا کر 32 بور کاربوا لور نکال لیا۔ یہ شخص ڈیرے کا اکلوتا رکھوالا تھا۔ اپنا ریو لورا اپنی ہی طرف اٹھایا کر وہ بری طرح گھبرایا۔ میں نے بلال شاہ کو اشارہ کیا۔ اُس نے دومنت میں رکھوا لے کر اُس کی رنگین پگڑی سے باندھ کر بھنگ کے پودوں میں ڈال دیا۔ تب ہم نے ڈیرے کے دروازے پر دستک دی۔ کسی نے کمرے میں لائین کی لوتیزی کی۔ پھر بھاری آواز میں پوچھا۔ ”کون ہے؟“

میرے اشارے پر ڈاکے نے جواب دیا۔ اندر والے نے جھٹ دروازہ کھول دیا۔

میرے سامنے مضبوط ہاتھ پیر کا ایک لمبا ترنگا شخص کھڑا تھا۔ وہ دھوتی بنیان میں تھا۔ کیس بندھے ہوئے تھے۔ ہم دونوں کو دیکھ کر وہ بری طرح گھبرایا۔ میں اُسے ریو لور سے دھکیلتا ہوا اندر لے گیا۔ ایک سُریلی چیخ سنائی دی۔ میں نے دیکھا گداز جسم والی ایک دراز قد لڑکی لائین کے پاس سہمی کھڑی تھی۔ اُس کی لمبی گردن اور ایک رخسار روشنی کی زد میں تھا۔ یہ دونوں روشن ہٹے اُسے خوبصورت ثابت کرنے کے لیے کافی تھے۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ یہی جولاں

ہے، مگر میں اُس کی گود میں سات آٹھ ماہ کا بچہ دیکھ کر حیران رہ گیا۔ مجھے پہلی دفعہ پتہ چلا کہ جولائے ایک بچے کی ماں بھی ہے۔

میں نے رعب دار آواز میں اپنا تعارف کرایا۔ یہ جان کر کہ میں پولیس انسپکٹر ہوں جولائے اور انوپ خوفزدہ ہو گئے۔ زکریا بھی اس انکشاف پر حیران رہ گیا۔ میں نے بلال شاہ کو ہدایت کی کہ وہ جولائے کی گود سے بچے لے لے اور اُسے دوسرے کمرے میں جا کر لٹا دے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اُن دونوں کو کسی بھی چالاکی کا موقع دوں۔ ریوالور کی نالی بدستور اُن دونوں کی طرف اٹھی ہوئی تھی۔ بلال شاہ سوئے ہوئے بچے کو دوسرے کمرے میں لے گیا تو میں نے مفروضہ سے پوچھ گچھ شروع کی۔ وہ جانتے تھے کہ بری طرح پھنس چکے ہیں۔ لہذا انہوں نے ادھر ادھر کی ہانکنے کی کوشش نہیں کی اور میری تھوڑی سی کوشش کے بعد اصل موضوع پر آ گئے۔ انوپ اور جولائے سے میری یہ گفتگو تقریباً تین گھنٹے جاری رہی۔ اس دوران جولائے نے صرف ایک دفعہ دوسرے کمرے میں جا کر اپنے بچے کو دودھ پلایا۔ اس ساری گفتگو کے دوران مختلف سوال جواب ہوئے کہیں کہیں مجھے اُن دونوں کو دھمکانا بھی پڑا۔ کہیں پیار محبت سے کام لیا۔ اس ساری گفتگو کا خلاصہ کچھ اس طرح ہے۔

جولائے جا کوٹ کے قریبی گاؤں تین کی رہنے والی تھی۔ ان دنوں دیہات کے درمیان وہ ڈیک نالہ بہتا تھا جہاں انوپ سنگھ کی جھوپڑی بھی تھی۔ انوپ جا کوٹ کا رہائشی تھا۔ جولائے کے والدین اپنے رشتے داروں سے ملنے کے لیے اکثر جا کوٹ آتے رہتے تھے۔ جولائے بھی اُن کے ساتھ ہوتی تھی۔ دوسرے لوگوں کی طرح انہیں بھی بعض دفعہ نالہ پار کرنے کے لیے انوپ کی کشتی میں بیٹھنا پڑتا تھا۔ نوعمری ہی سے جولائے انوپ کی محبت میں گرفتار ہو گئی اور وقت کے ساتھ یہ محبت چپکے چپکے پروان چڑھتی رہی، لیکن قدرت کو اُن کا ملاپ منظور نہیں تھا۔ جولائے کا باپ اُس کی شادی اپنی ہی ذات برادری میں کرنا چاہتا تھا لہذا اُس نے جولائے کو بھگت سنگھ عرف بھگت لوہار کے پلے باندھ دیا۔ ایک شریف بھلی مانس لڑکی کی طرح جولائے نے والدین کا یہ فیصلہ قبول کیا اور شادی کے بعد دل و جان سے شوہر کی خدمت کرنے لگی۔ گزرے زمانے کی ہر یاد اُس نے اپنے دل سے کھرچ دی اور اپنے سسرال کے گھر ایک نئی زندگی کا آغاز کیا۔

قریباً ایک سال کا عرصہ تو خیریت سے گزرا پھر جولائے کی پرسکون زندگی میں طوفان سراٹھانے لگے۔ بھگت لوہار ایک کاہل آدمی تھا۔ آمدن اتنی کم تھی کہ بمشکل گزر بسر ہوتی تھی۔ سونے پر سہاگہ یہ ہوا کہ اُسے نشے کی عادت پڑ گئی۔ ٹھہرائی کر چار پائی پر پڑے رہنا اُس کا

معمول بن گیا۔ گھر میں فاقے پڑنے لگے۔ جولائے سے اپنی نندوں اور کمن دیوروں کی بھوک نہیں دیکھی جاتی تھی۔ وہ چوہدری کی حویلی میں جا کر کام کرنے لگی۔ چوہدری بسوا جیت راؤ کی طرح اُس کی جتنی بھی بڑی خداتر تھی۔ گھر کا بچا کچھا سالن، روٹی، کپڑا لٹا اور دوسری اشیاء جولائے کو دے دیتی تھی۔ جولائے ان چیزوں کو اپنی محنت کا صلہ جان کر لے لیتی تھی۔ تنخواہ وغیرہ کا تو گاؤں میں کوئی تصور ہی نہیں تھا۔

جولائے کی بدقسمتی یہ تھی کہ وہ قبول صورت اور پُرکشش تھی۔ اپنی انہی خوبیوں کے ساتھ اُسے مختلف کاموں سے بار بار چوہدری صاحب کے کمرے میں بھی جانا پڑتا تھا۔ بڑے چوہدری صاحب کی عمر پینتالیس کے لگ بھگ تھی جو ان بچوں کے باپ تھے۔ گاؤں میں اُن کی نیک نامی تھی، لیکن وہ جولائے کو آتے جاتے ایسی نظروں سے دیکھتے کہ اُسے جھرجھری سی آ جاتی۔ کبھی کبھی وہ جولائے سے کہتے کہ گھی گرم کر کے لاؤ اور میرے سر میں ڈالو۔ پھر انہوں نے اُس سے کمر کی مالش کروانا بھی شروع کر دی۔ ایک روز جب چوہدرانی چھت پر تھی اور جولائے چوہدری صاحب کی مالش کر رہی تھی۔ چوہدری نے ایک ایسی حرکت کی کہ وہ شرم سے بانی پانی ہو گئی۔ بہر حال اُس نے دل کو تسلی دی کہ شاید چوہدری صاحب سے بے خیالی میں ایسا ہو گیا ہے مگر اگلے دو تین ہفتوں میں اُس کا یہ خیال غلط ثابت ہو گیا اب اُسے یہ بھی احساس ہو رہا تھا کہ حویلی کے تمام ملازمین اُسے چھیپتی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہیں اور پیٹھ پیچھے ہنستے ہیں۔

ایک دن جولائے نے یہ سارا معاملہ اپنی ایک گہری سیٹھی روپا سے کہہ دیا۔ روپا اُس کی باتیں سن کر پہلے تو خوب ہنسی پھر بولی۔ ”جولائے تُو بھی بڑی بھولی ہے۔ چوہدری صاحب تجھ سے پریم کرنا چاہتے ہیں اور تُو اُن سے بھاگ رہی ہے۔“

روپا کی بات سن کر جولائے کے کان سائیں سائیں کرنے لگے۔ بچپن سے اُس کے دل میں چوہدریوں کی حویلی کے بارے ایک خوف سا رہتا تھا۔ اس کی وجہ کیا تھی اُسے خود بھی معلوم نہیں تھا۔ شاید یہ انجانا سا خوف اور جس گاؤں کی ہر عورت کے دل میں موجود رہتا تھا۔ مگر جب اُس کی شادی ہو گئی اور وہ فاقوں سے مجبور ہو کر حویلی میں کام کرنے لگی تو آہستہ آہستہ یہ خوف خود ہی دور ہو گیا تھا۔ مگر اب..... بالکل اچانک یہ خوف پھر پوری شدت کے ساتھ اُس کے ذہن میں جاگ گیا تھا۔ روپا نے اُسے یہ بتا کر حیران کر دیا کہ اس قسم کے واقعات کچھ سال پہلے اُس کے ساتھ بھی پیش آچکے ہیں۔ بلکہ حویلی میں کام کرنے والی کئی لڑکیوں کو اس طرح کے واقعات پیش آتے ہیں اور گاؤں کی ہندو آبادی میں یہ باتیں زیادہ

برى بھى نپس سبھى جاتىں۔

روپانے بتايا کہ چوہدرى صاحب اونچى ذات کے برہمن ہيں اور اُن کی سيوا کرنا ہم شودروں کا کرتبے ہے۔ وہ جولائى کو بازو سے پکڑ کر حويلی کے ايک کمرے ميں لے گئی۔ يہاں ديوار پر ششے کا ايک کافی بڑا سنہرى فریم لگا ہوا تھا۔ فریم کے اندر کوئی تصوير نپس تھى بلکہ ايک تحري تھى۔ روپانے جولائى سے کہا۔ ”يہ پڑھ سکتى ہو؟“ جولائى نے نفى ميں سر ہلایا۔ روپا نے کہا۔ ”ميں بھى نپس پڑھ سکتى..... صرف پنڈت جى پڑھ سکتے ہيں۔ مجھے بھى انہوں نے پڑھ کر سنایا تھا۔ يہ اُن دنوں کی بات ہے جب تمہارى طرح ميں چوہدرى صاحب کی کبر کی مالش کيا کرتى تھى اور بہت پریشان تھى۔ پنڈت جى نے بہت کچھ سنایا تھا ليکن مجھے يہ چند باتیں ياد ہيں۔

سوامى منوجى کہہ گئے ہيں۔ ”دنيا ميں جو کچھ ہے وہ برہمن جاتى کے ليے ہے۔ جو برہمن پر ہاتھ اٹھائے يا اُس کا ہاتھ روکے سو برس تک نرک ميں رہے گا۔ اگر برہمن کو تنکے سے بھى مارے تو اکيس جنم تک کتے اور گدھے کی جون ميں پيدا ہوگا۔ برہمن کے جسم پر ہتھيار سے زخم لگایا جائے تو مٹھى کے جتنے ذروں پر خون لگے گا، اگلے جہان ميں زخم لگانے والے کو اتنے برس گيدڑ اور کتے سے بھوجن کرنا پڑے گا۔“

روپا کی باتيں سن کر جولائى کا خون کھول رہا تھا۔ اُس نے کہا کہ تم يہ کيوں بھول رہى ہو کہ ميں سکھ ہوں اور مجھے تمہارے دھرم کے وچاروں سے کوئى سروکار نپس۔ ميں ہرگز يہ کالک اپنے منہ پر نپس لگاؤں گی۔

روپانے ہمدردى سے کہا۔ ”جولائى تو ابھى کم عمر ہے۔ تجھے پتہ نپس کہ چوہدريوں کے جال سے نکلنا کتنا مشکل ہو سکتا ہے۔ تيرى اور تيرے پرى وار کی بہترى خاموش رہنے ميں ہی ہے۔“

جولائى پاؤں پٹختى ہوئى حويلی سے اپنے گھر آ گئی۔ رات کو اُس نے اپنے خاوند سے کہا کہ وہ اب حويلی نپس جائے گی۔ اُس نے پوچھا تو جولائى نے روتے سکتے ہوئے سب کچھ بتا ديا۔ بھگتو کھٹو ضرور تھا ليکن ابھى غيرت اُس کے اندر زندہ تھى۔ اُسے چوہدرى بسوا جيت کے کردار کے بارے تھوڑى بہت بھک تھى ليکن يہ اُس کے گمان ميں بھى نپس تھا کہ وہ ايک سکھ عورت کو اپنے رنگ ميں رنگنے کی کوشش کرے گا۔ اُس نے اُسى روز اسی گھڑى ٹھرا پينا چھوڑ ديا اور لگن کے ساتھ کام کرنے لگا۔ جولائى نے حويلی ميں جانا ترک کر ديا۔ دس پندرہ روز خبريت رے پھر ايک روز چوہدرى کے کارندوں نے ايک پرانے بھگتو کے کو نبيا د بنا کر بھگتو کی

دکان پر قبضہ کر ليا اور اُس کا سامان اُٹھا کر باہر پھينک ديا۔ بھگتے کی دکان پر قبضہ کرنے والا چوہدرى کا ايک خاص آدمى تھا۔ بھگتو اُس کی شکايت لے کر تھانيدار بيدى کے پاس پہنچا ليکن يہاں دادرى کے بجائے چڑے کا چھتر اُس کے حصے ميں آيا۔ تھانيدار نے پہلے تو اُسے خوب مارا پينا، پھر پيار محبت سے سمجھایا کہ وہ چوہدرى سے ٹکر لینے کی کوشش نہ کرے۔ اُس نے اُسے انعام اکرام کا لالچ بھى ديا۔ بھگتو فطرى طور پر ايک بزدل آدمى تھا۔ بيوى کی فرياد سن کر وقتى طور پر اُس کی غيرت جاگى تو تھى ليکن جتنى جلدی جاگى اتنى جلدی سو بھى گئی۔ تھانيدار کی ايک ہی پھينٹى نے اُسے ٹھنڈا ٹھار کر ديا۔ اوپر سے ولايتى شراب کی دو تين بوتليں مليں تو وہ نشے ميں مدھوش ہو کر گھر آ گیا۔ تين چار روز گھر ميں پڑا شراب پيتا اور کا جو کھا تا رہا۔ آخر چوتھے روز اُس نے جولائى کو بلایا اور بولا۔

”ارى! ٹو گئی نپس حويلی ميں۔ جا، ہو۔ اُن کا کام رکا پڑا ہوگا۔ چوہدرائى اتنى محبت کرتى ہے تجھ سے۔ اُس کا ہی خيال کر لے۔“

جولائى نے حيران نظروں سے اپنے مدھوش پتی کی طرف ديکھا اور اُس کا مطلب سمجھنے کی کوشش کرنے لگی۔ وہ اپنے ہاتھوں سے اُسے ايک غلط آدمى کی طرف بھج رہا تھا۔ اُس نے اپنے بچے کو سينے سے بھينچ ليا اور سر اٹھا کر بولى۔

”نپس بھگتو! ميں نپس جاؤں گی حويلی ميں۔ اگر..... تجھے اتنا ہی خيال ہے تو اپنى کسى بہن کو بھينچ دے۔“

اس بات نے بھگتو کو آگ بگولہ کر ديا۔ وہ غصے ميں پھنکارتا ہوا اُٹھا اور اُسے لاتوں اور گھونسوں سے پينے لگا۔ کھينچا تانى ميں جولائى کی قيص پھٹ گئی۔ وہ بچے کو پلٹا کر کمرے ميں گھس گئی اور اندر سے کنڈى چڑھالى۔ بھگتو باہر ”شير بيز“ کی طرح گر جتا رہا۔ ”ميں ديکھتا ہوں کيسے نپس ٹو ميرى بات مانتى۔ کھال اتار دوں گا تيرى۔ زبان کھينچ لوں گا۔“

جولائى ديکھ رہى تھى کہ اُس کے چاروں طرف گھبرا تنگ ہو رہا تھا۔ ايک روز چپکے سے ميکے روانہ ہو گئی۔ اُس کے ميکے ميں سکھوں کے دس بارہ گھر موجود تھے۔ اُس کا ارادہ تھا کہ وہ اپنے بھائى بندوں کو اپنى پتا سنائے گی ہو سکتا ہے وہ اُس کے بچاؤ کا کوئى راستہ نکال لیں۔ اُس نے ميکے ميں جا کر اپنى ماں سے بات کی۔ بوڑھى ماں اُس کی کہانى سن کر رونے لگی۔ بولى۔ ”ميرى دھى! اس گاؤں ميں کس ميں اتنى طاقت ہے کہ چوہدرى يا تھانيدار سے ٹکر لے سکے۔ سکھ ہوں يا ہندو سارے کھوٹے سکے ہيں۔ اناج کے ايک دانے کے ليے چوہدريوں کے سامنے ہاتھ پھيلاتے ہيں۔ خود تيرے باپ کا کھيت بھى چھوٹے چوہدرى کا ہے۔ آج وہ

صدی پہلے کے کسی زمانے میں آگیا ہے۔ ہر طرف جاہلیت اور توہم پرستی عروج پر تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ شہروں کی روشنی ان علاقوں سے کچھ زیادہ ہی دور تھی۔ جلد یا بدیر اُسے جولان کی کہانی کا علم ہو گیا۔ پھر ایک موقع پر جولان بھی اپنے بچے کی دوا لینے اُس کے پاس آئی اور وہ یہ دیکھ کر غمگین ہوا کہ ایک سیدھی سادی گھریلو عورت کو کس طرح اقتدار کے نشے میں برباد کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اُسے اس خوش شکل معصوم لڑکی سے ہمدردی پیدا ہو گئی۔ جولان بھی اُسے غمگسار پا کر اکثر اُس کے پاس آنے لگی۔ ڈاکٹر انیل نے اُس سے پورے حالات دریافت کیے اور اُسے یقین دلایا کہ وہ اُس کی مدد کرے گا۔ وہ جانتا تھا کہ چوہدری کا رویہ سراسر غیر اخلاقی، ناجائز اور قابلِ سزا ہے اور اُسے من مانی سے روکنا ہر شہری کا اخلاقی فرض ہے لیکن یہ جذباتی نوجوان یہ نہیں جانتا تھا کہ وہ ایک نقار خانے میں ہے اور یہاں طوطی کی آواز کوئی نہیں سنے گا۔ بلکہ اگر اُس نے زیادہ ٹیس ٹیس کی تو بے رحم ہاتھ اُس کا گلا گھونٹنے سے بھی باز نہیں آئیں گے۔ اُسے اپنی شرافت اور سچائی پر یقین تھا اور اُس کا خیال تھا کہ وہ اپنے شریفانہ اور سچے رویے سے حالات کو سدھار لے گا۔

اُس نے چوہدری بسوا جیت کے نو عمر بیمار پوتے کو موت کے منہ سے بچایا تھا۔ اس لیے وہ اُس کی زیادہ نہیں تو تھوڑی بہت عزت ضرور کرتا تھا۔ انیل سب سے پہلے چوہدری سے ملا اور باتوں باتوں میں اُسے اس کی غلطی کا احساس دلانے کی کوشش کی۔ نصیحتوں اور مشوروں کا ایک لیکچر پلایا۔ مگر پتھر پر شیشے کا کیا اثر ہوتا ہے۔ چوہدری نے ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکال دی۔ بلکہ اُلٹا اُسے ہدایت کی کہ وہ صرف اپنے کام سے کام رکھے ورنہ اُس کا اس علاقے میں رہنا مشکل ہو جائے گا۔ چوہدری کی جانب سے مایوس ہونے کے بعد انیل نے دُڑے تھانیدار شیکھر بیدی سے رجوع کیا۔ اُس نے بیدی سے کہا کہ وہ اس علاقے کا سب سے بااثر شخص ہے اور قانون کا محافظ بھی۔ اُس کی ناک کے عین نیچے قانون شکنی ہو رہی ہے۔ یہ کوئی اچھی مثال نہیں۔ اُسے چاہیے کہ وہ چوہدری پر اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے ایک شریف عورت کو اُس کے چنگل سے بچائے۔ تھانیدار، چوہدری کا نمک خوار تھا اور ہر طرح سے اُس کی مٹھی میں تھا۔ بلکہ اپنی من مانیوں اور عیاشیوں میں دونوں ایک دوسرے کے پارنر تھے۔ اُس نے وہی بات کرنا تھی جو اُس کے پارنر کے حق میں جاتی تھی۔ اُس نے ہوشیاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اُلٹا انیل کو اپنے رنگ میں رنگنا شروع کر دیا۔ پہلے شراب کی بوتلیں ڈاکٹر کے کینک بھجیں۔ پھر ایک دو لڑکیاں اپنے پوشیدہ امراض لے کر اُس کے پاس آنے لگیں۔ یہ سب کچھ تھانیدار کی ہدایت پر ہو رہا تھا۔ ایک مجرے میں تھانیدار نے ڈاکٹر کو زبردستی شراب

ہمیں وہاں سے نکال دے تو تیری دونوں بہنیں بغیر داج کے گھر میں پڑی رہ جائیں۔ اب تو اُن کی شادیاں بھی سر پر آگئی ہیں۔ دونوں کے سسرال سے اس کٹنائی پر بیاہ کا وعدہ کیا ہوا ہے۔“

جولان چلا کر بولی۔ ”بے بے! تو پھر میں کیا کروں اگر..... اگر تو میری جگہ ہوتی تو کیا کرتی۔ بتا..... کیا کرتی؟“

اُس کی ماں نے اُسے اپنی چھاتی سے چٹا لیا اور گھبرا کر بولی۔ ”آہستہ بول جولان دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔ کیوں ہم سب کو نشر کرے گی۔“ وہ اُس کے نرم بالوں میں انگلیاں پھیرتی رہی اور خود بھی آنسو بہاتی رہی، پھر گلوگیر آواز میں بولی۔

”دھیئے! جب سب در بند ہو جاتے ہیں تو ایک در پھر بھی کھلا رہتا ہے۔ میں تیری فریاد لے کر سچے سائیں تک جاؤں گی۔ آٹھ پہر کا راستہ ہے پر میں کسی نہ کسی طرح کاٹ ہی لوں گا۔ مسلمان ہے لیکن بڑا پہنچا ہوا ہے۔ ہندو، سکھ، عیسائی سب کو اُس کے در سے خیر ملتی ہے۔ تو جواب اپنے گھر جا۔ بالکل بے فکر ہو کر جا..... اوپر والا چنگیاں ہی کرے گا۔“

جولان نے چونک کر اپنی ماں کو دیکھا۔ ایک لمحے کے لیے اُسے محسوس ہوا جیسے وہ بھی اُس سے جان چھڑا رہی ہے۔ اُسے تسلی بخشی دے کر اُس کے حال پر چھوڑ رہی ہے۔ ڈر رہی ہے کہ کہیں اُس کی وجہ سے اُس کی باقی اولاد کی زندگیاں بھی برباد نہ ہو جائیں۔

جولان کو اپنے میکے چند دن ٹھہرنا تھا لیکن وہ کچھ ایسی دل گرفتہ ہوئی کہ اُسی دن سسرال واپس آگئی لیکن اپنے ساتھ وہ ایک بھر پور عزم لے کے آئی تھی۔ وہ عزم جو ایک پاکباز عورت کی آنکھ میں اُس وقت جاگتا ہے جب اُس پر شرافت کے تمام دروازے بند کر کے اُسے ہوس کے خنجر سے ہلاک کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ جب اُسے بتایا جاتا ہے کہ اُس کی زندگی کی قیمت اُس کی آبرو ہے، اُس کی خودداری ہے۔ جولان نے فیصلہ کر لیا کہ وہ کسی صورت چوہدری کی خواہش کے آگے سر نہیں جھکائے گی۔ اگر پوری دنیا بھی چوہدری کی طرف دار بن جائے تو وہ اپنے فیصلے پر اڑی رہے گی۔

☆=====☆=====☆

یہ وہ دن تھے جب پرکاش ڈھلوں کا نوجوان ڈاکٹر بیٹا انیل ڈھلوں خدمتِ خلق کا جذبہ لے کر گاؤں پہنچا تھا۔ وہ منو ہر لال پنواری کے مکان میں اپنا کلینک کھول کر علاج معالجے کا آغاز کر چکا تھا۔ وہ ایک پڑھا لکھا اور روشن خیال نوجوان تھا۔ اُسے اس علاقے اور خاص طور پر اس گاؤں کے حالات دیکھ دیکھ کر حیرانی ہو رہی تھی۔ اُسے یوں لگتا تھا جیسے وہ دس

گیا..... بعض لوگوں کا خیال تھا اور اب بھی ہے کہ انیل کو چوہدریوں کی بہو نے آزاد کرایا تھا۔ اُس کے کمن بیٹے کو شدید بیماری کی حالت میں ڈاکٹر کے علاج سے افاق ہوا تھا۔ بہر حال ڈاکٹر فرار ہو گیا اور تھانیدار بیدی کو اپنی نوکری خطرے میں نظر آنے لگی۔ چوہدری کو بھی باز پرس اور مقدموں کا خوف لاحق ہو گیا۔ اُن دونوں نے فوری طور پر اپنے آدمی ڈاکٹر انیل کے پیچھے لگا دیئے اور انہیں ہدایت کی کہ وہ ڈاکٹر کو کسی قیمت پر شہر تک نہ پہنچنے دیں..... اور اگر وہ پہنچ گیا ہے تو کچھ بھی بولنے سے پہلے اُس کی زبان بند کر دیں..... اس کے بعد ڈاکٹر انیل پر کیا مبنی؟ انوپ سنگھ یا جولاں کو کچھ معلوم نہیں تھا۔ ڈاکٹر کے فرار کے بعد گاؤں کے جو حالات ہوئے وہ کچھ اس طرح تھے۔ تھانیدار اور جولاں کے شوہر بھگتو نے جولاں کو خوب ڈرایا دھمکایا کہ وہ پنچوں سے کہہ کر اُسے سخت سے سخت سزا دلوائیں گے۔ پھر اس سزا کے بعد اُسے شہر بھیج دیا جائے گا جہاں اُس پر کئی ایک مقدمے بنیں گے۔ جولاں کتنی بھی باہمت تھی لیکن جب سارا گاؤں ایک طرف ہو گیا اور سماج کے ٹھیکیداروں نے اُسے چاروں طرف سے گھیر لیا تو وہ چکرا کر رہ گئی۔ اُسے اپنے ماں باپ کا خیال آیا جو گلی گلی بدنام ہو چکے تھے اور ہونے والے تھے۔ اپنی جوان بہنوں کے ننگے سر اُس کے تصور میں آئے۔ اُس آٹھ ماہ کے معصوم کا خیال آیا جسے ہمیشہ کے لیے اُس سے جدا کیا جانے والا تھا..... وہ سوچنے پر مجبور ہو گئی..... بہت کچھ سوچنے پر مجبور ہو گئی۔ اُس کی جھکی ہوئی گردن دیکھی تو تھانیدار بیدی اور بھگتو کی آنکھوں میں فاتحانہ چمک لہرانے لگی۔ اُسی روز تھانیدار بیدی نے پنچوں سے مل کر معاملہ رفع دفع کر دیا..... چھ سات روز اسی طرح گزر گئے۔ پھر ایک شام بھگتو گھر آیا تو ولایتی شراب کے نشے میں پور تھا۔ وہ جولاں کے لیے کپڑوں کے دو تین بڑے اچھے جوڑے لایا تھا۔ اس کے علاوہ مٹھائی، کباب، کچے اور پتہ نہیں کیا کیا کچھ تھا۔ لگتا تھا اُس کے پاس کافی پیسے آگئے ہیں۔ شراب پیتے ہوئے اور کھانا کھاتے ہوئے اُس نے جولاں سے کہا۔

”کل سہ پہر تیار ہو جانا۔ ساجن پور گاؤں میں میرے ایک یار کی شادی ہے۔ وہاں جانا ہے۔“

”ساجن پور“ اور ”تیار“ کی بات سن کر جولاں کا ماتھا ٹھکا۔ وہ جانتی تھی ساجن پور میں بھگتو کا کوئی یار نہیں۔ ہاں راستے میں چوہدری بسوا جیت کا ڈیرہ ضرور ہے۔ جہاں ایک دفعہ قتل بھی ہوئے تھے۔ اپنے شوہر کی بات سن کر جولاں کی جان لرز گئی۔ وہ سمجھ گئی کہ اُس کی عزت پر حرف آنے والا ہے۔ اُس نے روتے ہوئے اپنے شوہر کے آگے ہاتھ جوڑ دیئے۔

”بھگتو مجھے اس طرح برباد نہ کر اپنے ہاتھوں سے میرا گلا گھونٹ دے۔ مجھے تیرے ان

پلانے کی کوشش بھی کی۔ ڈاکٹر پر اب سب کچھ کھل چکا تھا۔ اُس نے واشگاف الفاظ میں تھانیدار سے کہہ دیا کہ وہ اپنی چالوں سے باز رہے اور اپنا وہ فرض پورا کرے جو قانون کے محافظ کی حیثیت سے اُس پر عائد ہوتا ہے۔ اس طرح تھانیدار اور ڈاکٹر میں ٹھن گئی۔ جولاں نے انیل کو سمجھانے کی بہت کوشش کی کہ وہ چوہدری اور تھانیدار سے ٹکرانے کی کوشش نہ کرے اور اُسے اُس کے حال پر چھوڑ دے لیکن وہ نہیں مانا۔ اُسے اپنی اصول پرستی سے محبت تھی۔ اُس نے جولاں سے کہا۔

”جولاں! میں تیری آواز قانون کے کانوں تک ضرور پہنچاؤں گا۔ اگر میں شہر کے اخباروں میں تھانیدار اور چوہدری کے فوٹو نہ چھپواؤں تو میرا نام نہیں۔“

دونوں گاؤں کے پچھواڑے جوار کے کھیتوں میں کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ جولاں نے کہا۔ ”ڈاکٹر صاحب! یہ کھیت دیکھ رہے ہیں۔ ان میں جتنے بولے ہیں اتنے ہی چوہدریوں کے ہاتھ ہوتے ہیں۔ تم بسوا جیت کے کس کس ہاتھ سے بچو گے۔ کوئی نہ کوئی ہاتھ ضرور تم سے تمہاری زندگی چھین لے گا۔ میں جس مصیبت میں پھنسی ہوئی ہوں اُس میں تو میرا شوہر بھی میرا ساتھ چھوڑ چکا ہے۔ تم تو پھر غیر ہو۔ کہاں تک میرے لیے خود کو کانٹوں پر گھسیٹو گے۔“

ابھی اُن دونوں میں یہ گفتگو ہو ہی رہی تھی کہ کھیتوں میں ہانچل کے آثار نظر آئے۔ پھر گاؤں کے بیس پچیس افراد نے انہیں گھیرے میں لے لیا۔ ان میں سب سے آگے جولاں کا شوہر تھا۔ گاؤں کے پنچ بھی ان لوگوں میں نظر آ رہے تھے۔ جولاں کے شوہر نے جولاں پر لاشیوں کی بارش کر دی۔ گاؤں کے لوگوں نے انیل کو مارنا پینا شروع کر دیا۔ وہ تو پنچوں نے اُس کی جان بچائی، ورنہ شاید اُسی جگہ اُس کا خاتمہ ہو جاتا۔ پھر وہی ہوا جو ہونا تھا۔ چوہدری کے کارندے اور گاؤں کے تماش بین انیل کو گھسیٹتے ہوئے چوہدری بسوا جیت کی حویلی میں لے گئے اور ایک کمرے میں بند کر دیا۔ پورے علاقے میں یہ خبر پھیل گئی کہ شہری ڈاکٹر ایک شادی شدہ عورت کے ساتھ پکڑا گیا ہے۔ جب انیل، چوہدری کی حویلی پہنچ گیا تو گاؤں والوں کو یقین ہو گیا کہ اب اُس کی لاش ہی باہر آئے گی۔ چوہدری بسوا جیت اور تھانیدار شیکھر بیدی اُسے زندہ چھوڑنے والے نہیں تھے۔ اس سے پہلے بھی وہ کئی ”بجرموں“ کے ساتھ یہی سلوک کر چکے تھے..... لیکن اگلے روز لوگوں کو یہ جان کر حیرت ہوئی کہ رات ڈاکٹر انیل موقع پا کر حویلی سے فرار ہو گیا ہے۔ اُس کے کمرے کی کھڑکی ٹوٹی ہوئی تھی اور حویلی کے اصطبل سے ایک گھوڑا بھی غائب تھا۔ بعد میں یہ گھوڑا آٹھ دس کوس دور ایک دوسرے گاؤں سے مل

کپڑوں اور پیسوں کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں صرف عزت کی بھوک ہوں۔ مجھے عزت نہیں دے سکتا تو میری جان لے لے۔“

جھگتو نے لال گلابی آنکھوں سے اُسے گھورا پھر بوتل کو مضبوطی سے تھامتے ہوئے بولا۔
”حرامزادی! تھانیدار کی بات بھول گئی ہے۔ جیلوں میں سزا دے گا ہم سب کو۔ ایسی مار مارے گا کہ شرافت کی چڑیا پھر سے اُڑ جائے گی۔“

جولان نے کہا۔ ”تم مجھے بچوں کے سامنے پیش کرو۔ مجھے یقین ہے وہ مجھ پر رحم کھائیں گے۔“

جھگتو نے نشے میں ہاتھ ہلایا۔ ”ہا..... رحم کھائیں گے۔ وہ وہی کچھ کریں گے جو تھانیدار کہے گا اور تجھے پتہ ہی ہے تھانیدار کیا کہے گا۔“ پھر اُس نے شراب کا ایک بڑا گھونٹ لے کر پوری بے حیائی سے بیوی کی آنکھوں میں دیکھا اور انگلی اٹھا کر خوفناک لہجے میں بولا۔ ”میں کوئی بہانہ سننا پسند نہیں کروں گا۔ کل تجھے ہر صورت میرے ساتھ چلنا ہے..... سن رہی ہے میری بات؟“

جولان نے چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپایا اور چارپائی پر گر کر رونے لگی۔

اُس رات جولان نے اُس فیصلے کو عملی جامہ پہنایا جو وہ بہت پہلے کر چکی تھی۔ اُس نے اپنے معصوم بچے کو چھاتی سے لپٹا لیا اور جی بھر کر دودھ پلایا۔ پھر اُسے گود میں اٹھا کر بہت سی میٹھی میٹھی لوریاں دیں اور جب وہ اپنی بدنصیب ماں کی بانہوں میں سو گیا..... اور رات آدھی سے زیادہ گزر گئی تو وہ اُسے لے کر خاموشی سے باہر آ گئی۔ پہریداروں اور گاؤں کے آوارہ کتوں سے بچتی بچاتی وہ ڈیک نالے کی طرف چلی آئی۔ اُس کے جسم پر ایک چادر تھی جو تیز ہوا میں پھڑپھڑا رہی تھی۔ وہ بچے کو گود میں اٹھائے نالے کے کنارے خاموش کھڑی تھی۔ بخ بستہ پانی کا بے رحم شور سنتی رہی۔ پھر ایک ہلکی سی آہ کے ساتھ اُس نے پانی میں چھلانگ لگا دی۔

جولان کے بچپن کا پیار..... انوپ سنگھ اُس وقت اپنے جھونپڑے سے کچھ فاصلے پر خاموش بیٹھا تھا۔ نہ جانے کیوں اُسے نیند نہیں آرہی تھی۔ شاید مجھروں کی وجہ سے ایسا ہوا تھا۔ وہ اپنے خیالوں میں گم تھا جب اچانک اُسے پانی پر کوئی سفید چیز متحرک نظر آئی۔ کوئی جسم بہتا اور غوطے کھاتا ہوا جارہا تھا۔ اس کے علاوہ ایک ننھے بچے کی مہین آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔ انوپ آنا فانا اٹھا۔ اُس نے پاؤں سے جوتی نکالی اور دوڑ کر پانی میں چھلانگ لگا دی۔ ٹھیک پانچ منٹ بعد وہ نالے کے کنارے گیلی ریت پر جولان اور اُس کے بچے کے

پیٹ سے پانی نکال رہا تھا۔ ماں بیٹا موت کے منہ سے واپس آ گئے تھے..... جولان کا سانس باقاعدگی سے چلنے لگا اور دل کی دھڑکن ٹھیک ہو گئی تو اُس نے آنکھیں کھول دیں۔ بچہ اُس کے پہلو میں ہمک رہا تھا۔ انوپ سنگھ ایک تک اُن دونوں کو دیکھتا چلا گیا۔ ماضی کے شکوے گلے اُس کی آنکھوں میں آنسو بن کر چک رہے تھے لیکن یہ وقت شکووں، گلوں کا نہیں تھا اور نہ ہی اب ان باتوں سے کوئی فائدہ تھا..... اُسے جولان اور چوہدری بسوا جیت کی ساری کہانی معلوم تھی اور وہ اندازہ لگا چکا تھا کہ جولان نے خودکشی کی کوشش کیوں کی ہے۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اس جگہ جولان کی عزت اور زندگی کو سخت خطرہ ہے۔ اُس نے فوری طور پر فیصلہ کیا اور جولان کو کسی محفوظ ٹھکانے تک پہنچانے کا ارادہ کر لیا۔ اُس نے دور ایک نظر اپنے جھونپڑے پر ڈالی اور جولان پر جھک کر اُس سے سرگوشیاں کرنے لگا۔

ایک سخت کوشش کے بعد اُس نے جولان کو اپنے ساتھ چلنے پر راضی کر لیا۔ وہ اُسے اور اُس کے بچے کو لے کر راتوں رات ”کچی ڈھیری“ پہنچ گیا اور یہاں اُسے اپنے دوست کے ڈیرے پر لے آیا۔ میرے اندازے کے برعکس انوپ سنگھ ایک شریف اور بھلا مانس شخص تھا۔ وہ غیر شادی شدہ اور جوان تھا، ایک جوان اور خوبصورت عورت کے ساتھ اس مکان میں تنہا رہتے ہوئے اُسے آج تیسری رات تھی۔ پھر یہ عورت یا لڑکی اُس کی محبت بھی تھی۔ اس کے باوجود اُس نے آنکھ اٹھا کر اُس کی طرف نہیں دیکھا۔ یہ بڑے حوصلے اور ظرف کی بات تھی..... وہ جولان اور اُس کے بچے کو شہر پہنچانا چاہتا تھا۔ جہاں جولان کا کوئی دور کارشتہ دار رہتا تھا مگر اس سے پہلے وہ اپنی ماں اور بہن تک اپنی خبر پہنچا دینا چاہتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ پانی میں چھلانگ لگاتے وقت وہ اپنی جوتی بھی کنارے پر اتار آیا ہے۔ یہ بات اُن دونوں کے لیے بہت پریشان کن ثابت ہو سکتی تھی۔ اتفاقاً ذکیے زکریا سے اُس کا رابطہ ہو گیا اور اُس نے زکریا کی مٹھی گرم کر کے اُسے اپنا پیغام پہنچانے بھیج دیا..... بعد کے واقعات آپ جانتے ہی ہیں۔

انوپ اور جولان کی کہانی ختم ہوئی۔ کمرے میں ایک گہرا سناٹا چھا گیا۔ لالٹین کی روشنی میں ہم پانچوں اپنی اپنی سوچ میں گم تھے۔ میں تیزی سے آئینہ کا لائٹ عمل سوچ رہا تھا۔ دفعتاً دروازے پر ایک تیز دستک ہوئی۔ میرے اشارے پر بلال شاہ اٹھ کر دروازے کی طرف گیا مگر اس سے پہلے کہ وہ دروازہ کھولتا کسی نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔

”انوپ! مخبری ہو گئی ہے۔ چوہدری اپنے بندوں کے ساتھ اسی طرف آرہا ہے۔ جان بچانی ہے تو بھاگ جا.....“ پھر جواب سنے بغیر اطلاع دینے والا خود بھی بھاگ گیا۔ اُس کے

دوڑتے قدموں کی آواز سنائے میں دور تک سنائی دی۔ تب اچانک ارد گرد کے کھیت گھوڑوں کی سرپٹ ٹاپوں سے گونج اٹھے۔ میں نے محافظ کے تکیے سے نکالا ہوا 32 بور کار بیا اور ہاتھ میں لیا اور دروازے کی طرف بڑھا۔ جونہی میں نے دروازہ کھولا کوئی ایک درجن افراد گھوڑوں سے چھلانگیں لگا کر میرے سامنے آ گئے۔ وہ سب کے سب مسلح تھے۔ چوہدری بسواجیت اور اُس کا چھوٹا بھائی بھی اُن میں نظر آ رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر وہ حیران رہ گئے۔ ”تم یہاں؟“ چوہدری نے میری طرف انگلی اٹھا کر پوچھا۔ وہ مجھے بیدی کے ڈرائیور کے طور پر جانتا تھا۔

میں نے کہا۔ ”ہاں چوہدری صاحب! میں بھی ان دونوں کی کھوج میں تھا۔ آپ نہ بھی آتے تو میں ایک گھنٹے تک انہیں آپ کی حویلی میں لے آیا۔“

چوہدری اور اُس کے کارندے مجھے دھکیلتے ہوئے کمرے میں گھس گئے۔ اس کے ساتھ ہی انوپ کی کراہیں اور جولاں کی چیخیں گونجنے لگیں۔ چوہدری کے بندے اُن دونوں کو بری طرح پیٹ رہے تھے۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے انہوں نے اُن دونوں کو پگڑیوں سے باندھ کر زمین پر ڈال دیا۔ آٹھ ماہ کا معصوم بچہ حالات کی ستم ظریفی پر حلق پھاڑ کر چیخ رہا تھا لیکن اُس کی فریاد سننے والا کوئی نہیں تھا۔ میں نے دیکھا جولاں کی فریادی نظریں میری طرف اٹھی ہوئی ہیں۔ جیسے کہہ رہی ہو۔ ”تم تو کہتے تھے میں اصلی تھانیدار ہوں۔ اب کہاں ہے تمہاری تھانیدارمی؟ کیا تم بھی اُس ہجوم میں شامل ہو جاؤ گے جو میری جان لینے پر تیار ہوا ہے۔“

اس دوران خستہ حال جیب کی خوفناک گڑگڑاہٹ سنائی دی۔ چند لمحوں بعد تھانیدار بیدی تین راتفل مینوں کے ساتھ موقع پر پہنچ گیا۔ چوہدری کے کارندے اُس وقت انوپ اور جولاں کو اٹھا کر باہر لے آئے تھے اور بری طرح پیٹ رہے تھے۔ تھانیدار نے آگے بڑھ کر انہیں روک دیا۔ پھر بڑے اور چھوٹے چوہدری کو لے کر جیب میں آ گیا۔ بڑے چوہدری کے کہنے پر اُس نے مجھے اور بلال شاہ کو بھی جیب میں بلا لیا۔ میری یہاں موجودگی پر وہ خود بھی حیران ہو رہا تھا۔ میں نے ابھی اپنا راز کھولنا مناسب نہیں سمجھا۔ بیدی کے پوچھنے پر میں نے اُسے بتایا کہ کل مجھے ڈاکے زکریا پر شک ہوا تھا اور اُسی کی نشاندہی پر میں یہاں تک پہنچا ہوں۔ میرا ارادہ تھا کہ دونوں مجرم اچانک آپ کے سامنے پیش کر کے آپ کو حیران کر دوں گا۔ بیدی میری باتوں سے پوری طرح مطمئن نہیں ہوا لیکن اس وقت وہ تفصیل میں نہیں جاسکتا تھا۔ اُس نے چوہدری سے کہا۔

”چوہدری صاحب! میرا خیال ہے اس معاملے کو فی الحال ٹھنڈا کر دیں۔ لڑکے کو پکڑ

لیتے ہیں اور لڑکی وارثوں کے سپرد کر دیتے ہیں۔“

چوہدری کو اس بات پر بہت حیرت ہوئی۔ شاید اُسے لگا تھا کہ اُس کے منہ سے نوالہ چھینا جا رہا ہے۔ اُس نے سرگوشی میں کہا۔ ”کیوں تھانیدار کیا بات ہوئی؟“

تھانیدار نے اپنی ڈاڑھی کھجائی پھر الجھن سے بولا۔ ”میں رات بھی آپ سے بات کرنا چاہتا تھا لیکن ٹائم نہ ملا۔ دراصل شہر سے ایک خط آیا ہے۔ ایک بھڑوا انسپکٹر یہاں آ رہا ہے۔ میں سوچتا ہوں خواہ مخواہ کوئی مصیبت نہ پڑ جائے۔“ (یہ خط دراصل میری روائگی کے وقت ہی ایس ایس پی صاحب نے لکھا تھا لیکن دور دراز علاقہ ہونے کی وجہ سے وہ کافی دیر کے ساتھ یہاں پہنچا تھا)

چوہدری نے کہا۔ ”بیدی یار! کیسی بات کرتے ہو۔ ایسے انسپکٹروں سے تم ہزار بار بٹ چکے ہو۔ منہ کھول کر آئے گا ہم منہ بند کر دیں گے تو واپس چلا جائے گا۔“

بیدی نے مجھے ایک غائبانہ گالی سے نوازا اور بولا۔ ”میں نے اُس کا نام سنا ہوا ہے۔ بڑا نیکو کار اور شرافت کا پتلا بنتا ہے۔ ہماری لائن کا آدمی نہیں ہے وہ۔ بہتر ہے جبرا ہاتھ پاؤں بچا کر رہیں۔“

میں اپنے بارے میں ریمارکس سن کر محظوظ ہو رہا تھا۔ چوہدری، بیدی کی طرف کچھ اور جھک گیا اور دونوں کانوں کانوں میں گفتگو کرنے لگے۔ جیسا کہ اس گفتگو کے بارے میں بعد میں پتہ چلا۔ چوہدری کا ارادہ تھا کہ تھانیدار جولاں اور انوپ کو اُس کے حوالے کر دے اور وہ اُن کے ساتھ اچھا برا کرنے کے بعد انہیں نہر میں ڈبو کر مار ڈالے۔ بعد میں کہا جاسکتا تھا کہ انہوں نے پکڑے جانے کے خوف سے ڈیک نالے میں چھلانگ لگائی اور تیز بہاؤ کی وجہ سے ڈوب گئے۔ لیکن تھانیدار کو اپنی فکر پڑی ہوئی تھی لہذا وہ اس تجویز پر راضی نہیں ہوا۔ اُس نے کہا کہ جولاں اور انوپ پر الزامات لگا کر انہیں پنپوں کے سامنے پیش کر دیا جائے اور اس معاملے کو کچھ دیر اسی طرح لٹکا رہنے دیا جائے۔ اُس نے دوسرا مشورہ یہ دیا کہ ڈاکٹر انیل کو فوراً ہلاک کر دیا جائے۔ جی ہاں۔ ڈاکٹر انیل چوہدری بسواجیت کی جس بے جا میں تھا۔ اُسے چوہدری کے ساجن پور والے ڈیرے میں رکھا گیا تھا اور دوسرا مسلح آدمی ہر وقت اُس پر پہرہ دیتے تھے۔

دراصل ڈاکٹر انیل کو اُس وقت اغوا کیا گیا تھا جب وہ اپنے ایڈووکیٹ دوست کے گھر سے واپس آ رہا تھا۔ اغوا کرنے والے سادہ لباس میں پولیس کے آدمی تھے اور انہیں بیدی نے انیل کے پیچھے لگا رکھا تھا۔ ساجن پور کے اُس قید خانے میں تین ہفتوں کے اندر انیل کو بے

شمار اذیتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اگر میں اُن تین ہفتوں کی تفصیل میں گیا تو پوری ایک کتاب بن جائے گی۔

جب انیل کے انجام کے بارے میں سب طے ہو گیا تو چوہدری نے اپنے کچھ کارندے جولاں اور انوپ کے پاس چھوڑ دیئے۔ دور انفل مین بھی وہیں اتار دیئے گئے۔ میں چوہدری بسواجیت، اُس کے بھائی اور تھانیدار کو لے کر ساجن پور کی طرف روانہ ہوا۔ وہاں سے ساجن پور کا فاصلہ دو میل کے قریب تھا۔ فجر کی اذانیں ہو رہی تھیں۔ جب ہم ساجن پور کے قریب سے گزر کر چوہدری کے ڈیرے پر پہنچے۔ ڈیرے داروں نے آگے بڑھ کر استقبال کیا۔ ڈیرے کے ایک کمرے میں سُرخ قالین بچھا ہوا تھا اور گاؤں کے لگے ہوئے تھے۔ لگتا تھا یہاں مجرا وغیرہ ہوتا رہتا ہے۔ چوہدری اور تھانیدار گاؤں کے سہارے بیٹھ گئے۔ ہم دیواروں کے سہارے مؤدب کھڑے رہے۔

تھوڑی دیر بعد کہیں قریب سے دھینگا مشتکی کی آوازیں آئیں۔ تب تین آدمی ڈاکٹر انیل کو گھسیٹتے کھینچتے کمرے میں لے آئے۔ وہ ایک سُرخ و سپند نو جوان تھا لیکن بال سکھوں کے انداز میں نہیں تھے یعنی وہ ”موناسکھ“ تھا۔ اُس کے چہرے پر چوٹوں کے نشان تھے اور ڈانڑی بڑھی ہوئی تھی۔ اُس کے دونوں ہاتھ پشت پر کسی رسی وغیرہ سے باندھے گئے تھے۔ مسخ آدمیوں نے اُسے دھکا دیا اور وہ اوندھے منہ تھانیدار کے قدموں میں گرا۔ تھانیدار نے اپنے بوٹ سے اُس کا زخمی چہرہ اوپر اٹھایا اور ماں بہن کی گالیاں دینے لگا۔ شاید وہ اُسے مارنے سے پہلے اچھی طرح دل کی بھڑاس نکال لینا چاہتا تھا۔ چوہدری نے بھی اُسے ایک دو ٹھوکریں رسید کیں۔ پھر چوہدری کے اشارے پر اُس کے کارندے بھوکے کتوں کی طرح اُس پر ٹوٹ پڑے۔ وہ اُسے مار مار کر جان سے مار دینا چاہتے تھے۔ قیمتی قالین کو خون سے بچانے کے لیے یہ ایک اچھا طریقہ تھا..... اور یہ طریقہ اُس اصول پرست نو جوان پر آزمایا جا رہا تھا جس نے ظالموں اور دھوکے بازوں کے جھوم میں گھس کر علی الاعلان سچ بولا تھا۔ جس نے ایک تنہا اور بے کس عورت کا ساتھ دینے کی بیوقوفی کی تھی..... اُس جیسے نو جوان کو اس بیوقوفی کی سزا ملنی ہی چاہیے تھی۔ وہ مار مار رہا تھا..... اور تڑپ رہا تھا۔ ہر ایک کی طرف رحم طلب نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ مگر یہاں اُس پر رحم کھانے والا کوئی نہیں تھا..... اُس وقت میں نے شلوار کے نیچے سے 32 بور کار ریوالور نکالا۔ دو قدم آگے بڑھا اور تھانیدار شیکھر بیدی کی کھوپڑی کا نشانہ لے لیا..... یہ منظر دیکھ کر چوہدری اور تھانیدار کے منہ کھلے رہ گئے۔ مار پیٹ کرنے والوں کے ہاتھ بھی رک گئے۔

”کون..... کون ہوتا ہے؟“ بیدی نے مجھے شکی نظروں سے دیکھتے ہوئے ہراساں کیے۔ میں پوچھا۔

”انسپکٹر نواز خان۔“ میں نے پورے اعتماد سے کہا۔

تھانیدار کا کھلا ہوا منہ کچھ اور کھل گیا۔ وہ ہکلا یا۔ ”آ..... آپ..... میں..... میں تو.....“ مجھے اپنے عقب میں آہٹ سنائی دی۔ اگر مجھے ایک لمحے کی تاخیر ہوتی تو جرمن ساختہ 39 کے برین گن کی دس پندرہ گولیاں میرے جسم میں پیوست ہو جاتیں۔ یہ خوفناک ہتھیار چوہدری بسواجیت کے چھوٹے بھائی یعنی چھوٹے چوہدری نے استعمال کیا تھا اور نہایت پاگل پن کے ساتھ استعمال کیا تھا۔

میری زندگی باقی تھی جو میں گولیوں کی زد سے نکل گیا۔ یونہی میں نے تڑپ کر اپنی جگہ چھوڑی، کم از کم دس گولیاں بڑے چوہدری کے جسم میں پیوست ہو گئیں۔ ایک آدھ گولی تھانیدار کے حصے میں بھی آئی اور وہ گاؤں کے اوپر گر کر رہنے لگا۔ چوہدری کے زندہ بچنے کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ اُس کے منہ پر جیسے کسی نے کچڑ کا چھینٹا دے مارا تھا۔ تاریک سوراخوں میں سے سُرخ خون نکل کر پورے قالین کو بھگور رہا تھا۔ چھوٹے چوہدری کی برین گن اب خالی ہو چکی تھی۔ وہ سکتے کے عالم میں کھڑا تھا۔ میں نے گھوم کر ریوالور اُس کی کینٹی پر رکھ دیا۔ کمرے میں گولیوں کا دھواں تھا اور فضا میں ابھی تک برسٹ کی بازگشت گونج رہی تھی۔

☆=====☆=====☆

چوہدری بسواجیت کی ہلاکت اور تھانیدار کے زخمی ہونے کے بعد میں نے گاؤں کے حالات پر کس طرح قابو پایا یہ ایک لمبی کہانی ہے۔ درحقیقت خدا کی بے آواز لامٹی کچھ اس طرح گھٹی تھی کہ انصاف کے تمام تقاضے آپوں آپ پورے ہو گئے تھے۔ چھوٹے چوہدری کے ہاتھوں بڑا چوہدری مارا گیا۔ چھوٹا چوہدری قتل کیس میں گرفتار ہوا۔ تھانیدار کو نہ صرف اپنے بائیں بازو سے محروم ہونا پڑا بلکہ اُس کی ملازمت بھی گئی۔ اس کے علاوہ اُس پر کئی ایک کیس بنے۔ نو جوان ڈاکٹر انیل اپنے ضمیر کے سامنے سرخرو ہو کر شہر واپس آیا اور اُس کے والدین کا طویل انتظار ختم ہوا۔ مستقل طور پر شہر واپس آنے سے پہلے ڈاکٹر انیل نے ایک اور اہم کام کیا۔ اُس نے جولاں کے شوہر کی جان بچائی۔ جولاں کے شوہر بھگتو نے مایوسی اور شدید پشیمانی کے عالم میں خودکشی کی کوشش کی تھی۔ اُس نے بھاری مقدار میں نیلا تھو تھکا لیا تھا۔

اُس نے ٹوٹی پھوٹی لکھائی میں ایک خط چھوڑا تھا جس میں اُس نے لکھا تھا کہ ”میں نے اپنی پاک دامن بیوی کو بدنام کرنے اور اُسے برے راستے پر چلانے کا مہیاپاپ کیا ہے۔ مجھے اُس سے معافی مانگنے کا ایک ہی طریقہ سمجھ میں آ رہا ہے کہ میں اپنی جان دے دوں۔“ اور واقعی اگر انیل جیسا قابل ڈاکٹر اُسے بچانے کی جدوجہد نہ کرتا تو وہ جولاں کو بیوہ کر جاتا اُس کی جان بچ گئی۔ اُس نے اپنی بے راہ روی سے ہمیشہ کے لیے توبہ کر کے ایک نئی زندگی کا آغاز کیا..... باقی انوپ سنگھ کے بارے میں کیا لکھوں وہ تو اُن ملاحوں میں سے تھا جو کچی عمر میں دل کو روگ لگا لیتے ہیں اور پھر ساری عمر کشتیاں چلاتے ہوئے گاتے رہتے ہیں۔

”روہی رنگ رنگلیٹری میرا یاد ملادے“ اور ”پینگ ٹٹ گئی ہلارا کھا کے“ وغیرہ وغیرہ۔ ان کی قسمت میں ہمیشہ کے لیے ترسنا ہوتا ہے۔

☆=====ختم شد=====☆